خواتین اور دوشیزاؤں کیلیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
اکتوبر 2013
عید نمبر
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

اکتوبر 2013
جلد 41 شمارہ 6
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ عید نمبر لیے حاضر ہیں۔
یہ شمارہ ملے گا تو آپ عیدالاضحیٰ کے استقبال کی تیاریوں میں معروف ہوں گی۔
قارئین کو ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے عید مبارک۔

فطرت سے ہم آہنگی ہی زندگی کو خوبصورت اور دُنیا کو رہنے کے قابل بناتی ہے۔ ہمارے مذہب کا ہر رکن، ہر حکم فطرت کے عین مطابق ہے۔ اسلام انسان کو اس اوج کمال تک پہنچانے کے لیے آیا ہے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ قربانی کا واقعہ اور عیدالاضحیٰ کے تہوار پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس کے پیچھے کتنا عظیم اور گہرا فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اپنے نفس، اپنے دل کے تقاضوں کو نظر انداز کرکے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنی عزیز ترین شے کی قربانی۔

اس اعلا اور ارفع جذبہ کی روح کو محسوس کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق قربانی کا جذبہ بیدار کیجیے۔ تب ہی اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

جنگ عراق اور افغانستان میں لڑی گئی لیکن ایک عرصے سے ہمارا ملک میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ عالمی دہشت گردی کے ہاتھوں نہ جانے کتنے گھر اجڑ گئے اور کتنے بے گناہ لوگ زندگی کی بازی ہار گئے۔ پشاور کا واقعہ ابھی تازہ ہی تھا کہ زلزلہ وطن عزیز کے ایک حصہ میں تباہی اور بربادی کے نشان چھوڑ گیا۔

ابتلا اور مصیبت کی اس گھڑی میں ان پریشان اور بے سہارا لوگوں کا ساتھ دینا عین عبادت اور فرض ہے۔ یہ ہمارے اپنے ہیں عید کی خوشیوں میں انہیں یاد رکھیے گا۔

نیا ناول۔ بن مانگی دُعا،

اس ماہ سے بہن عفت سحر طاہر کا ناول بن مانگی دُعا شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ نام ہماری کوئی بھی قاری بہن نہ بوجھ سکی۔

عفت سحر طاہر کے مکمل ناول، ناولٹ اور افسانے آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان کی مزاحیہ سیریز قارئین کا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ہمیں امید ہے ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی قارئین کو پسند آئے گا۔ اس ناول میں آپ کو دلچسپ کہانی کے ساتھ ساتھ زندگی سے قریب اور منفرد کردار بھی نظر آئیں گے۔ پہلی قسط پڑھ کر آپ رائے ضرور دیجیے گا۔

محمود بابر فیصل کی برسی،

خوش طبع، خوش اطوار اور خوش شکل محمود بابر فیصل کو دُنیا سے رخصت ہوئے بیس سال گزر گئے۔ ایک طویل مدت لیکن وہ آج بھی دلوں میں بستے ہیں۔ ان کی سحر انگیز شخصیت، خوبصورت یادیں ذہن میں تازہ ہیں۔
25 اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عید کے رنگ۔ آپ کی پسندیدہ مصنفین سے سروے،
- زمین کے آنسو۔ نگہت سیما کا مکمل ناول،
- آسیہ رزاقی، آمنہ ریاض اور ام ایمان کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، ریما علی سید، فائزہ رابعہ اور نازیہ جمال کے افسانے،
- باتیں مومل شیخ سے،
- عنیزہ سید اور عفت سحر پاشا کے ناول،
- مشہور ٹی وی اینکر شاہ زیب خانزادہ سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

عید نمبر کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چتکبرے اور سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم ایک بکری، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی قربانی کرنا ضروری ہے۔
2۔ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ افضل ہے۔
3۔ گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہیے، تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے۔
4۔ قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا چاہیے۔
5۔ قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت درج ذیل حدیث میں مذکورہ دعا پڑھنا مسنون ہے۔
6۔ ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

امت سے محبت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے چتکبرے اور خصی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو۔ اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔

فوائد و مسائل :

1۔ قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہئیں۔
2۔ جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔
3۔ خصی جانور کی قربانی درست ہے۔ اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔
4۔ گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔
5۔ کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے بظاہر قربانی کا واجب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و استحسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے محدثین نے ان

سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے فرض نہیں۔ تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

2۔ قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

3۔ قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

قربانی واجب ہے

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا "کیا قربانی واجب ہے؟"

انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان قربانی دیتے رہے اور یہی طریقہ جاری ہے۔"

حضرت جبلہ بن سحیم رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا اور انہوں نے یہی جواب دیا۔

قربانی کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں' کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور نیکی کے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ قربانی (کے جانور) کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کرلیتا ہے' اس لیے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔"

ہر بال کے بدلے نیکی

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قربانیاں کیا ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "اس میں ہمارے لیے کیا (ثواب) ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اور اون؟"

فرمایا "اون کے بھی ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔"

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والے نر مینڈھے کی قربانی دی۔ وہ سیاہی میں کھاتا' سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔

فوائدو مسائل :

1۔ قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوب صورت ہونا چاہیے۔

2۔ "نر" (فجیل) سے مراد یہ ہے کہ وہ خصی نہ تھا۔

3۔ نر اور خصی دونوں قسم کا جانور قربانی میں دینا جائز ہے۔

4۔ سیاہی میں کھانے' چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا' اس کے پاؤں بھی کالے تھے اور اس کی آنکھوں کے اردگرد کی جگہ بھی سیاہ تھی۔ اس طرح کا مینڈھا خوب صورت سمجھا جاتا ہے' نیز دیکھنے میں بھی خوب صورت اور بھلا لگتا ہے۔

بہترین قربانی

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔"

اونٹ اور گائے (کی قربانی) کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عید الاضحیٰ آگئی۔ چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔"

دو دانت کا جانور

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو دانتے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو' سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دو دانت کا جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کرو۔"

فوائدو مسائل :

1۔ علامہ البانی رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے' بکری کا جذعہ نہیں۔

2۔ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ گوشت کی بکری ہے۔ (قربانی کی نہیں۔")

انہوں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔"

علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں' البتہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے اور یہ جواز اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں کہ دو دانتا (مسنہ) دستیاب نہ ہو' بلکہ مطلق جائز ہے۔ واللہ اعلم

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو' یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو' یا جس کا کان چرا ہوا ہو' یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو' یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا' "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔"

فوائدو مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

2۔ آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو' اس کی قربانی درست نہیں۔

3۔ قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے' اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا یا غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے' اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

عیب والے جانور کی قربانی جائز نہیں

حضرت عبید بن فیروز رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا۔ "مجھے بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے کس جانور کو ناپسند کیا ہے یا اس سے منع فرمایا ہے؟"

انہوں نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا۔ اور میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے کوتاہ ہے۔ (اور فرمایا)

"قربانی میں چار جانور جائز نہیں، وہ کانا جانور جس کا کانا پن واضح ہو، بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو، لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔"

عبید بن فیروز نے کہا "میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس کے کان میں نقص ہو۔"

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "جو چیز تمہیں پسند نہیں، اسے چھوڑ دو لیکن اسے کسی پر حرام نہ کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ معمولی عیب جو گہری نظر سے دیکھے بغیر محسوس نہ ہو، قربانی میں رکاوٹ نہیں۔

2۔ محمد فواد عبدالباقی نے یوں اس کی تشریح کی ہے "جس کی ٹانگ ٹوٹی ہو اور وہ چلنے سے عاجز ہو۔" (حاشیہ سنن ابن ماجہ) لیکن یہ صورت لنگڑا ہونے میں شامل ہے۔ نواب وحید الزمان خان نے اس کا ترجمہ "دبلی" کیا ہے۔ وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

3۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی رائے میں کان کٹا یا پھٹا ہوا ہونا ایسا عیب نہیں، جو قربانی سے مانع ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کی قربانی دینے سے منع فرمایا جس کا سینگ ٹوٹا ہو یا کان کٹا ہوا ہو۔

اگر قربانی کا جانور صحیح سلامت خریدنے کے بعد اس میں عیب پیدا ہو جائے تو؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ ہم نے قربانی کے لیے ایک مینڈھا خریدا۔ بھیڑیا اس کے سرینوں (کولہوں) اور کان سے کچھ حصہ کاٹ کر لے گیا۔ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (مسئلہ) دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ اس کی قربانی کر دیں۔

گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرنا

حضرت عطا بن یسار رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تم لوگوں میں قربانیاں کس طرح ہوتی تھیں؟

انہوں نے فرمایا۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کر دیا کرتا تھا۔ (اس میں سے) وہ خود بھی کھاتے، اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بعد میں لوگ فخر (کے طور پر زیادہ جانور ذبح) کرنے لگے تو وہ حال ہو گیا جو آپ (آج کل) دیکھ رہے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ جن لوگوں کا کھانا پینا اور خرچ وغیرہ مشترک ہو وہ ایک گھر کے افراد ہیں۔ ان کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دینا یا گائے یا اونٹ کا ایک حصہ قربانی دینا کافی ہے۔

2۔ ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا جائز ہیں لیکن تفاخر اور مقابلہ بازی کے انداز سے زیادہ جانور یا قیمتی جانور قربان کرنا قربانی کے اصل مقصد کو ختم کر دیتا ہے، اس صورت میں کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

3۔ کسی بھی نیکی میں نیت کا صحیح ہونا اور دل کا خلوص لازمی شرط ہے۔

سنت طریقہ پر عمل

حضرت ابو سریحہ (حذیفہ بن اسید غفاری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میرے گھر والوں نے مجھے غلط کام پر مجبور کر دیا جبکہ مجھے سنت طریقہ معلوم ہے۔ ایک گھر والے ایک بکری یا دو بکریاں ذبح کیا کرتے تھے۔ اب تو اگر ہم ایک بکری کی قربانی دیں تو ہمارے ہمسائے ہمیں بخیل کہنے لگتے ہیں۔"

جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، اسے (ذوالحجہ کے پہلے) دس دنوں میں بال اور ناخن نہیں اتارنے چاہئیں۔

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب ذوالحجہ کا (پہلا) عشرہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کوئی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے بالوں یا اپنی جلد سے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ہاتھ نہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ بال نہ کاٹے اور جلد سے بال صاف نہ کرے۔ یہ پابندی ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے عید کے دن قربانی کرنے تک ہے۔

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص ذوالحجہ کا چاند دیکھ لے اور اس کا ارادہ قربانی کرنے کا ہو تو وہ اپنے بالوں اور ناخنوں (کو کاٹنے) کے قریب بھی نہ جائے۔"

نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کرنے کی ممانعت کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے قربانی کے دن نماز سے پہلے (قربانی کا جانور) ذبح کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ دوبارہ (قربانی) کرے۔

فوائد و مسائل :

1۔ نماز سے مراد عید کی نماز ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا عید الاضحیٰ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر (عید گاہ میں) تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز عید ادا فرمائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

"اس دن ہماری پہلی عبادت یہ ہے کہ پہلے نماز پڑھیں، پھر (عید گاہ سے) واپس جا کر جانور ذبح کریں۔" صحیح بخاری۔

2۔ عید کی نماز سے پہلے کی گئی قربانی کی حیثیت عام گوشت کی ہے۔ ایسے شخص کو قربانی کا ثواب نہیں ملے گا۔

3۔ ثواب کا دارومدار عمل کے سنت کے مطابق ہونے پر ہے۔

4۔ کوئی شخص غلطی سے نماز سے پہلے قربانی کر لے تو دوسرا جانور میسر ہونے کی صورت میں اسے نماز عید کے بعد دوسرا جانور قربان کرنا چاہیے۔

قربانی کا گوشت کھانا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بوٹی لے کر ہنڈیا میں ڈالی گئی (اور پکائی گئی) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شوربہ پیا۔

کبت

انشاجی

جلے تو جلاؤ گوری
ابھی نہ بجھاؤ گوری
پیت میں بجوگ بھی ہے
پیت برا روگ بھی ہے
گیسوؤں کی ناگنوں سے
جوگنوں، براگنوں سے
عاشقوں کا حال پوچھو
ایک دو سوال پوچھو
رات کو اداس دیکھیں
تمہیں نہ جو پاس دیکھیں
روپ رنگ مان دے دیں
کہو تمہیں جان دے دیں؟
اور بھی ہزار ہوں گے
آپ پہ نثار ہوں گے
شعر میں نظیر ٹھہرے
کوی ستے فقیر ٹھہرے

پیت کا الاؤ گوری
ابھی سے بجھاؤ نا
کامنا کا سوگ بھی ہے
لگے تو لگاؤ نا
بیرنوں ابھاگنوں سے
کھیلتی ہی جاؤ نا
کرو تو خیال پوچھو
بات جو بڑھاؤ نا
چاند کو نراس دیکھیں
آؤ، پاس آؤ نا
جی کا یہ مکان دے دیں
مانگ لو، لجاؤ نا
جو کہ دعویدار ہوں گے
کبھی آزماؤ نا
جوگ میں کبیر ٹھہرے
اور جی لگاؤ نا

ایکسپریس نیوز کے معروف اینکر صحافی

شاہ زیب خان زادہ سے ملاقات

شاہین رشید

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے طالب علم ڈگری تو کسی اور فیلڈ میں لیتے ہیں مگر روزی روٹی کسی اور فیلڈ سے کماتے ہیں۔ اس میں ان کی اپنی مرضی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ سب کچھ قسمت کا لکھا ہوتا ہے کہ وہ کس کو کہاں لے جائے۔ کہتے ہیں کہ صحافت میں آنے کے لیے صحافت پڑھنا بہت ضروری ہے۔ مگر اس فیلڈ میں کئی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے صحافت نہیں پڑھی، مگر ایک کامیاب صحافی اور اینکر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

شاہ زیب خان زادہ نے این ای ڈی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ مزید پڑھنے کے لیے ملک سے باہر جانا تھا۔ ایڈمیشن بھی ہو گیا تھا۔ مگر شاہ زیب کی قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ کیا لکھا تھا؟ کیسے آگے بڑھے۔ آپ بھی پڑھیے۔

"کیسے ہیں شاہ زیب۔۔۔ آپ کا نام بڑا بھاری بھرکم ہے۔ یہ خان زادہ سے کیا مراد ہے؟"

"جی الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ خان زادہ میرا سر نیم ہے۔ "راجپوت" کاسٹ ہے۔

میرے دادا انڈیا سے مائیگریٹ کر کے آئے تھے تو وہاں کی کاسٹ ہے۔ خانزادہ راجپوت۔ ہاں میرے پاس یہ چوائس ضرور تھی کہ میں اپنے والد کا نام "جبار" لگالوں "شاہ زیب جبار" لیکن مجھے خان زادہ بھاری بھرکم اور اچھا لگا تو میں نے اپنے نام کے ساتھ لگالیا اور مزے کی بات یہ کہ اب لوگ مجھے شاہ زیب نہیں بلکہ خان زادہ کہہ کر بلاتے ہیں۔ میرے دادا جب پاکستان آئے تو اندرون سندھ کا ایک علاقہ ہے نوشہرو فیروز' اس کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہاں قیام پذیر ہوئے۔ غریب انسان تھے۔ بڑی محنت کی میرے والد کی تعلیم پہ میرے والد صاحب چونکہ پڑھائی میں بہت اچھے تھے تو انہیں اسکالر شپ مل گئی اور وہ ڈاکٹر بنے۔ پھر میری والدہ سے شادی ہوئی۔ والدہ نے بھی اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ ہم اسی گاؤں میں پلے بڑھے اور بڑی محنت کی۔ انٹرمیڈیٹ تک وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ کراچی آنا میرا امتحان ہوا کرتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ میں میری بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن تھی۔ جس کی وجہ سے مجھے این ای ڈی میں داخلہ مل گیا اور یہ بات ہے 2001ء کی تو چار سال بغیر فیملی کے میں کراچی میں ہاسٹل میں رہا اور انجینئرنگ کر کے میڈیا میں آگیا بائے لک۔"

"فیملی سے دور رہے۔ انجینئر بنے تو پھر میڈیا میں کیسے آگئے؟ اس سفر کی کہانی میں کیا کیا موڑ آئے؟"

"اس سفر میں مجھے جدوجہد تو بہت کرنی پڑی۔ لیکن چونکہ والدین کی دعائیں بھی ساتھ تھیں تو کام آسان ہوتے گئے۔ میری شخصیت کو بنانے میں میرے والد ڈاکٹر عبدالجبار خان زادہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ بچپن میں میں کچھ زیادہ ہی پُراعتماد طالب علم تھا۔ چونکہ پوری کلاس میں اچھا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا ہوں اس لیے میرے والد صاحب کوشش کرتے تھے کہ مجھ سے کسی ایسی جگہ کا انٹری ٹیسٹ دلوائیں جو بہت ہی مشکل ہو' تاکہ مجھے پتا چلے کہ میں کلاس میں تو اچھا ہوں ہی' اصل میں بھی اچھا ہوں یا نہیں' تو کبھی کیڈٹ کالج پٹارو کا ٹیسٹ دلواتے تھے جب وہاں کامیاب ہوجاتا تو کیڈٹ کالج حسن ابدال کا ٹیسٹ دلواتے تھے اور کامیاب ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ اپنی میتھ امپروو کرو' اپنی انگریزی امپروو کرو' اردو کو ٹھیک کرو' ابھی تم میں بہت گنجائش ہے امپروومنٹ کی۔ تو مجھے یہی احساس ہوتا تھا کہ بے شک میں اچھا طالب علم ہوں' لیکن ابھی ایک دنیا میرے آگے ہے۔ جس کا مجھے مقابلہ کرنا ہے اور اس وجہ سے مجھے بہت زیادہ پڑھنے' آگے بڑھنے اور محنت کرنے کی عادت پیدا ہوئی۔ جب میں میٹرک اور پھر انٹر تک پہنچا تو مجھے اتنی زیادہ پڑھنے کی عادت ہوچکی تھی کہ انٹر بورڈ میں' میں نے سیکنڈ پوزیشن لی اور اب تک یہ عادت برقرار ہے اور میں روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے پڑھتا ضرور ہوں اور شوز کے لیے ریسرچ بھی کرتا ہوں۔"

"بچپن میں بچوں کے کانوں میں اپنے والدین کی یہ آوازیں ضرور گونجتی رہتی ہیں کہ ڈاکٹر بننا ہے' انجینئر بننا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ آوازیں آپ کے کانوں میں بھی گونجیں؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ میرے والد کہتے تھے کہ یا تو تم میری طرح ڈاکٹر بن جاؤ یا پھر انجینئر' میری بڑی بہن ڈاکٹر بنیں تو والد چاہتے تھے کہ سب ہی ڈاکٹر بن جائیں۔ ویسے میری چار بہنیں ہیں اور وہ سب ڈاکٹر ہیں۔ ایک بھائی ہے' جو مجھ سے چھوٹا ہے اس نے اپنی پڑھائی ابھی مکمل کی ہے۔"

"تو آپ یہ بھی بتائیں کہ صحافت میں کیسے آئے؟"

"میں اسے اپنی گڈ لک ہی کہوں گا اور اس فیلڈ میں آکر میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ یہ وہ کام ہے جو میں بہت شوق سے کرتا ہوں اور بہت انجوائے کرتا ہوں۔ میں جب انجینئرنگ کے فائنل ائیر میں تھا تو میرا ایک بہت ہی اچھا دوست تھا اسد قائم خانی' وہ اسٹاک مارکیٹ میں انویسٹمنٹ کرنے لگا اور اس نے مجھے بھی کہا کہ انویسٹمنٹ کرو' تو میں نے اپنے ابا سے پیسے مانگے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ انہوں نے مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے پیسے دے دیے جو کہ میں نے اسٹاک مارکیٹ میں شیئرز کے کاروبار میں لگائے جب نفع آیا تو مجھے اس کام میں مزہ آنے لگا پھر میں اسٹاک مارکیٹ اور اکانومی کے بارے میں پڑھنے لگا۔ اس دوران پڑھائی بھی جاری تھی مجھے اصل میں انجینئرنگ کے فائنل کا لاسٹ وائیوا دے کر ملک سے باہر ماسٹرز کرنے جانا تھا۔ دسمبر 2006ء میں' میں انجینئرنگ سے فارغ ہوا تھا اور چھ ماہ بعد مجھے باہر جانا تھا۔ تو میں نے اپنے والدین سے کہا کہ چونکہ ابھی چھ ماہ باقی ہیں باہر جانے میں تو میں اپنی پسند کی نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں ایک چینل کھلا تھا sun tv کے نام سے۔ یہاں میں نے اپنی سی وی بھیج دی تو مجھے کال آگئی۔ چونکہ مجھے اسٹاک مارکیٹ کے بارے میں بھی خاصی معلومات تھیں اور میری اردو بھی کافی صاف تھی تو جب انٹرویو ہوا تو میں کامیاب ہوگیا۔ پھر جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے مزہ آنے لگا۔ میں نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ میں اب ماسٹرز کرنے نہیں جاؤں گا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ یوں میڈیا کا سفر شروع ہوگیا۔ سن سے پھر بزنس پلس پہ آیا۔ پھر کچھ پولیٹیکل شوز بھی کیے۔ انٹرویوز کیے۔ کوشش کرتا تھا کہ ون ٹو ون انٹرویو کروں اور اچھے لوگوں کے انٹرویو کروں۔ بزنس پلس پہ کام کررہا تھا تو ٹی وی ون سے آفر آئی۔ وہاں آٹھ نو ماہ کام کیا۔ پھر ایکسپریس نیوز سے آفر آئی تو ایکسپریس نیوز جوائن کرلیا اور ابھی تک یہیں ہوں۔ بڑی خواہش تھی کہ ایک بڑے پلیٹ فارم پر آؤں اللہ کا شکر ہے کہ خواہش پوری ہوئی اب دو سال سے انجوائے کررہا ہوں۔"

"لوگ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں' آپ کا پروگرام بہت شوق سے دیکھتے ہیں اور فیڈ بیک بھی آپ کو بہت اچھا ملتا ہوگا۔ تو یہ سب کچھ کیسا لگتا ہے؟"

"بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ کبھی میں سفر میں ہوں یا کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا ہوں تو لوگ ملتے ہیں

اور بہت اچھا فیڈ بیک دے رہے ہوتے ہیں کہ آپ سچ بولتے ہیں ہمارے سامنے' سچ لاتے ہیں اور کھری بات کرتے ہیں۔ یہ وہ جملے ہوتے ہیں جو آپ کا کانفیڈنس بڑھاتے ہیں۔ اگر کوئی آپ کو بہادر کہے' کوئی یہ کہے کہ آپ غیر جانب دار انسان ہیں' تو یوں سمجھیے کہ آپ کو آپ کی محنت کا صلہ مل جاتا ہے اور محنت کا صلہ یوں بھی ملتا ہے کہ آپ کو اس پروفیشن میں عزت' شہرت اور پیسہ بھی ملتا ہے اور اندر سے قوت ملتی ہے تو پھر مزید محنت کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

"ہمارے یہاں دو طرح کے سیلبریٹی ہوتے ہیں۔ ایک شوبز کے اور ایک آپ جیسے۔ دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تو جب آپ سے لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں۔ صرف تعریف ہوتی ہے یا پرابلمز بھی بتاتے ہیں؟"

"تعریف تو کرتے ہی ہیں' لیکن میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی ہے کہ مجھے جتنے بھی لوگ ملتے ہیں ان میں شاید پانچ فیصد لوگ صرف اپنی بات کرتے ہیں۔ 95 فیصد لوگ صرف اور صرف ملک کی بات کرتے ہیں کہ بتایئے یہ ملک کیسے ٹھیک ہوگا۔ ہو

بھی سکے گا یا نہیں۔ کراچی کے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ وہ اپنے ذاتی حالات کو بھی ملک کے حالات کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر ملک کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ان کے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"لوگ مایوس ہیں یا پرامید؟ آپ تو بہت قریب سے سب کو دیکھتے ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟ یہ سیاست دان مخلص ہیں اپنے ملک کے ساتھ؟"

"مایوسی کے ساتھ ساتھ امید بھی رکھتے ہیں۔ نئے الیکشن ہوتے ہیں۔ نئی حکومت آتی ہے۔ نئی امیدیں پھر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مایوسی اور امیدوں کا سلسلہ تو چلتا رہتا ہے۔ لیکن میں خود بڑا پرامید ہوں اور کون مخلص ہے اور کون نہیں اس کو جج کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن لوگوں کے کام سے یہ باتیں نظر آتی ہیں کہ کون مخلص ہے کون نہیں۔ اگر ہم سابقہ حکومت کے کام کو دیکھیں تو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ان میں ملک کے لیے جتنا خلوص ہونا چاہیے تھا وہ نہیں تھا اور موجودہ حکومت پر بھروسا کرکے لوگوں نے ووٹ دیا ہے تو ان کو بھی آزمائیں اور over all لیڈر ہم نے ہی چننا ہے اس ملک کے نوجوانوں میں سیاست کا جتنا شعور پیدا ہو چکا ہے اس کو دیکھ کر تو میں بہت پرامید ہوں۔"

"اینکر بن کر لیڈروں کو اور ان کے ساتھیوں کو فیس کرنا آسان ہوتا ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو ڈر نہیں لگتا تو میں ان کو ایک بات کہتا ہوں کہ انسان کو کسی بھی ڈر سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ اگر ڈر آپ سے زیادہ مضبوط ہوا تو آپ کی زندگی ڈر کے تحت گزرے گی۔ لیکن اگر آپ ڈر سے زیادہ اسٹرونگ ہوں گے تو آپ کی زندگی ویسی ہی گزرے گی جیسی آپ گزارنا چاہتے ہیں۔ تو میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ساری چیزیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور الحمد اللہ میں ڈر کے اوپر حاوی رہتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ اللہ نے اتنا کرم کیا ہے تو اسی لیے کیا ہے کہ میں اس خوف سے اور اس ڈر سے زیادہ مضبوط ہوں جو لوگ مجھ پر حاوی کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے تو پرویز مشرف والی بات کردی کہ ڈرتا نہیں ہوں میں کسی سے۔؟"

"میں ایسا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ میں ڈرتا ہوں۔ اپنے اللہ سے۔ میں ڈرتا ہوں اپنے والدین کی ناراضی سے۔ میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں کہ میرے پروگرام میں خامیاں ہوں اور لوگ مجھے پسند کرنا چھوڑ دیں۔ میرا ایمان ہے کہ جب اللہ آپ کو کسی چیز سے نوازنا چاہتا ہے تو آپ کو عقل دے دیتا ہے اور عقل کے ذریعے آپ وہ چیز حاصل کرلیتے ہیں۔ اور جب اللہ آپ سے کسی چیز کو لینا چاہتا ہے تو اللہ آپ سے عقل لے لیتا ہے۔ تو میں ڈرتا ہوں اس وقت سے کہ اللہ مجھ سے عقل نہ لے لے۔"

"بہت سخت سوالات ہوتے ہیں آپ کے اور سامنے والا جھنجلا بھی رہا ہوتا ہے۔ مگر آپ پروا کیے بغیر بڑے مزے سے سوال کررہے ہوتے ہیں تو یہ سب ٹیم ورک ہوتا ہے یا آپ کی اپنی کاوش ہوتی ہے؟"

"ٹیم ورک تو ہوتا ہی ہے میرے پاس بڑی اچھی ٹیم ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ روزانہ آٹھ دس گھنٹے میں پڑھتا ہوں، ریسرچ کرتا ہوں۔ کیونکہ جب تک خود دلچسپی لے کر کام نہیں کریں گے کام اچھا نہیں ہوگا۔ لیکن پھر بھی میری ٹیم میں پروڈیوسر کامل میر، ایسوسی ایٹ پروڈیوسر عدنان حسین اور ثناء داؤد کو آرڈینیٹر بہت اچھے ہیں۔ بہت محنت کرتے ہیں اور میں بڑی ایمان داری سے بتارہا ہوں کہ سوالات میں 20 سے 25 فیصد سوالات وہ ہوتے ہیں جو آپ سوچ کر جاتے ہیں اور باقی ستر سے پچھتر فیصد سوالات وہ ہوتے ہیں جو ان کے جوابات کو سن کر ہم کرتے ہیں اور اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کتنی ریسرچ کی ہے۔ کتنی پڑھائی کی ہے۔ اس وقت ساری چیزیں آپ کے کام آرہی ہوتی ہیں۔"

"مہمانوں کو سوالات پہلے سے بتادیتے ہیں؟ یا پھر اسی وقت کرتے ہیں؟"

"میں ٹاپک ضرور بتادیتا ہوں۔ مگر سوالات نہیں بتاتا اور جو سیاست دان سوالات مانگتے ہیں، اور میں نہیں دیتا تو وہ پھر انٹرویو بھی نہیں دیتے۔ تو آپ خود اندازہ لگالیں کہ وہ کون سے سیاست دان ہیں جن کا چار سال میں، میں نے ایک بار بھی انٹرویو نہیں کیا تو جو آپ کو میرے پروگرام میں کبھی نظر نہ آئے، سمجھیے کہ وہ مجھ سے سوالات مانگتے ہیں۔"

"یہ سوال میں نے کاشف عباسی سے بھی کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی بہت کھرے انسان ہیں اب آپ سے بھی کہہ رہی ہوں کہ آپ کے بارے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ سب کے پروگرام میں جائیں گے مگر شاہ زیب کے پروگرام میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ بہت ٹیڑھا آدمی ہے اور سخت سوالات کرتا ہے۔"

"بہت سارے لوگ ہیں ایسے مجھے یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگتی کہ لوگ اس وجہ سے نہ آئیں کہ میں سخت سوالات کرتا ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے آپ سب کے انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو عوام کے سامنے لانا چاہتے ہیں، تو میں بڑا مایوس ہوتا ہوں ایسے لوگوں سے جو ایک آدھ بار آکر پھر نہیں آتے کہ یار ہم تمہیں فیس نہیں کرپاتے۔"

"آن دی کیمرہ آپ بال کی کھال بھی نکالتے ہیں۔ سامنے والے کو کنفیوز بھی کرتے ہیں۔ غصہ بھی دلاتے ہیں۔ لیکن آف دی کیمرہ آپ نے کبھی سوری کی کہ یار میں بہت تلخ ہو گیا تھا؟"

"نہیں جی۔ سوری نام کی کوئی چیز نہیں ہے میرے پاس۔ جب کوئی میرے شو میں آتا ہے تو اپنی چوائس سے آتا ہے۔ کیونکہ انہیں میرا اسٹائل اور میرے سوالوں کے بارے میں پتا ہوتا ہے کہ میں کس قسم کا اینکر ہوں۔ سب سے میرے تعلقات اچھے ہیں اور وہ اس لیے اچھے ہیں کہ ایک صحافی کے ایک اور سیاست دان کے تعلقات ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ اس لیے نہیں ہیں کہ میں اپنے کام پہ کمپرومائز کرجاؤں۔ تعلقات بنے ہی اس لیے ہیں کہ میں کام اچھا کرتا ہوں اگر کام پہ کمپرومائز کروں گا تو پھر تعلقات بھی اچھے نہیں رہیں گے۔ میرے خیال میں یہ ایسا پروفیشن ہے جس میں اگر آپ کسی سے دوستی نبھا رہے ہوں گے تو اپنے آپ سے دشمنی کررہے ہوں گے۔ اسی لیے میں دوستیاں نبھانے پر یقین نہیں رکھتا۔ ہاں یہ بات میں ضرور مانتا ہوں کہ جو لوگ میرے شو میں آتے ہیں وہ ٹائم نکال کر آتے ہیں اور اپنا موقف دینے آتے ہیں تو وہ میرے مہمان ہوتے ہیں اور میں انہیں پورا احترام دیتا ہوں۔"

"یہ جو ہماری سیاسی پارٹیاں ہیں۔ کیا ان میں دہشت گرد ہیں؟ یا سب اچھے ہیں اور یوں ہی بدنام ہیں؟"

"یہ چیز میں نے نہیں جج کرنی۔ اچھے برے لوگ ہر پارٹی میں ہوتے ہیں۔ اب کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں یہ جاننا نہ آپ کا کام ہے، نہ میرا یہ ایجنسیز کا کام ہے اور عدلیہ کا کام ہے۔ میرا کام یا صحافی کا کام رپورٹ کرنا ہوتا ہے۔ فیصلے صادر کرنا نہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں جس کا بھی انٹرویو کروں اس انداز میں کروں کہ عوام کے سامنے سچ آجائے۔ میں کسی کو دہشت گرد نہیں کہہ سکتا۔ ریاست جس کو دہشت گرد کہہ دے گی میں بھی کہہ دوں گا۔ کیونکہ میں ریاست کے قوانین کا اور آئین کے قوانین کا پابند ہوں۔"

"کیا کبھی کراچی کے حالات اچھے ہوں گے؟ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو سڑکوں پر آنا چاہیے۔ کیا واقعی آنا چاہیے؟"

"میں بہت پوزیٹو ہوں۔ ان شاء اللہ کچھ ہی عرصے میں حالات بہت اچھے ہو جائیں گے۔ جب 2013ء ختم ہو رہا ہوگا اور 2014ء شروع ہو رہا ہوگا آپ بہت اچھا کراچی دیکھیں گی اور لوگوں کو سڑکوں پہ نہیں بلکہ "پولنگ بوتھ" پہ آنا چاہیے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ لوگ آئے بھی ہیں۔ کراچی کے حالات کو بہتر کرنا یہاں کی سب جماعتوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ اگر فیصلہ کرلیں تو حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"تجزیے، تبصروں کے لیے آپ کو سوائے جیو کے تقریباً سب بڑے چینلز پر دیکھا تو کیا ان سے لڑائی

ہے آپ کی؟"
"نہیں بالکل نہیں۔ وہ بلائیں گے تو میں ضرور جاؤں گا اور کاشف بھائی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اسلام آباد میں تین دوست بہت اچھے ہیں۔ ان میں کاشف عباسی صاحب' فریحہ ادریس اور سلیم صافی صاحب۔ میں اگر کسی کو بہترین اینکر مانتا ہوں تو وہ کاشف عباسی ہیں۔ مگر اب آپ مجھے کاشف صاحب کے شو میں بہت کم دیکھیں گی۔ کیونکہ میرا شو پہلے ہفتے میں تین دن ہوتا تھا' مگر اب چار دن ہوا کرے گا۔"
"آپ کے خیال میں اس وقت سب سے بولڈ چینل کون سا ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ چینل کوئی بولڈ نہیں ہے۔ بلکہ کام کرنے والے لوگ آپ کو بولڈ مل جائیں گے اور یہ اینکر پر منحصر ہے کہ وہ کتنا بولڈ ہو سکتا ہے۔ مگر چینل کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔"
"جب سے آپ اس فیلڈ میں ہیں تب سے لے کر اب تک آپ اپنے کس پروگرام کو اچھا یا بہترین کہیں گے اور مایوس کن کون سا تھا؟"
"اگر آپ میرے اطمینان کی بات پوچھیں کہ جس کو سوچ کر مجھے لگتا ہے کہ میں نے کچھ اچھا کام کیا ہے تو وہ "شاہ زیب مرڈر" کیس ہے۔ (یہ انٹرویو ڈیل ہونے سے پہلے لیا گیا تھا) اس کے لیے جو میں نے کام کیا' پوری انویسٹی گیشن کی۔ چیف جسٹس صاحب نے بھی سراہا اور میرے پروگرام اور میری انویسٹی گیشن کی وجہ سے اس کیس کو آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ تو مجھے اندر سے اطمینان حاصل ہوا کہ میں نے کچھ اچھا کام کیا۔ اس کے علاوہ جس شو نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی وہ ذوالفقار مرزا کا شو تھا۔ ان دونوں پروگراموں نے مجھے اطمینان دیا ہے اور انتہائی مایوس کن پروگرام تو اللہ کا شکر ہے کوئی نہیں ہوا۔ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ پروگرام سے جو توقع ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہوتی۔ میرے ون ٹو ون انٹرویوز جو ہوتے ہیں ان کے لیے میں دو' دو ماہ یا تین' تین ماہ تیاری کرتا ہوں اور وہ انٹرویوز بہت اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہاں گزشتہ نومبر میں' میں نے "منور حسن" کے ساتھ ایک انٹرویو کیا تھا اور بڑی تیاری کے ساتھ کیا تھا۔ مگر پندرہ سولہ منٹ کے بعد انہوں نے انٹرویو دینے سے انکار کر دیا اور مائیک پھینک دیا کہ میں انٹرویو نہیں دے رہا۔ اس وقت مجھے بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ میں بہت تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ انہیں میرے سوالات بہت سخت لگے اور انہوں نے انکار کر دیا۔"
"آپ ہوں یا دوسرے اینکرز' دھمکیاں ملتی رہتی ہیں' تو آپ کی سیکیورٹی کا کون خیال رکھتا ہے؟ حکومت یا آپ کا ادارہ' یا کوئی بھی نہیں؟"
"میں اللہ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ ان اینکرز میں سے ہوں جو بہترین سیلری لیتے ہیں۔ تو میرا نہیں خیال کہ ہمیں حکومت کی یا کسی کی طرف سے سیکیورٹی کی ضرورت ہے۔ اگر گارڈ رکھنے ہیں تو خود رکھتے ہیں اور گزشتہ دنوں کراچی کے حالات و واقعات کے پیش نظر مجھے آئی جی سندھ نے کال کی' شرجیل میمن نے بھی کال کی اور کہا کہ آپ کو پوری سیکیورٹی دی جائے گی' جب آپ کراچی آئیں گے' لیکن میں نے سیکیورٹی اس لیے نہیں لی کہ خود میں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کراچی میں شہریوں کی حفاظت کے لیے کوئی سیکیورٹی نہیں ہے اور پولیس کی آدھی نفری وی آئی پیز کی حفاظت کے لیے لگائی ہوئی ہے۔ یہ سوال اٹھانے کے بعد اگر میں سیکیورٹی لیتا ہوں تو خود اپنے سوال کی نفی کرتا ہوں۔ تو جب ہم کسی کی فیور لیتے ہیں تو پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ بات کر سکتے ہیں' نہ سوال کر سکتے ہیں۔"
"شاہ زیب صاحب! کچھ شخصیات کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ مثلاً "نواز شریف؟"
"میاں صاحب کو موقع ملا ہے اور میاں صاحب کو زندگی میں جتنے بھی مواقع ملے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے میں ان سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوں۔ ان کے انداز حکمرانی نے مجھے متاثر نہیں کیا اور اب ان کی پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے یہی کہوں گا کہ انہیں چھ مہینے اور دینے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوڈشیڈنگ کے

مسئلے کو حل کر دیں گے البتہ دہشت گردی کے مسئلہ پر انہیں جو کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کر پائے اس معاملے میں ان کی پرفارمنس مایوس کن ہے۔ بائے نیچر میں ان کو جانتا نہیں' کیونکہ انہوں نے مجھے کبھی انٹرویو دیا نہیں۔"
"عمران خان کو کیسا پایا؟"
"خان صاحب کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ایمان دار آدمی ہیں۔ وہ ملک کے ساتھ یا ملک کے لیے بہت سنجیدہ سوچ رکھتے ہیں۔ مگر خیبر پختونخوا کی حکومت کو دیکھ کے مجھے لگتا ہے کہ ایمان داری اور سنجیدگی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ مگر سمت کا بہت گہرا مسئلہ ہے۔ "کے پی کے" میں کام کی کوئی سمت نظر نہیں آ رہی۔"
"آصف علی زرداری کے بارے میں کیا کہیں گے؟"
"آصف زرداری صاحب نے پانچ سال پورے کیے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ پی پی پی کو جس طرح سے سنبھال کر رکھنا چاہیے تھا وہ نہیں سنبھال سکے۔ اپنی ذات کے گرد انہوں نے پارٹی کو زیادہ گھمایا ہے۔ اگر سوئز مقدمات کے خط کا معاملہ تھا تو ان کی ذات کے گرد تھا۔ پرائم منسٹر فارغ ہوا تو ان کی ذات کی وجہ سے۔ تو انہوں نے اپنی ذات کے اندر پارٹی کو بہت محدود کر دیا ہے۔ پہلے بھٹو خاندان میں پارٹی محدود تھی۔ لیکن زرداری صاحب نے پارٹی کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔"
"آصف علی زرداری اور پرویز مشرف کے لیے کہا جاتا ہے کہ بڑے شاطر اور چالاک سیاست دان ہیں جو ان کے پاس بیٹھ جائے اسے یہ اپنا بنا لیتے ہیں۔ ایسا ہے کیا؟"
"دیکھیں جی لفظ شاطر اور چالاک کو ایک طرف رکھ کر کسی سیاست دان کے لیے یہ کہیں کہ یہ بڑا سیدھا اور معصوم ہے تو پھر تو وہ سیاست دان ہی نہ ہوا۔ شاطر ہونا' چالاک ہونا' تیز ہونا اور اچھی سیاست کرنا' یہ تو سیاست میں تعریفی الفاظ ہیں۔ سیاست میں برائی یہ ہے کہ آپ کہیں کہ یار یہ تو بڑا شریف' سیدھا سادہ اور معصوم ہے۔"
"پرویز مشرف کے لیے کہا جاتا ہے کہ بڑی مہارت سے جھوٹ بولتے ہیں' کیا واقعی؟"
"پہلے میں پروگرام کرتا نہیں تھا۔ البتہ ان کے مستعفی ہونے کے بعد میں نے ان کے ساتھ پروگرام کیے اور میں نے انہیں ایسا کوئی جھوٹا نہیں پایا۔"
"یہ بتائیے کہ پورے ملک میں جو دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے' تو یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے یا کوئی تیسری قوت حالات خراب کر رہی ہے؟"
"جی بالکل تیسری قوت ہمیں خراب کر رہی ہے اور اس لیے کر رہی ہے کہ ہمارے اندرونی معاملات خراب ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں خرابی ہے تو پڑوسیوں میں بات کرنے اور مداخلت کرنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور اگر آپ اپنے گھر کے معاملات بہتر کر لیں تو پڑوسیوں کا منہ بھی بند کر سکتے ہیں۔ مگر آپ میں معاملات کو بہتر کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے گھر کے معاملات کو اپنی سیاست' اپنی پالیسی کو اپنے اعمالوں کی وجہ سے اس نہج تک پہنچا دیا ہے کہ تیسری قوت کو اور دیگر ممالک کو اس سے فائدہ ملتا ہے۔ ہمیں خود کو بہتر کرنا ہے۔ کچھ

دعائے صحت

ہماری بہت پیاری مصنفہ رضیہ مہدی شدید علالت کا شکار ہیں۔ اللہ سے دعاگو ہیں انہیں شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔
قارئین سے التماس ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ کی کامل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

سیاسی قوتیں ایسی ضرور ہیں کہ جو ہم کو تباہ کرنا چاہتی ہیں۔ مگر ہمیں پہلے خود اپنے آپ کو بہتر کرنا ہے۔"

"اور اب تھوڑے سے نجی سوال۔۔۔ شادی ہوئی آپ کی؟"

"نہیں جی' ابھی نہیں ہوئی اور ابھی کوئی ارادہ بھی نہیں ہے یعنی دو چار سال تو کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔"

"آپ دیکھنے میں بھی چھوٹے ہی لگتے ہیں۔ تو جب بھی کریں گے اپنی پسند سے کریں گے؟"

"جی میرا خیال ہے کہ اپنی پسند سے ہی کروں گا۔"

"آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"میری صبح بڑی لیٹ ہوتی ہے اور میں آج کل اس پہ بڑی محنت کر رہا ہوں کہ میں جلدی اٹھ جایا کروں' پہلے میں سوتا ہی صبح کے پانچ چھ بجے تھا تو میری صبح دوپہر ایک بجے ہوتی تھی' مگر اپنی قوت ارادی سے میں بارہ بجے اٹھنے لگا اور اب گیارہ بجے اٹھتا ہوں اب میری پوری کوشش ہو گی کہ میں رات کو دو بجے سو جایا کروں اور صبح ساڑھے آٹھ بجے تک اٹھ جایا کروں۔"

"دن کی روٹین کیا ہوتی ہے اور ناشتا کھانا وقت پر کھاتے ہیں یا جب مل گیا کھا لیا؟"

"کھانا میں زیادہ نہیں کھاتا کیونکہ موٹا ہونے سے گھبراتا ہوں اور جب نیند سے جاگتا ہوں تو اخبار پڑھتا ہوں۔ چار پانچ گھنٹے بغیر کسی سے بات کیے میں اخبارات اور دیگر چیزوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ساتھ ساتھ ٹی وی بھی آن ہوتا ہے تو نیوز چینلز بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ ناشتا بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے' لنچ عموماً" نہیں کرتا' البتہ رات کو کھانا کھاتا ہوں' مگر وہ بھی کم۔ اس کے علاوہ "جم" جاتا ہوں' سوئمنگ کرتا ہوں' جوگنگ کرتا ہوں تاکہ اپنے آپ کو فٹ رکھ سکوں۔ رات کو ہم صحافی دوست کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بیٹھ کر حالات و واقعات پر کچھ باتیں کرلیں۔ اسلام آباد میں یہ بڑا کلچر ہے کہ صحافی مل کر بیٹھتے ہیں۔ اچھی گیدرنگ ہو جاتی ہے۔"

"کھانا گھر میں کھانا اچھا لگتا ہے یا باہر؟"

"مجھے سب سے مشکل کام گھر سے باہر کھانا کھانا لگتا ہے۔ مجھ سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً" میں آپ کو بتاؤں کہ رمضان میں میں نے بہت سے لوگوں کو ناراض کیا ہے' مشکل سے کوئی ایک افطاری ہو گی جو میں نے باہر کی ہو گی سحری اور افطاری مجھ سے باہر نہیں ہوتی۔ مجھ سے ہوٹلنگ نہیں ہوتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ پرائیویٹ رہوں اور گھر پہ زیادہ ٹائم دوں' گھر سے زیادہ باہر نہ نکلوں میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنا سارا کام گھر پر ہی کروں۔"

"گھر میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کون کرتا ہے۔ اور بہن بھائی میں کون آپ کے قریب ہے؟"

"گھر میں تو سب ہی میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں' خوش ہوتے ہیں' میری چھوٹی بہن مجھ سے بہت قریب ہے مگر والدین اور دیگر بہنیں اور بھائی ہم سب بہت کلوز ہیں ایک دوسرے سے۔ آپ کو بتاؤں کہ جو ہماری سالانہ چھٹیاں ہوتی ہیں تو ہم سب مل کر ساتھ ہی جاتے ہیں گھومنے پھرنے' ان میں بہنیں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ بہنوئی بھی ساتھ ہوتے ہیں تو ایک بڑی ہی اچھی اور پیاری فیملی ہے ہماری اور سب کا آپس میں ریلیشن بہت اچھا ہے۔"

"مزاج" کیسے رہے' ابتدا سے لے کر اب تک؟"

"میں تو جی بڑا ہنس مکھ انسان ہوں۔ حس مزاح کافی ہے مجھ میں۔ کوشش کرتا ہوں کہ لائٹ موڈ میں رہوں۔ مجھے غصہ دو مہینے میں شاید ایک ہی بار آتا ہے اور پھر بہت آتا ہے' سر پر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔"

"رد عمل کیا ہوتا ہے؟"

"کبھی دوستوں یا بہن بھائی پر آئے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ویسے کسی پہ آجائے تو بول کر اچھا خاصا غصہ نکال لیتا ہوں۔"

"فلمیں اور ڈرامے دیکھتے ہیں؟ اور کون سے چینلز زیادہ پسند ہیں آپ کو؟"

"فلمیں بہت دیکھتا ہوں۔ ہالی ووڈ کی ایکشن فلمیں

مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ تھرلر موویز اور سائنٹیفک فلمیں بھی بہت پسند ہیں۔ ڈرامے بالکل نہیں دیکھتا۔ مجھ سے دیکھے ہی نہیں جاتے اور چینلز میں' میں صرف اور صرف نیوز چینلز ہی دیکھتا ہوں جو چار پانچ ٹاپ کے چینلز ہیں۔"

"میوزک اور کھیل؟"

"گانے بہت ہی شوق سے سنتا ہوں' بہت زیادہ۔ انگریزی میوزک کا بھی بہت شوق ہے۔ انڈین اور پاکستانی گانے بھی بہت شوق سے سنتا ہوں۔ لتا' محمد رفیع اور کشور کا بہت بڑا فین ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو گانا لتا نے گا دیا اس کو دوبارہ کوئی بھی نہیں گا سکتا خواہ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلے۔ رفیع صاحب تک بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔"

"آپ بھی باتھ روم سنگر ہیں؟"

"باتھ روم سنگر نہیں' میں تو باقاعدہ سنگر رہ چکا ہوں۔ یونیورسٹی کے زمانے میں ہمارا بینڈ تھا اور میں لیڈ سنگر تھا' ہم نے بڑے گانے گائے ہیں' بس یونیورسٹی کے بعد سب چیزیں ختم ہو گئیں۔ میں تو یونیورسٹی کا بڑا سریلا سنگر مشہور تھا۔ کھیل میں کرکٹ بہت شوق سے دیکھتا ہوں اور کالج لائف میں کرکٹ کھیلتا بھی تھا۔ ٹینس اور فٹ بال سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔"

"چلتے چلتے کوئی بات جو آپ اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہتے ہوں' جو میں نہ پوچھ سکی ہوں؟"

"میرے خیال میں آپ نے سب کچھ ہی پوچھ لیا ہے' لیکن پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ مجھ میں کچھ بھی نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں کے لڑکے کو جو ایک پیلے اسکول میں پڑھا ہے۔ جس نے سترہ سال گاؤں میں گزارے ہیں اور محنت کر کے گزارے ہیں اس کو جو عزت ملی ہے اس میں میرے نصیب سے زیادہ میرے ماں باپ کا ہاتھ ہے جنہوں نے بڑی محنت کر کے میری شخصیت کو بنایا ہے۔ میری والدہ نے میرے لیے بڑی دعائیں کیں اور بڑی سادگی سے زندگی گزاری اس کا مجھے اجر ملا ہے۔ ہر اولاد کو چاہیے کہ جب وہ کچھ بن جائے تو اپنے والدین کے لیے بھی ضرور کچھ کرے۔ جب آپ چھوٹے ہوتے ہیں تو والدین آپ کی ہر طرح کی بات کو برداشت کرتے ہیں تو جب وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کی محنت کو' ان کے پیار کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیا والدین کے لیے سارے بچے ایک جیسے ہوتے ہیں؟"

"میرا تو یہی خیال ہے' کیونکہ انہوں نے سب بچوں کے ساتھ مساوی سلوک کیا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ساری بیٹیاں ڈاکٹر بنا دیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شاہ زیب خان زادہ سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمیں وقت دیا۔

☼

کائنات کے سارے خوب صورت رنگ' زندگی کی ساری خوب صورتی' خوش نمائی صنف نازک کی ہی مرہون منت ہے۔ ہر میدان میں اس کی غیر معمولی صلاحیتیں سامنے آرہی ہیں۔ تخلیق کے حوالہ سے تو قدرت نے ہی اسے ایک بلند درجہ پر فائز کیا ہے' لیکن ادب کے میدان میں بھی اس نے خود کو منوالیا ہے۔ ایک جرمن مصنف کا کہنا ہے۔

"اگر پڑھنا لکھنا پہلے کی طرح صرف مردوں کو سکھایا جانے لگے تو دنیا سے ادب کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔"

لیکن آج بھی صنف نازک کا سب سے معتبر حوالہ گھر اور کچن ہے۔ اسی کے دم سے دنیا کے کروڑوں گھر ایک خوب صورت زندگی سے جگمگاتے ہیں۔ کچن آباد ہو تو گھر کے افراد بہت شاد نظر آتے ہیں۔ خاتون خانہ پکانے کے ہنر سے آشنا ہو تو مہمان بھی کھنچے چلے آتے ہیں۔

ہماری مصنفین بہت ذہین' باصلاحیت ہیں۔ نت نئے موضوعات پر ناول' افسانے تخلیق کررہی ہیں۔ یہ مصنفین کھانا پکانے اور گھرداری کے فن سے کتنی آشنا ہیں' یہ جاننے کے لیے ہم نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر اسی حوالہ سے سروے کیا ہے۔

سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر خواتین کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں جیسے گوشت صاف کرنا' سنبھالنا اور پکوان تیار کرنا۔ آپ کو ان میں سے کون سی ذمہ داری سونپی جاتی ہے اور آپ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہیں۔

2۔ عیدالاضحیٰ پر آپ گوشت کی کون سی ڈش خاص طور پر تیار کرتی ہیں۔ جسے گھر کے سب لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کی ترکیب۔۔۔؟

آیئے دیکھتے ہیں قارئین کے دلوں میں بسنے والی مصنفات بحیثیت خاتون خانہ اپنی ذمہ داری کس طرح سر انجام دیتی ہیں۔

عید کے رنگ

امت الصبور

سائرہ رضا۔۔۔ کراچی

ہائے۔۔۔ مارڈالا۔۔۔ اللہ۔۔۔ آآآ۔

1۔ جناب سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ گوشت صاف بھی کرتی ہوں۔ اسے سنبھال کر بھی رکھتی ہوں اور پکوان تو تیار کرنے ہی ہوتے ہیں۔

گوشت کے ڈھیر کے پاس پھسکڑا مار کے بیٹھ جاتی ہوں۔ سڈی' چھریاں' ٹوکا سب میرے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ گوشت کے پیکٹ بناتی ہوں۔ موٹے کالے مار کر سے چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھتی ہوں۔ نہاری' حلیم' بریانی' قیمے کے لیے وغیرہ وغیرہ۔

ایک بڑے تھیلے میں بڑے بڑے ہڈے جمع کرتی ہوں کہ بعد میں پائے کے ساتھ ساری رات پکائے جائیں گے' پھر ان تھیلیوں کو فریزر میں اس حساب سے رکھتی ہوں کہ پہلے کن کی ضرورت پڑے گی اور سب سے آخر میں کن کی۔۔۔

ایسے بڑے گوشت کے پارچے جو چربی اور ہڈی کے ساتھ اس طرح مدغم ہوں کہ مجھ سے الگ نہ ہوں۔ انھیں نمک کے ساتھ ابال لیتی ہوں اپنے ہی پانی میں' چربی پگھل جاتی ہے تو اسے نتھار لیتی ہوں اور جم جانے پر پھینک دیتی ہوں۔ ہڈی الگ ہو کر بے کار۔۔۔ ہلکی آنچ پر پکنے کے باعث یہ گوشت بے حد لذیذ ہوتا ہے اور کھالیا جاتا ہے۔

اس گوشت کو اگر صبح سویرے اور رات گئے ہلکی آنچ پر ہر روز گرم کرتے رہیں تو یہ ہفتہ دس دن تک بالکل درست رہتا ہے۔ آپ اس میں سے نکال لیں اور استعمال کریں۔ میری رائے (میرے گھر والوں کی بھی) ہے کہ بہت سارے مسالوں (گرم مسالے' پیاز ادرک' لہسن) کے ساتھ خوب بھون بھون کر پکائے جانے والے گوشت کی نسبت نمک والا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے اور اگر آپ خوب کھانا چاہتے ہیں تو کھایا بھی جاتا ہے۔

ایک ضروری بات جو میں کہنا چاہتی ہوں ہمیشہ سے کہ میں نے کبھی گوشت کو دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھائی' نہ ہی اسمیل آنے کی شکایت کی یا کمرے ہی سے بھاگ گئی یا کراہت آمیز انداز میں پیچھے ہٹی۔ کیونکہ ایک تو یہ رزق کی توہین کے زمرے میں آئے گا۔ دوسرے قربانی سے لے کر گوشت کی تقسیم اور سنبھالنے سے لے کر کھانے تک ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور خوب صورت یادگار معاشرتی روایت بھی۔۔۔ آپ ثواب کی نیت رکھیے۔ بس۔۔۔ (سو اگر کوئی ناک بھوں چڑھاتا ہے تو اسے اپنی تصحیح کی فوری ضرورت ہے)

2۔ میں سب کچھ تیار کرلینا چاہتی ہوں۔ مگر کوئی کھائے تو۔۔۔ بیٹیاں دانتوں میں گوشت پھنسنے کی شکایت کرتی ہیں۔

کلیجی میں سارا سال صرف عید ہی کے دن کھاتی ہوں۔ بازار سے کبھی نہیں خریدی۔ کلیجی صرف امی کے ہاتھ کی پسند ہے۔ میری امی بہت لذیذ کھانے بناتی ہیں اور بہت تیزی سے۔۔۔ (کھانا بنانے میں یہ پھرتی میرے اندر بھی ہے۔ کون گھنٹوں چولہے کے آگے کھڑا ہو کر اپنے حسن کو گہن لگائے۔ جھٹ پٹ۔)

عید کا دن چڑھتے ہی میں سوچتی ہوں' مجھے فوری طور پر آدھ کلو/ تین پاؤ گوشت مل جائے (کلیجی کا قطعی انتظار نہیں ہوتا) تاکہ میں فوری طور پر شامی کباب چولہے پر چڑھا دوں۔ مگر میں دال اور مسالے ڈال کر میں گوشت کی منتظر ہوتی ہوں۔ کوئی تو دے دے۔ یاد رہے دو تین بجے سے پہلے نہ اپنا گوشت آتا ہے نہ پڑوسی بھیجتے ہیں۔

جیسے ہی گوشت ملتا ہے تو میں اسے فوراً" بھون کر روٹی ڈال لیتی ہوں کہ صبح سے میٹھا کھا کھا کر منہ کا ذائقہ خراب ہو چکا ہے۔ اپنا گوشت آجائے تو تقسیم اور محفوظ کرنے کے عمل میں اتنی بری طرح جت جاتی ہوں کہ گوشت کے انتظار میں بھیگی دال پھول کر کپا ہو جاتی ہے۔

اب بھنا گوشت اور کلیجی کھا کر طبیعت سیر ہو چکی ہے۔۔۔

میں تکے بنانے کے لیے چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنا رہی ہوں۔ چائے کا کپ پاس دھرا ہے۔ ادرک لہسن کا پیسٹ نمک مرچ اور پسا گرم مسالا ہمراہ پسا کچا پپیتا بوٹیوں کو لگا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دو تین گھنٹے بعد اسے کڑاہی میں ڈال کر گلالوں گی۔ جب بوٹیاں گل جائیں گی اور پانی خشک ہو جائے گا تو کوئلے کو دہکا کر باربی کیو خوشبو دوں گی۔ لہسن مرچ' پودینا اور نمک پیس کر دہی میں پھینٹ کر چٹنی تیار ہے۔ ساتھ کولڈ ڈرنک۔۔۔ مشتاق صاحب (شوہر) نے یہی گوشت کھانا ہے اب۔ (اگر امی کے گھر ہوں تب بھی یہی ترتیب ہے۔)

صاحبزادیاں اس دوران انڈا پراٹھا' چائے پراٹھا اور گوشت کے مسالے کے ساتھ پراٹھا کھا کر پیٹ بھر چکی ہیں۔ ان کی بلا سے ماں جو کچھ مرضی کرتی رہے۔ ہاں کباب کھا لیتی ہیں۔

سارا دن گزار کے مجھے رات بستر پر جاتے وقت اپنی قسمت کو روتی اس بھیگی دال کا خیال آتا ہے تو میں دکھتی کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھتی ہوں۔ گوشت شامل کر کے تکر جلا دیتی ہوں۔

اس دوران میں فریج سے کوئی نہ کوئی پھل لے کر کھاتی ہوں یا سلاد وغیرہ میرے گھر میں عید کے دن گوشت اور مسالوں کی خریداری سے زیادہ اہم ترین خریداری ہوتی ہے۔ سلاد کی ..... ٹماٹر' پیاز' کھیرا' بند گوبھی' شملہ مرچ' چقندر وغیرہ ذرا سا بھی گوشت کھا کر مجھے تیزابیت ہونے لگتی ہے۔

دوسرے پھل جس کا بھی موسم ہو۔ اب اس بار سیب ہوں گے۔ آڑو بھی ہو سکتے ہیں اور وہ مل جائیں تو کیا ہی بات ہے کولڈ ڈرنک کے بجائے میں سکنجبین بنا بنا کر پیتی ہوں۔

دراصل میں معدے کے کچھ گمبھیر مسائل کا شکار ہوں اور گوشت کھانے سے میری زبان' دانت' ہونٹ اور منہ کا اندرونی حصہ بہت جلد پک جاتا ہے۔ سو میں گوشت کو تن تنہا کھا ہی نہیں سکتی (بچپن سے)۔

اب پھر آتے ہی کباب کی جانب۔

آدھے گھنٹے میں کباب کا آمیزہ گل جاتا ہے۔ چولہا بند اور میں غڑاپ بستر کے اندر۔

اب عید کا دوسرا دن شروع ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ سے سحر خیز ہوں۔ سب سو رہے ہیں اور میں اٹھ کر ایک کپ چائے ہاتھ میں لے کر لکر گھولتی ہوں۔

کباب..... آہ میرے پیارے کباب.....!

دراصل پیاری بہنو! میں بے حد لذیذ..... ققق..... کباب بنانے میں ماہر ہوں اور یہ میں نہیں..... لوگ بھی کہتے ہیں۔

اب میرے ہاتھوں میں ایک کونڈی ہے اور لکڑی کا ایک بڑا ڈنڈا۔ ایک بار پھر میں زمین پر چوکڑی مار کے بیٹھ گئی ہوں اور دے دنا دن کباب پیسے جا رہے ہیں۔ آدھے سے پونے گھنٹے میں میں اس کام سے فراغت پا کر ٹکیاں بناتی ہوں اور ٹرے میں لگا کر انہیں فریز کر دیتی ہوں۔

عید کے دوسرے دن ہم سب کا ناشتا کباب پراٹھا چٹنی (دہی پودینے والی) اور چائے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سالوں کا دستور ہے۔

اب ان ہی کبابوں کی ترکیب لکھ رہی ہوں اور ہاں مہمانوں کو بھی وہی سرو کرتی ہوں اور جیسے ہی شک ہو کہ ختم ہونے والے ہیں..... دوبارہ چڑھا دیتی ہوں۔

شامی کباب

اشیا :

گوشت سرخ چکنائی کے بغیر ڈیڑھ پاؤ (بوٹیاں مناسب)

چنے کی دال — ایک پاؤ

نمک مرچ پسی — حسب ذائقہ

ثابت گرم مسالا — حسب ذائقہ

لونگ — سات عدد

کالی مرچ — دس عدد

دار چینی ۲ انگلی برابر کا ایک ٹکڑا

بڑی الائچی — ایک عدد

زیرہ — ایک چمچ کھانے کا

ثابت دھنیا — دو چمچ کھانے کے

گول سرخ مرچ — دس عدد

پیاز — دو عدد درمیانی

لہسن — پانچ بڑے جوے

ہری مرچ — دس سے بارہ عدد

(گوشت پیسنے کے بعد باریک کاٹ کر ڈالیں)

(مقدار اس لیے کم رکھی کہ اگر آپ لوگ بنائیں تو زیادہ مشکل نہ ہو)

ترکیب :

ککر (پتیلی) میں ماسوا ہری مرچ کے سب اکٹھا ڈال دیں اور پانی اتنا اوپر ہو جس میں دال اور گوشت چھپ جائے اور گل جائے (کم از کم تین انچ اوپر)

ککر میں آدھا گھنٹہ اور پتیلی میں تقریباً" گھنٹے میں سب گل جائے گا۔ پانی بالکل خشک ہو جائے (جلا مت دیجیے گا) تو اتار کر کونڈی (سل بٹا..... مشین نہیں..... ہرگز نہیں) میں پیسنا شروع کریں ساری محنت اور خوبی یہیں ہے۔

دال گوشت ثابت مسالے آٹا کر دیں۔ اتنا پیسیں کہ لگے آپ نے سخت ترین میدہ گوندھ رکھا ہے۔ دال کا ذرہ اور گوشت کا باریک ریزہ بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے۔ اب نمک مرچ چکھ لیں کٹی ہوئی مرچیں ملا کر دو ڈنڈے اور برسا لیں پھر ٹکیاں بنائیں۔

فرائی پین گرم کریں۔ ٹکیوں کو انڈے میں لپیٹ لپیٹ کر ہلکی آنچ پر تیل میں تلتے جائیں۔ تیل بہت زیادہ نہیں ڈالیں۔

بے حد لذیذ کباب تیار ہیں کہ امم م۔

(یہ بقر عید میں کتنے دن ہیں ابھی ..... کباب جو بنانے ہیں)

تیسرے دن کچے قیمے کے کباب بنتے ہیں۔ یہ سب کے فیورٹ ہیں۔

ان کی ترکیب اگلی بار ان شاء اللہ۔

سمیرا حمید

سوالات پڑھ کر کچھ مایوسی ہوئی۔ دونوں ہی سوالات پر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے لیکن ..... لیکن چونکہ مجھے سروے میں شرکت کرنا ہی ہے تو میں ضرور ہی کچھ نہ کچھ لکھوں گی بے شک وہ ہماری پڑوسن آنٹی کی عید کا احوال ہی کیوں نہ ہو۔

(1) گوشت کے حوالے سے میرے پاس تو کوئی خاص ذمہ داری نہیں ہے (بالکل نہیں) اگر دے ہی دی گئی تو یقین جانیے! آئندہ آنے والی باقی تمام عیدوں کے لیے چھین لی جائے گی۔ (خفیہ مہارت) عید کے دن سے متعلق اگر کوئی ہے تو وہ برتن دھونا ہے۔ کیونکہ برتن دھونا میرے نزدیک دنیا کا آسان ترین کام ہے (سچ میں) تو یہ آسان ترین کام میں آسانی سے کرتی ہوں' کئی کئی بار کرتی ہوں اور یقین جانیے! مکمل تیار ہو کر بھی کر لیتی ہوں۔

(2) ویسے میں بریانی اچھی بنا ہی لیتی ہوں لیکن عید کی یہ خاص ڈش نہیں ہے' عید کے لیے (پہلے دن نہیں) باربی کیو کے لیے ذرا اہتمام کیا جاتا ہے (انتظار بھی) اور یہ میرے بھائی لوگ بناتے ہیں' اپنے تمام تر (سال بھر کے) فلسفوں اور مہارتوں کے ساتھ۔ ہم لوگ تو صرف انتظار کرتے ہیں۔ میرے بس کی ابھی فی الحال بات نہیں ہے باربی کیو کرنا اور ویسے بھی جب مرد حضرات کر رہے ہوتے ہیں تو ہم انہیں ہی کرنے دیتے ہیں۔ پھر وہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہم ان کے "کاموں" میں دخل دیتے ہیں تو ہم ان کے "کاموں" میں دخل نہیں دیتے۔ اس لیے ترکیب کے لیے میں معذرت چاہتی ہوں۔

جی جی ..... بس وہی وہی بالکل وہی ترکیب جو آپ سب اپنے اپنے گھروں میں بنا کر کھاتے ہیں' اگر زیادہ مزے کے کھانے کھانے ہیں تو بس ایک ہی ترکیب کا استعمال کریں کہ اسے صرف اور صرف گھر کے مرد حضرات سے بنوائیں۔

مرچ مسالا تیز ہو گیا تو بھی مزہ آئے گا..... کچھ کم زیادہ ہو گیا تو بھی۔

اس عید پر یہ ترکیب ضرور آزمائیے۔

کیسے..... یہ آپ کو سوچنا ہے' ہم نے تو پچھلے سال ہی سوچ کر اس پر عمل کروا لیا (ہاہاہا)

صدف آصف

سب سے پہلے تو میری جانب سے آپ کو' سارے اسٹاف اور قارئین کو عید کی ہزاروں خوشیاں مبارک۔

(1) پہلی بات تو یہ ہے کہ جوائنٹ فیملی میں رہنے کے باوجود کیونکہ ہم سب کا قربانی میں الگ الگ حصہ ہوتا ہے' اس لیے تینوں کام ہی کرنے پڑتے ہیں' میں تو اپنی سہولت کی وجہ سے گوشت کے آتے ہی اس میں سے بانٹنے کا علیحدہ کر دیتی ہوں' ہمارے سسرال کی یہ اچھی روایت ہے کہ چاہے خاندان ہو یا محلہ' ہم صرف وہیں گوشت بھیجتے ہیں' جہاں قربانی نہیں ہوئی ہو۔

گھر کے حصے والے گوشت میں سے قیمے کا الگ' بریانی' کباب کا روکھا گوشت اور پلاؤ کے لیے ہڈی والا

گوشت دھو کر کافی دیر کے لیے چھلنیوں میں ڈال کر چھوڑ دیتی ہوں' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح خون اور بساندھ بھرا سارا پانی نکل جاتا ہے۔ ایک تو گوشت میں بو نہیں رہتی' پھر فریج بھی صاف رہتا ہے۔ جب گوشت کا سارا پانی نکل جاتا ہے تو چھیچھڑے' چربی وغیرہ کاٹ کر گوشت کو مختلف تھیلیوں میں پیک کر دیتی ہوں' ساتھ ساتھ گالے مارکر سے ہر تھیلے پر لکھتی جاتی ہوں کہ یہ بریانی کا ہے یا یہ کباب کا گوشت ہے۔ اس وقت کی تھوڑی زیادہ محنت بعد کے آرام کا باعث ہوتی ہے۔ دھلا دھلایا صاف ستھرا گوشت فریج میں موجود ہوتا ہے' مہمانوں کی آمد پر نکال کر وقت ضائع کیے بغیر کھانا پکایا جاسکتا ہے۔

ہمارے سسرال میں پہلے دن کھانے پر کافی لوگ موجود ہوتے ہیں' تو میں اور میری دونوں جٹھانیاں صلاح مشورے سے گوشت کی ایک ایک ڈش اور یخنی پلاؤ پکا لیتے ہیں' اس طرح تینوں کو سہولت ہو جاتی ہے' اور دسترخوان پر بھی ورائٹی ہو جاتی ہے' کیونکہ ہم سب ہر تہوار پر کھانا ساتھ ہی کھاتے ہیں۔

(2) بقر عید میں کیونکہ سب گوشت دیکھ دیکھ کر تھک جاتے ہیں تو ہلکا پھلکا کھانا چاہتے ہیں۔

بیف پارچے

ایک کلو گائے کے گوشت کی روکھی بڑی بڑی بوٹیاں لے کر اس میں دو چائے کے چمچ لہسن ادرک اور حسب ذائقہ نمک شامل کر کے تھوڑے سے پانی میں چولہے پر چڑھا دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اب گوشت کو ٹھنڈا کر کے گوشت فریج میں رکھ دیں۔ اچانک مہمان آجائیں تو اس میں سے پتلے پتلے پارچے کاٹ کر تیل میں فرائی کر لیں۔ اب اوپر سے پسی کالی مرچ یا چاٹ مسالا چھڑک کر لیموں کے ساتھ پیش کریں۔

بیف پارچے بنانے میں بہت آسان اور مزیدار ڈش ہے جو تینوں وقت پیش کی جاسکتی ہے۔ لنچ میں دال چاول کے ساتھ یا مہمانوں کو شام کی چائے کے ساتھ فرائی کر کے گرم گرم پیش کریں' رات کے کھانے میں ان لوگوں کو کولڈ بیف کے طور پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے جو چکنائی اور تیز مرچ مسالے سے پرہیز کرتے ہیں۔

بیف کے پتلے پارچے کاٹ کر ایک چائے کا چمچہ تیل ڈال کر فرائنگ پین میں گرم کر لیں۔ اب ایک بن کو دو ٹکڑے کر کے اس کے بیچ میں پارچے رکھ لیں' اوپر سے پیاز کے لچھے' کھیرا' ٹماٹر اور کیچپ لگا کر لذیذ بیف برگر پیش کریں۔

عظمیٰ افتخار

(1) یہ بالکل بجا فرمایا' امتل آپی آپ نے کہ عیدالاضحی کے موقع پر خواتین کی ذمہ داریاں واقعی ہی بڑھ جاتی ہیں۔ پہلے دو کام یعنی گوشت صاف کرنا اور سنبھالنا' لازمی میرے حصے میں آتے ہیں' جبکہ تیسرا کام یعنی پکوان تیار کرنے کا کام آپشنل ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ڈش تیار کرنی ہو تو وہ بھنی ہوئی کلیجی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

قربانی کے گوشت کی تقسیم کے بعد' جو حصہ گھر کے استعمال کے لیے مختص ہوتا ہے .... اسے کاٹ کر چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے' پھر انہیں دھو کر' ان کا پانی نتھار لیا جاتا ہے اور پھر مختلف ڈشز کے مطابق ان بوٹیوں کے پیکٹ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ گوشت کے کچھ حصے کا باریک قیمہ کروا لیا جاتا ہے' تاکہ وہ مختلف طرح کے کباب اور کوفتے بنانے کے کام آسکیں۔

(2) عیدالاضحی پر ہر طرف باربی کیو کا چرچا رہتا ہے۔ عید کے دوسرے دن ہمارے گھر بھی باربی کیو کا اہتمام ہوتا ہے۔ تمام عزیز و اقارب جمع ہوتے ہیں۔ جہاں بڑے سے صحن میں گپ شپ' میوزک' ہلا گلا اور سیخوں پر گوشت کی مسالا لگی بوٹیوں کو پرونے کا کام ہو

بقیہ صفحہ نمبر 275

عفت سحر طاہر

بِن مانگی دعا

امتیاز احمد ڈائننگ ٹیبل پر پہنچے تو سفینہ ناشتے کے لیے موجود تھیں۔
"واہ! بڑی خوشبوئیں لگا رہے ہو آج کل۔" سفینہ نے فضا میں سونگھتے ہوئے لطیف سا طنز کیا تو وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے ٹھٹک سے گئے۔
"تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں تو چھوڑ دیتا ہوں۔" چشمہ اور موبائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا انداز ہمیشہ کی طرح دوستانہ ہی رکھا۔
"خیر! ایسی بھی کوئی خوش فہمی نہیں مجھے کہ میری خاطر تم کچھ چھوڑتے پھوگے۔"
ان کے آگے آملیٹ کی پلیٹ کھسکاتے ہوئے وہ دوسری پلیٹ میں توس رکھنے لگیں۔ امتیاز احمد کو معلوم تھا یہ دھواں سا "کہاں" سے اٹھ رہا ہے۔
"کمال کرتی ہو سفینہ بیگم! میں کون سا "چار" کر کے بیٹھا ہوں۔ جنہیں چھوڑ کے تمہیں خوش کرنے کی کوشش کر سکوں۔" انہوں نے ناشتا شروع کرتے ہوئے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔
"ہونہہ! یہاں تو ایک ہی دل پہ بہت بھاری ہے۔" سفینہ نے جل کر کہا۔ تو وہ توجہ دیے بغیر اپنے لیے کپ میں چائے نکالنے لگے۔
سفینہ کا دل اور جلا۔

اور ایسا ہمیشہ اسی وقت ہوتا تھا' جب وہ امتیاز احمد سے الجھنا چاہتیں اور وہ یوں ان سے دامن بچاتے جیسے وہ کانٹے دار جھاڑی ہوں۔ ان کی تلملاہٹ بھری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے امتیاز احمد نے خود ہی بات بدل ڈالی۔

"معیز چلا گیا یونیورسٹی؟"

"جگا کے آئی ہوں۔ فریش ہو کے آرہا ہے۔ ایزد اور زارا چلے گئے ہیں کالج۔"

مجبوراً" ہی سہی مگر سفینہ کو بھی اپنا موڈ بحال کرنا پڑا۔ اسی وقت نکھرا نکھرا سا معیز چلا آیا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ آج اتنی دیر؟" امتیاز احمد نے نظر بھر کے خوبرو بیٹے کو دیکھا۔

"جی ابو! پہلے دو پیریڈز فری تھے۔ سوچا آ، ام ہی کیا جائے۔"

وہ مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر امتیاز احمد کو احساس ہوا' معیز ان کا سب سے چلبلا اور حاضر جواب بیٹا ہوا کرتا تھا' مگر اب ایک عجیب سی سنجیدگی اور لیا دیا سا انداز اس کی پہچان بنتا جا رہا تھا۔

"ہوں۔ اچھا کیا۔" انہوں نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

سفینہ نے جوس کا گلاس بھر کے معیز کے سامنے رکھا۔ اسی وقت امتیاز احمد کا موبائل بجنے لگا۔

"ٹھیک سے ناشتا کرو معیز! ضروری نہیں کہ یونیورسٹی جا کے الم غلم سے پیٹ بھرا جائے۔" سفینہ بیٹے کو ٹوک رہی تھیں۔

"ہوں۔ اچھا۔" امتیاز احمد مبہم سے انداز میں فون پہ بات کر رہے تھے۔

"کتنے چاہئیں؟" ان کا لہجہ مدھم پڑا تو سفینہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اچھا کب تک؟" امتیاز احمد انہیں متوجہ ہوتے دیکھ کر اٹھ گئے۔ موبائل ان کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں پہنچا دوں گا تم فکر مت کرو۔" وہ دھیمی آواز میں کہتے دور چلے گئے تھے۔

"دیکھا تم نے کن ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔" دانت پیستے ہوئے سفینہ نے کہا تو معیز چونکا۔

"جی ماما! کون اڑ رہا ہے؟"

"یہی۔ تمہارا باپ اور کون... کئی دفعہ ایسے ہی خفیہ فون آتے ہیں دن میں۔"

وہ تلملا رہی تھیں۔ معیز نے ایک سلگتی نگاہ ادھر ڈالی' جدھر امتیاز احمد گئے تھے۔ وہ کیا ناواقف تھا باپ کی اس ادا سے... ہرگز نہیں۔

یہ وہ فون کال تھی' جو وہ اس کی ماں کے سامنے سننے کی ہمت نہیں رکھتے تھے' مگر جسے سننے سے وہ بھی انہیں روک نہیں سکتا تھا۔

"کم آن ماما! ایسے کوئی خفیہ والوں سے تعلقات نہیں ہیں ان کے۔" معیز نے سراسر انہیں بہلایا۔

"لکھ کے رکھ لو تم معیز! تمہارا باپ ابھی تک اس حرافہ سے رابطے میں ہو گا۔ دنیا چھوڑ دے اسے۔ یہ کبھی نہیں چھوڑے گا۔"

اس موضوع پر سفینہ حد سے زیادہ زہریلی ہو جاتی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ سالوں پہلے وہ قصہ ابو نے اپنے ہاتھوں' اپنی مرضی سے ختم کیا تھا۔ پھر بھی آپ کو یقین نہیں آیا۔" وہ جھنجلا سا گیا۔

"مگر یہ مت بھولو کہ وہ مجبور ہو گیا تھا اس قصے کو ختم کرنے کے لیے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کچھ آنے والا نہیں تھا۔ میں تو مجبوری کا سودا ہوں اس شخص کے لیے۔"

سفینہ نے اولاد سے کبھی ماضی کا ایک لفظ نہ چھپایا تھا۔ کیوں کہ یہ ان کے باپ کا ماضی تھا۔ اپنا ہوتا تو یقیناً" چھپاتیں۔ امتیاز احمد لوٹ آئے۔

"آفس سے فون تھا۔" ان کی وضاحت قطعی غیر ضروری تھی۔

"تو یہیں بیٹھ کے سن لیتے۔ یہاں کون سا پابندی ہے آفس کے متعلق بات کرنے پر۔ تم تو یوں اٹھ کے کونے میں گئے جیسے پرانی محبوبہ نے فون کر دیا ہو۔" سفینہ کی زبان کے آگے کھائی تھی۔ اب کی بار امتیاز احمد کو بھی برا لگا۔

"سوچ سمجھ کے بات کیا کرو سفینہ! چھوٹے چھوٹے لفظوں کی پکڑ بہت سخت ہوا کرتی ہے۔" پھر وہ انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر معیز کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم فارغ ہو چکے تو مجھے ذرا بینک لے چلو۔ پھر آفس چھوڑ دینا۔" ان کی گاڑی ورکشاپ میں تھی اور آج کل ان کے پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری معیز پر ہی تھی۔

"جی چلیے۔" وہ فوراً" ہی اٹھ گیا۔ اس موضوع نے اس کی طبیعت بھی اچھی خاصی مکدر کر دی تھی۔ جانے اس موضوع کے ساتھ معیز احمد کے کیسے تار جڑے تھے کہ اس کی سوچیں مرتعش ہو جاتیں اور وہ خود کو بہت تنہا اور بے بس پاتا۔

"ہونہہ! آفس کا فون۔ ابھی میں موبائل چیک کرتی تو پول کھل جاتی جناب کی۔ جوان اولاد کا لحاظ کیا میں نے ورنہ..." سفینہ کا غصہ ان کے جانے کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ امتیاز احمد نے ایک نظر اسے دیکھا' پھر تاسف سے بولے۔

"اپنی ماں کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ خواہ مخواہ اپنا بی پی شوٹ کرتی رہتی ہے۔"

"ان کے سامنے جب "خفیہ" فون آئیں گے تو ان کا بی پی لازمی شوٹ کرے گا۔" معیز کا انداز خفگی سے بھرا تھا۔

"تم بھی...؟" امتیاز احمد کو برا لگا۔

"کیا ابو! خواہ مخواہ کا درد سر پال رکھا ہے آپ نے۔ کیوں اپنی پرسنل لائف خراب کر رہے ہیں۔ یاد کریں ماما کا رویہ تب سے اتنا پوزیسیو ہوا ہے جب سے ان کالز کا سلسلہ چلا ہے۔" معیز نے انہیں یاد دلایا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر بڑے سرسری انداز میں پوچھنے لگے۔

"تم بتاؤ۔ تم نے اپنے فیوچر کے متعلق کیا سوچا ہے؟" معیز نے بے اختیار باپ کا چہرہ دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔ معیز ان کے سوال کی گہرائی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تب ہی سامنے متوجہ ہوتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

"میں اپنی زندگی اپنی ترجیحات کے مطابق گزارنا چاہتا ہوں۔"

"اور اگر اس میں میری کوئی خواہش بھی شامل ہو جائے تو...؟"

ان کے لب و لہجے میں ایک آس ایک امید سی اتر آئی تھی' جسے محسوس کرتے ہوئے معیز احمد کا دل ویسے ہی پگھلنے لگا جیسے آج سے تین سال پہلے... اس نے سر جھٹکا۔

"آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کی خواہش کا بوجھ ہی ڈھو رہا ہوں میں۔" اس "یاد" نے حسب معمول اسے تلخ کر دیا تھا۔

"اگر تم چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو معیز! اگر ایک قدم میں نے اٹھایا ہے تو دوسرا تم اٹھاؤ۔" انہوں نے بدستور مصالحانہ انداز اپنا رکھا تھا۔

"میں وہ قدم اٹھا چکا ابو! مگر اب بس اور کچھ نہیں۔ میں اس راہ پر چلنا ہی نہیں چاہتا۔ اپنی زندگی کے لیے میں اپنے دل و دماغ کی تمام تر رضامندی کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سلگتے ہوئے قطعی انداز میں جواب دیا۔ امتیاز احمد نے لب بھینچے۔ معیز نے بینک کے سامنے گاڑی روکی۔

"یہ ٹاپک مجھے ٹینشن کے علاوہ اور کچھ نہیں دیتا ابو! ماما کے سامنے میں خود کو چور سا محسوس کرتا ہوں کیوں کہ اس راز میں میں آپ کا شریک ہوں۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ قدرے رکا اور پھر تلخی سے بولا۔

"بلکہ اس گناہ میں بھی۔ جسے کرنے کی اجازت ماما زندگی بھر نہ دیتیں۔"

"تم محض جذباتی ہو رہے ہو معیز! ابھی "اس" سے ملو گے تو یقین کرو، میرے فیصلے کو بہترین پاؤ گے۔" وہ گاڑی سے اترتے ہوئے رسانیت سے بولے۔ معیز نے سلگتی نگاہوں سے انہیں بینک میں داخل ہوتے دیکھا۔

"ہونہہ! بہترین فیصلہ..... جس کا تاوان تین سال سے موٹی موٹی رقموں کی صورت بھر رہے ہیں۔ آپ" اس کی رگ رگ میں وحشت سی بھرنے لگی تو پراگندہ سوچوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے گاڑی میں پرشور میوزک لگا لیا اور سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند کر خود کو پرسکون کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼
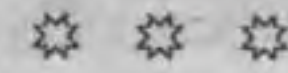
"کیا بات ہے۔ کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو؟" دھپ سے اس کے پاس گھاس کے قطعے پر بیٹھتے ہوئے حنا نے کچھ اس قدر اچانک آکے پوچھا کہ وہ پل بھر کو گڑبڑا سی گئی پھر جلدی سے خود کو سنبھالا۔

"اتنی جلدی پیریڈ ختم ہو گیا؟" اس نے بات بدلنا چاہی مگر حنا بیوقوف ہرگز نہ تھی۔

"محترمہ! آدھے گھنٹے کا پیریڈ تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جب میں گئی تھی، تب بھی تم اسی پوزیشن میں بیٹھی تھیں اور اب جب آئی ہوں تب بھی ویسے ہی بیٹھی ہو۔ مسئلہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں یار! بتایا تو تھا۔ سر میں درد ہے۔ تب ہی تو کلاس بھی بنک کی ہے میں نے۔" اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے گویا وہاں سے شکستگی کے تاثرات کو مٹانے کی سعی کی۔

"اللہ..... " حنا نے جیسے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے کے لیے گردن گھما کر تھوڑی دور لان میں بیٹھے لڑکیوں کے گروپ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ یوں ہی ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ حنا نے چند لمحوں کے بعد اسے گھور کے دیکھا۔

"تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے ایبہا! کہ تم ہر پل ایک گم گشتہ سیارہ بنے رہنا چاہتی ہو، جسے ہر وقت کوئی کھو جتا رہے۔ خود سے مجال ہے، جو ایک لفظ بھی پھوٹ دو۔" وہ خجل سی ہوئی۔

پچھلے تین سال سے وہ دونوں بہترین سہیلیاں تھیں اور ایبہا اسے اتنا جان نہیں پائی تھی، جتنا حنا اسے سمجھ چکی تھی۔

"سمسٹر کی فیس کے لیے پریشان ہو؟" حنا نے یکلخت ہی اتنے تیقن سے پوچھا کہ وہ جو مصمم ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ کم از کم حنا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گی، چپ کی چپ رہ گئی۔ چند ثانیوں تک اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد

حنا نے لاپروائی سے کہا۔

"اچھا چھوڑو ان فضول اور فالتوں کے مسائل کو۔ چلو کینٹین میں چل کے گرما گرم سموسے کھاتے ہیں۔ ساتھ میں ٹھنڈی ٹھار بوتل۔" ایبہا نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا، پھر ناراضی سے بولی۔

"مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ میرے سر میں درد ہے۔"

"ہاں۔ فقط درد ہی درد ہے اس میں۔ دماغ تو ہے ہی نہیں سرے سے۔" حنا اب طنز پر اتر آئی تو اس کا دل گداز ہونے لگا۔

"گھر فون کیا تھا؟" حنا نے جیسے اس پر ترس کھا کر پوچھا۔

"ہوں۔"

"ہاں۔ کہہ تو رہے تھے کہ پیسے بھجوا دوں گا، مگر کل لاسٹ ڈیٹ ہے فیس جمع کرانے کی بلکہ ہاسٹل کے ڈیوز پے کرنے کی ڈیٹ تو گزر بھی چکی۔"

ایبہا کے لہجے میں محسوس کن تھکن تھی۔

"مجھے ایک بات تو بتاؤ یار! ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تمہارا یوں ہاسٹل میں رہنا بلکہ ان تین سالوں میں میں نے تمہیں کبھی کبھار ہی گھر جاتے دیکھا ہے، وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے اور بس....."

اور یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر ایبہا مراد کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ جو اس کا باپ ہونے کا دعوے دار تھا، وہ اسے فقط چند گھنٹے کے لیے ٹہلانے ہی لے جا سکتا ہے اور بس۔

وہ تو شکر تھا کہ چھٹیوں میں حنا گھر چلی جاتی تھی، ورنہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ ان دنوں بھی ایبہا یہیں ہوتی تھی۔ ہاسٹل ویران ہو جاتا۔ وہ تو اللہ مہربان تھا کہ ہاسٹل وارڈن کی رہائش وہیں پر تھی اور وہ اضافی کرایہ وصول کر کے ایبہا کو وہاں رہنے کی اجازت دے دیتی تھی۔

"تو کیا ہوا۔ تمہارا گھر بھی تو اسی شہر میں ہے۔ تم بھی تو ہاسٹل میں رہتی ہو۔" ایبہا نے فی الفور خود کو سنبھالا تھا۔ اپنے ماضی کو ننگا کر کے وہ خود کو بے پردہ نہیں کرنا چاہتی تھی اور پھر اس قدر غلیظ ماضی.....

"میرا مسئلہ اور ہے۔" حنا نے سر جھٹکا۔

"تو بس... میرا مسئلہ بھی اور ہی ہے۔ بتایا تو تھا تمہیں۔ سوتیلی ماں مجھے گھر میں قدم نہیں رکھنے دیتی۔" ایبہا نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا اور پھر فوراً ہی بیگ سنبھالتی اٹھ گئی۔

"اچھا چلو۔ آج کینٹین کا بل تمہارے ذمے۔ پیسے آئیں گے تو میں بھی تمہیں عیش کراؤں گی۔"

"کبھی تو مجھ پہ اعتبار کرو گی۔" حنا اسے جتاتے ہوئے اٹھی تھی۔ ایبہا لب بھینچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
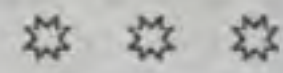
"امتیاز احمد! تم پوچھتے کیوں نہیں معیز سے۔ کیوں اتنا بدلتا جا رہا ہے وہ۔ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھو۔ کہیں کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں۔"

سفینہ نے لان میں بچھی میز پر چائے لا کر رکھتے ہی ڈرون حملہ کر دیا تھا۔ اخبار میں گم امتیاز احمد چونکے۔ بے اختیار اخبار بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کیسے شک ہوا؟"

"ایک تو یہ کہ وہ تمہارا بیٹا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کی خاموشی اور سنجیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ شادی کا نام لوں تو یوں بدکتا ہے جیسے کسی گناہ کا کام کہہ دیا ہو۔" طنز کرنے سے وہ باز نہ آئی تھیں۔ پھر اپنے خدشات بھی بتا دیے تو

انہوں نے گہری سانس بھری۔
"تم بھی نا سفینہ۔۔۔" انہوں نے تاسف سے بیوی کو دیکھا۔
"وہ باب تو کب کا بند ہو چکا بلکہ میں نے اپنے ہاتھوں بند کر دیا۔ دل کی مرضی سے تم سے شادی کی مگر تمہیں آج تک یقین نہیں آسکا۔"
"ہاں۔" سفینہ کی صاف گوئی میں ہٹ دھرمی کی جھلک تھی۔
"کیوں کہ مجھے کبھی لگا ہی نہیں کہ وہ باب مکمل طور پر بند ہوا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس تحریر کی جھلک مجھے دکھائی دے ہی جاتی ہے۔"
سفینہ کی بات پر انہوں نے گہری سانس بھر کے جیسے اندر کی کثافت کو کم کیا پھر اخبار لپیٹتے ہوئے میز پر رکھ دیا۔
"اس عمر میں لڑکے یونہی باتوں کو دل پہ لے لیتے ہیں۔ وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"
انہوں نے گول مول سا تبصرہ کیا مگر وہ سفینہ امتیاز تھیں۔ جنہوں نے گزرے پچیس برسوں میں ان کا ماضی نہیں بھلایا تھا۔ (اور نہ ہی انہیں بھولنے دیا تھا) تو اپنے لاڈلے بیٹے کے معاملے میں کیسے چوکتیں۔
"اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرے نا۔ پہلے بھی تو ایسے ہی کرتا تھا۔ مگر اب دو تین سالوں سے جیسے اپنے آپ میں سمٹ کے رہ گیا ہے۔"
"ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ۔۔۔" وہ محتاط سے انداز میں کہہ کر چائے پینے لگے۔ سفینہ نے تیز نظروں سے انہیں دیکھا۔
"یعنی کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟" امتیاز احمد گڑبڑا سے گئے۔
"یہ میں نے کب کہا۔ میں تو بر سبیل تذکرہ بات کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کوئی مسئلہ ہو اس کا۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" سفینہ ڈھیلی پڑ گئیں۔
"یونیورسٹی کے بعد چند گھنٹوں کے لیے تمہاری فیکٹری میں بھی تو بیٹھتا ہے کریدنے کی کوشش کرواسے۔"
"ہوں۔ صحیح کہہ رہی ہو۔" وہ فرماں برداری سے بولے۔
کیا کہتے۔۔۔ بیٹے کے گزرے سالوں کا ایک ایک پل وہ جانتے تھے۔ ان کی خواہش پر وہ خار زار پر چل پڑا تھا۔ اگر سفینہ جان جاتیں کہ باپ بیٹا کس بات کے ہم راز ہیں تو قیامت سے پہلے ہی شاید اس گھر میں قیامت آجاتی۔
زارا اور ایزد اندر سے کسی بات پہ الجھتے ہوئے چلے آرہے تھے ان دونوں کی توجہ بٹی۔
"ماما! دیکھ رہی ہیں اسے کتنا بگڑ رہا ہے یہ۔ آئندہ میں ابو کے ساتھ کالج جاؤں گی اور انہی کے ساتھ واپس آؤں گی یا پھر بھائی کے ساتھ۔"
وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھی۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جبکہ ایزد کے ہونٹوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔
امتیاز احمد بے اختیار مسکرا دیے۔
"کیوں بھئی۔ کیا معاملہ ہو گیا۔ ہماری چہچہاتی چڑیا اداس کیوں ہے؟ موسم تو بہت اچھا ہے آج پھر موڈ کیوں خراب ہے؟" انہوں نے پیار سے پوچھا تو سفینہ کے دل میں ہمیشہ کی طرح سکون سا بھرتا چلا گیا۔ امتیاز احمد کا اولاد سے محبت کرنا انہیں ہمیشہ اپنے پیروں کی مضبوطی کا احساس دلاتا تھا۔
"ہاں ہاں! پوچھیں اس سے۔ ایک تو اسے پک اینڈ ڈراپ کرو۔ دھوپ میں گھنٹوں کھڑے ہو کے اپنا رنگ جلاؤ اور اسے دیکھیں احسان فراموش۔" ایزد نے کباب اٹھایا۔
"تو کون کہتا ہے آ کے وہاں لڑکیوں کو تاڑنے کی ڈیوٹی سرانجام دو۔" زارا اتنکی۔
"دیکھا آپ نے۔ نیکی کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں ہے۔" وہ شاکی ہوا مگر اس کی نگاہوں اور انداز سے چھلکتی شرارت

واضح تھی۔
"میں باز آئی ایسی نیکی سے۔" زارا نے دونوں ہاتھ جوڑ کے ماتھے سے لگائے۔
"ایزد! کیوں تنگ کرتے ہو بہن کو۔" سفینہ نے پیار سے بیٹے کو گھر کا۔
"بھری دوپہر میں اپنے کالج سے اس کے کالج تک جاؤ۔ وہاں جلتی دھوپ میں کھڑے ہو کے اس کا انتظار کرو۔ بہن صاحبہ پھر بھی راضی نہیں۔" وہ اپنے کپ میں چائے نکالتا متاسف ہوا۔
"ہاں اور وہ بھی بتاؤ نا۔ جو مجھے آرڈر کر رکھا ہے کہ آدھے گھنٹے سے پہلے کالج گیٹ سے باہر نہ نکلوں۔" زارا تلملائی۔ پھر اس کی شکایت لگانے لگی۔
"درخت سے ٹیک لگا کے ہیرو کا پوز مارے کھڑا رہتا ہے' جب تک ساری لڑکیاں چلی نہیں جاتیں۔" امتیاز احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی جسے بیٹی کی ناراضی کے ڈر سے وہ چھپا گئے۔ البتہ سفینہ نے بیٹے کو گھر کا۔
"ایزد! کیا سن رہی ہوں میں؟"
"ظاہر ہے۔ جو آپ کی بیٹی بتائے گی وہی کچھ سنیں گی آپ۔ ہم مردوں کی اس گھر میں کم ہی چلتی ہے۔ کیوں ابو!" وہ بات کو کہیں کا کہیں لے گیا۔ امتیاز احمد ہنس دیے۔
"اب آپ ہی بتائیں ماما! اتنی گرمی میں اتنا فاصلہ طے کر کے روز اسے لینے جاتا ہوں' اب دھوپ میں جلنے کا کوئی فائدہ بھی تو ہو۔ چند حسین چہرے دیکھ کر فریش ہونے میں کوئی حرج ہے کیا؟" وہ ڈھٹائی سے بولا تو زارا روہانسی ہونے لگی۔
"دیکھ رہی ہیں آپ۔ کس قدر بے شرم ہے یہ۔ ذرا جو اپنے کرتوت چھپاتا ہو۔" وہ دونوں جڑواں تھے۔ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے مگر دوسرے ہی پل گہرے دوستوں کی مانند ہو جاتے۔

"باطل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا"

ایزد نے بڑے اسٹائل سے شعر پڑھا تھا۔
"اُف فوہ! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جاؤ زارا! بھائی کو بلا کے لاؤ۔ اتنے اچھے موسم میں بھی آ کے کمرے میں بند ہو گیا ہے۔" سفینہ نے بات سمیٹی۔
"وہ تو میں چلی ہی جاؤں گی۔" وہ جھٹکے سے اٹھی۔ پھر انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔
"مگر اس مسئلے کا حل مجھے چاہیے۔ دھوم مچی ہوئی ہے وہاں لڑکیوں میں کہ پتا نہیں یہ ہیرو لینے کس کو آتا ہے۔" ایزد کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
"تعریف کا شکریہ۔" وہ آداب بجالایا۔ زارا پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔
"کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔" سفینہ نے تنبیہی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔
"اسے شوق ہے تنگ ہونے کا۔ میری تعریفوں سے جیلس ہوتی ہے اور بس۔" وہ لاپروائی سے بولا اور اپنا کباب ختم کرنے لگا۔
زارا دروازہ کھٹکھٹا کر اجازت ملنے پر معیز کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ شیشے کے آگے کھڑا بال سنوار رہا تھا۔
"اتنے اچھے موسم میں آپ کمرے میں کیا کر رہے ہیں؟" زارا مسکرائی۔
"دیکھ تو لیا ہی ہے تم نے۔ اب کیا بتاؤں۔" وہ برش لہرا کر بولا۔
"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور میرا موڈ خراب۔" زارا نے منہ پھلایا۔ وہ برش رکھ کے پلٹا۔
"کیا ہوا۔ پھر کوئی نئی لڑائی؟" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی تو پورے جوش و خروش سے اسے

ایزد کی شکایت لگا رہی تھی۔ اسے زارا کے ساتھ آتے اور پوری توجہ سے بہن کی بات سن کر مسکراتے دیکھ کر سفینہ کا دل مطمئن ہوا۔ وہ معیز کے لیے کپ میں چائے نکالنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

زارا کے لیے ان دنوں ایک بہت اچھا پروپوزل زیر غور تھا۔ رات کے کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو یہی موضوع زیر بحث تھا۔
"میں تو ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ اچھی فیملی ہے۔ لڑکے کے متعلق بھی اچھی رپورٹ ہی ملی ہے۔" امتیاز احمد نے گویا اب گیند سفینہ کے کورٹ میں پھینک دی تو انہوں نے مدد طلب نظروں سے معیز کو دیکھا۔
"اچھے لوگ ہیں ماما! اور پھر سفیر کو تھوڑا بہت تو میں پہلے سے جانتا ہی ہوں۔ بڑی اچھی طبیعت کا بندہ ہے۔" گویا معیز بھی راضی تھا۔
"اور میری طرف سے تو ہاں ہی ہاں ہے۔" ایزد نے ہاتھ اٹھا کر رضامندی دی تو کچن میں برتن دھوتی زارا تلملائی۔
"اس کو تو میں پوچھوں گی۔ بڑا شوق ہے اسے میری شادی کروا کے اپنا راستہ کلیئر کروانے کا۔"
"ابھی تو پڑھ رہی ہے۔" وہ متذبذب تھیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتی تھیں اور بیٹی کی نوعمری کا خوف بھی لاحق تھا۔
"سال ہی تو رہ گیا ہے ماما! گریجویشن کمپلیٹ ہو جائے تب شادی کر دیجیے گا۔ فی الحال منگنی کی رسم کر لیں۔" معیز نے مشورہ دیا۔
"مسز ریاض تو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کو تیار ہیں بیٹا! سفیر کا ارادہ ہے فرانس جانے کا۔ ان کا خیال ہے کہ نکاح کر دیں ہم زارا کا۔"
سفینہ نے نئی بات بتائی تو لمحہ بھر کو سب چپ رہ گئے۔
"فرانس کیا کرنے جا رہا ہے؟" امتیاز احمد کو اچنبھا ہوا۔
"ان کا تو یہاں بہت اچھا بزنس چل رہا ہے۔ باپ ہے' تین اور بھائی بھی ہیں ساتھ۔"
"پتا نہیں۔ کوئی ریفریشر کورسز کے لیے جانا چاہتا ہے۔ وہاں ماموں ہوتے ہیں اس کے۔" سفینہ نے بتایا تو امتیاز احمد نے ہنکارہ بھرا۔ "ہوں۔"
"میری تو خواہش تھی کہ معیز اور زارا کی اکٹھی شادی کروں۔" سفینہ نے اچانک ہی اظہار کیا تھا۔ امتیاز احمد نے بے اختیار معیز کو دیکھا' جس کے تاثرات میں فوراً" ہی پتھریلا پن اترنے لگا تھا۔ اپنی بات کہہ کر سفینہ اب منتظر نگاہوں سے معیز کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ذرا سا جھنجلا گیا۔
"میرا یہاں کیا ذکر؟"
"حالانکہ ذکر تو میرا ہونا چاہیے۔ میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے وہ۔" ایزد نے منہ بسورا۔ مگر سفینہ شاید اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں۔
"کیوں کیا تم شادی نہیں کرو گے کبھی؟"
"فی الحال تو آپ زارا کی شادی پر فوکس کریں۔ میں نے اس معاملے میں ابھی کچھ نہیں سوچا۔" وہ ماں سے نظر چرا گیا تھا۔
"تو اب سوچ لو۔ دنوں میں لڑکی مل جائے گی میرے شہزادے بیٹے کے لیے۔" سفینہ مسکرائیں اور پیار سے

اسے دیکھا۔ امتیاز احمد کا دل گھبرا سا گیا۔

"صحیح کہہ رہا ہے یہ۔ تم زارا کے متعلق سوچو ابھی۔ اس کی کون سی عمر نکلتی جا رہی ہے۔ سوچ لینے دو اچھی طرح۔" امتیاز احمد جس طرح بعجلت بولے تھے ٗسفینہ کو تحیر نے گھیرا جبکہ باپ کی طرف اٹھنے والی معیز کی نگاہ میں شکوہ ٗ تاسف تھا۔ بڑی جتاتی ہوئی نگاہ تھی اس کی۔

"کمال ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زارا کے جانے کے بعد اس گھر میں ایک رونق آجائے اور آپ کو اس بات سے فرق ہی نہیں پڑتا کوئی۔" سفینہ ان سے الجھنے لگیں۔

"فوہ... ابھی تو یونیورسٹی چل رہی ہے اس کی۔ ٹھیک سے اپنے پاؤں پہ تو کھڑا ہو لینے دو۔" صاف لگ رہا تھا کہ امتیاز احمد ٗ معیز کی شادی کے حق میں نہیں ہیں۔

"ابھی بھی آپ کے ساتھ فیکٹری سنبھال رہا ہے۔ یہ شادی نہ کرنے کا مضبوط جواز نہیں ہے۔" سفینہ نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

"کم آن۔" یکلخت ہی معیز نے دونوں ہاتھ ٹیبل کی سطح پر مارے تو ایک خاموشی سی چھا گئی۔

"اس موضوع کو چھوڑ دیں آپ لوگ۔ میرا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" تلخی سے کہتا وہ وہاں سے اٹھ کے ہی چلا گیا تھا۔

"مائی گاڈ... " ایزد متحیر تھا۔ "نہیں کیا ہوا... اتنا غصہ؟"

اور پریشان تو سفینہ بھی کچھ کم نہ تھیں۔ معیز کا رویہ کچھ نفسیاتی سا لگنے لگا تھا اور یوں شادی کے نام سے بدکنا۔ ان کا دل ہول سا گیا اور ان سب سے سوا امتیاز احمد کسی اور ہی فکر میں تھے۔

"کہیں معیز شادی کے لیے راضی ہی نہ ہو جائے..." یہ سوچ ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

☼ ☼ ☼

حنا تیزی سے دروازہ کھول کے اندر آئی تو ایبہا کو انہی کپڑوں میں ملبوس نوٹس کے ساتھ سر کھپاتے دیکھ کر چلّا اٹھی۔

"تم ابھی تک یونہی سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی ہو۔" ایبہا ڈر سی گئی۔ مگر حنا کو دیکھا تو نگاہوں میں ستائش سی اتر آئی۔ وہ ابھی پارلر سے تیار ہو کے آئی تھی۔ نئے اسٹائل کی کٹنگ ٗ فیشل اور آئی بروز بنوانے سے اس کی شکل نکل آئی تھی۔

"میں کیا کروں گی وہاں جا کر حنا! تمہارا بھائی کہے گا ٗ کسے اٹھائی لائی ہے ساتھ۔" حنا کی خشمگیں نگاہوں کے جواب میں وہ گڑبڑا کر بولی۔ تو اس نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔

"وہ میرا بھائی ہے۔ تمہارا نہیں۔ اٹھو اور اب مزید ایک بھی لفظ کہے بغیر تیار ہو جاؤ۔"

اس نے ہاتھوں میں تھامے شاپنگ بیگز بستر پہ ڈھیر کیے۔

"اچھا۔ تمہارا برتھ ڈے ہے۔ ہوٹل میں جانے کی کیا تک بنتی ہے؟ گھر جا کے سیلیبریٹ کیوں نہیں کرتیں؟" ایبہا نے اپنی الجھن کو زبان دے ہی دی۔

"ہونہہ! وہاں ٹائم ہی کس کے پاس ہے میرے لیے۔ ممی کو اپنی پارٹیز سے فرصت ملے تو دوسروں کی پارٹیز شروع ہو جاتی ہیں اور پاپا تو ہیں ہی امریکا میں۔ ایسے میں خالی دیواروں سے جا کے سر پھوڑنے سے بہتر ہے کہ بھائی کے ساتھ چند لمحے خوشی کے بتا لوں۔"

حنا اداس ہونے لگی تو ایبہا کو افسوس ہوا کہ ایسے ہی اس موضوع کو چھیڑا جس کے متعلق وہ پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکی تھی۔

"اچھا۔ اس بار معاف کر دو اور اپنا گفٹ یہیں پہ وصول کر لو۔ اگلی بار لازمی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"خبردار!" حنا نے آنکھیں نکالیں۔ "جو تم نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کی تو۔"

"فوہ۔ میرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ پتا تو ہے تمہیں۔" ایبہا کشمکش کا شکار ہوئی۔

"وہ تو تم فکر ہی مت کرو۔ نہ صرف اپنی بلکہ تمہاری بھی شاپنگ کر کے لائی ہوں۔"

حنا نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کے شاپنگ بیگز الٹنے لگی تو بستر پہ دو جگمگاتے جوڑوں کے ساتھ جانے کیا کیا الم غلم بکھر گیا۔

ایبہا گہری سانس بھر کے رہ گئی کہ اب فرار کی کوئی صورت نہ بچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا۔ ویری گڈ! تمہاری صلاحیتوں کا میں یوں ہی تو معترف نہیں ہوں۔"

سفینہ بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو امتیاز احمد بڑے موڈ میں کسی کے ساتھ موبائل پر محو گفتگو تھے۔ ان پر نگاہ پڑی تو امتیاز احمد نے بات مختصر کر دی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ باقی باتیں مل کے طے کرتے ہیں۔ او کے۔ اللہ حافظ۔"

"کیوں فون بند کر دیا۔ میں کون سا آپ کی گفتگو میں خلل ڈالتی۔"

سفینہ اندر کی بے چینی کو دباتے ہوئے بولیں اور بیڈ کے کنارے ٹک گئیں۔

"ایک بہت بڑا کانٹریکٹ مل گیا ہے ہماری کمپنی کو۔ اس کے لیے لون بھی منظور ہو گیا ہے۔" وہ خوش تھے۔

"اچھا۔" سفینہ نے شکی انداز میں کہا۔ "میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی۔" امتیاز احمد ٹھٹکے۔ ان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"کیا بات ہے تمہاری سفینہ بیگم! نہ کبھی خود میرے دل میں اتریں اور نہ مجھے یہ موقع دیا تم نے۔ اتنے سالوں میں بھی نہیں جان پائیں مجھے؟"

ان کے انداز میں بہت عرصے کے بعد شکوہ در آیا۔ وگرنہ اس سے پہلے تو وہ نظر انداز ہی کر دیتے تھے ان کے ہر شک اور ہر کج ادائی کو۔

اور واقعی...

سفینہ نے ہمیشہ انہیں سطحی انداز سے پرکھا تھا ٗ کبھی اندر نہ اتر پائیں ٗ ابھی بھی وہ اسی تناظر میں بولیں۔

"دل... ؟ تمہارے پاس دل تھا ہی کب امتیاز احمد! میرے پاس تو تم بے دل آئے تھے۔ بے روح جذبوں کے ساتھ۔"

"کیا اس بات سے بھی انکار کرو گی کہ جب میں تمہارے پاس آیا تو اس وقت صرف تمہارا تھا؟" وہ بحث کم ہی کرتے تھے مگر اس وقت جیسے وہ بھی بحث پر اتر آئے۔

"صالحہ تمہاری منگیتر ہی نہیں ٗ بچپن کا پیار تھی امتیاز احمد! اور محبت کی راہ میں تم نہیں ٗ وہ کسی اور موڑ مڑ گئی تھی۔ تم تو تنہا شاہراہ محبت پہ چلتے ہی جا رہے تھے۔ ایسا عشق تھا تمہیں اس بے حیا سے۔ جس نے پتا نہیں کس کے ساتھ یاری لگالی۔" سفینہ اس ذکر پر سالوں بعد بھی اسی جذباتیت کا شکار تھیں ٗ جیسے آج ہی کی بات ہو۔

"سفینہ..."

ان کے انداز گفتگو نے امتیاز احمد کی رنگت لال کر دی۔ انہوں نے تنبیہی انداز میں سفینہ کو ٹوکا مگر وہ اپنے

مزاج کی مالکہ تھیں۔

"تو کیا جھوٹ ہے اس میں امتیاز احمد! کہو کیا اس نے کسی اور کی خاطر تمہیں ٹھکرا نہ دیا تھا؟ سگی چچا زاد تھی تمہاری مگر کیسی بد فطرت نکلی۔ سر سے پاؤں تک نیلو نیل کر دیا ماں باپ نے مگر اس کا چار دنوں کا عشق جیت گیا۔" وہ سلگتے لہجے میں ساری کہانی بیان کر رہی تھیں۔

"شادی سے انکار بہر حال میں نے کیا تھا۔ بلکہ اس کی شادی سے پہلے ہی میں نے تم سے شادی کر لی تھی۔" وہ تکلیف میں تھے۔ سفینہ بیگم یوں ہی نشتر ہاتھ میں لیے ان کے زخم کریدتی رہتی تھیں' کسی ماہر جراح کی طرح۔ جانتی تھیں زخم کو کہاں سے چھیڑنا ہے۔

"اس میں بھی تمہاری محبت بلکہ عشق کی خود غرضی شامل تھی۔ کیوں کہ تم جانتے تھے تمہارے چچا صالحہ کی وہاں شادی مر کے بھی نہ کرتے۔ تم نے اپنی محبت کی قربانی دے کر صالحہ کی محبت کامیاب کروا دی۔ تم سے مایوس ہو کر تمہارے چچا نے اسے بیاہ دیا اس کے عاشق کے ساتھ۔ اور زندگی بھر یوں قطع تعلق کیا کہ ماں باپ کی میتوں پر بھی نہ پہنچ پائی وہ۔"

وہ جیسے لطف لے رہی تھیں۔ صالحہ کی بے بسی کا' امتیاز احمد کی ناکام محبت کا۔

واقعی جب صالحہ اپنی محبت کے لیے ان کے سامنے تڑپی' بلکی تو انہوں نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ سفینہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ سفینہ ان کی خالہ زاد تھیں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دنوں میں سفینہ ان کی دلہن بنا دی گئیں۔ تب چچا نے بیٹی کی ضد اور جان دینے کی حد تک ہٹیلے پن کو دیکھتے ہوئے اس کی مراد صدیقی سے شادی کر کے اس سے ہر تعلق توڑ لیا۔

مگر یہ سب تو ماضی بعید تھا۔

ایسا ماضی جس کا دفن ہو جانا ہی بہتر تھا مگر سفینہ تو ان کے ماضی کو جیسے مسالے لگا کے 'ممی بنا کے' حنوط کر کے سنبھالے ہوئے تھیں۔

"بس کر دو سفینہ۔ اللہ کے لیے بس کر دو۔ مر چکی ہے وہ۔ اب تو اسے بخش دو۔" امتیاز احمد بے اختیار سے ہو گئے۔

"ہونہہ! زمانے میں کسی کو پتا نہ چلا اس کے مرنے کا۔ تم ہی سے سنا تھا میں نے۔ رابطہ تھا تب ہی پتا چلا نا تمہیں۔" وہ بے حد سفاک تھیں یا شاید دل سے انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ حسین مورت مر چکی ہے' جو کبھی امتیاز احمد کے دل کی ملکہ ہوا کرتی تھی۔

"ہاں۔ تھا رابطہ۔۔۔ مگر اب وہ کہیں نہیں ہے۔ یہ بات تم کیوں نہیں سمجھ لیتیں۔ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' یہ بات بھی تمہارے لیے قابل اطمینان نہیں؟" وہ پھٹ پڑے تو سفینہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہاں۔ نہیں ہے اور نہ ساری زندگی ہوگی۔ کیوں کہ اس نے ٹھکرایا تھا تمہیں' راستہ اس نے بدلا تھا' تم نے نہیں۔ تمہارے دل میں تو اس کے لیے محبت ہی محبت بھری تھی۔"

"بے کار کی بحث کر کے میرا سر دُکھا دیا ہے تم نے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ یہاں سے یا پھر میں ہی چلا جاتا ہوں۔" وہ بد دل سے ہو گئے۔

"رہنے دو۔ میں ہی چلی جاتی ہوں تمہاری تنہائی سے۔ تم تھوڑی دیر اور یادوں میں کھیل لو۔"

وہ جاتے جاتے بھی طنز کرنے سے باز نہ آئی تھیں۔ امتیاز احمد نے گہری سانس بھر کے اندر کی کثافت کم کرنے کی سعی کی۔ پھر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

"بیا۔۔۔ وارڈن کو یہی کہنا کہ تمہاری کسی دوست کے ہاں پارٹی ہے۔ کیوں کہ میں نے اسے یہی بتایا ہے۔" حنا تیار ہونے کے بعد بولی تو سینڈل پہنتی ابیہا بدکی۔

"کیا مطلب۔۔۔ جھوٹ بول کے اجازت لی ہے تم نے باہر جانے کے لیے؟"

"سو واٹ۔ وہ خبیث وارڈن نکلنے کہاں دیتی ہے ویسے۔ اتنی مشکلوں سے تو مارکیٹ تک جانے دیا تھا اس نے۔ ایکچوئلی میں تو ہاسٹل سے باہر جاتی رہتی ہوں نا' اس لیے مجھے اجازت دیتے ہوئے اسے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے لیے تو اس نے فوراً" ہی اجازت دے دی تھی۔" حنا نے مجبوری بیان کی مگر وہ تذبذب کا شکار تھی۔

"مگر وارڈن کو پتا چل گیا تو؟ میرا یہاں کون ہے' جس کا بہانہ کر کے کہیں جاؤں میں۔"

"اُف۔ بلاوجہ جتایا تمہیں۔ ارے یار! کہا نا کسی دوست کا ہی بہانہ بنایا ہے۔ چلو اب شام ہو رہی ہے۔ واپسی پر دیر ہوئی تو وارڈن کچا چبا جائے گی ہمیں۔"

"ہاں چلو۔۔۔" وہ دل سے اس کے ساتھ جانے کو راضی نہ تھی مگر ایک ہی دوست تھی' اسے ناراض ہونے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

حنا نے تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ بالکل سادہ سے حلیے میں رہنے والی ابیہا نے قیمتی لباس تو پہن لیا تھا' مگر میک اپ کی کسی شے کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا' مگر اس سادگی میں بھی وہ جگمگا رہی تھی جبکہ اس کے برعکس حنا نے اچھی خاصی تیاری کر رکھی تھی۔ اسے حنا کے ساتھ جاتے دیکھ کر وارڈن کی نگاہوں میں ناگواری سی اتر آئی۔ ابیہا کا دل لرزنے لگا۔

"تم نے اسے کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی ہو۔" حنا نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے سرگوشی میں بتایا۔ باہر آ کے ابیہا نے ناراضی سے اپنا بازو چھڑایا۔

"انسان ایسا کام کرے ہی کیوں' جس میں جھوٹ بولنا پڑے۔ اگر تمہارا بھائی خود آ کے تمہیں ہاسٹل سے لے جاتا تو ہم دونوں ہی گناہ گار نہ ہوتیں۔"

"اچھا بی بی مومنہ۔ آئندہ ایسا ہی کروں گی۔" حنا نے فوراً" ہی بات سمیٹ دی۔ مین روڈ سے انہیں رکشا مل گیا تو کسی ریسٹورنٹ کا نام بتا کر حنا جلدی سے اندر بیٹھ گئی۔ جبکہ ابیہا نے بڑی بے دلی سے اندر قدم رکھا۔

وہ اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی' مگر ہائے ری دوستی۔۔۔ یہ وہ بھی کام کروا لیا کرتی ہے جو کوئی دوسرا کہے تو ہم صفا چٹ انکار کر دیں۔ ابیہا سوچ رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں ایک بہترین ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھیں۔ ابیہا نروس ہونے لگی۔

"یہاں جائیں گے ہم؟"

"ہاں۔ تو؟" حنا نے جیسے اس کی پریشانی سے لطف لیا۔

"حنا پلیز! مجھے ان جگہوں کے مینرز کا ذرا نہیں پتا' بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ دروازہ اندر کی طرف کھلے گا یا باہر کی طرف۔"

"تم چلو تو۔ دروازہ میں کھول دوں گی تمہارے لیے۔" حنا بڑی پراعتماد تھی۔ کیونکہ جس کلاس سے اس کا تعلق تھا وہاں ہوٹلنگ عام سی بات تھی' مگر ابیہا تو اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ہوٹل دیکھنے والی تھی۔

حنا کا ہاتھ تھامے وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح اندر داخل ہوئی تو اے سی کے خنک ماحول نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ ڈھیر سارے لوگ' باتوں کی بھنبھناہٹ' برتنوں کا شور' تیز رفتاری سے آتے جاتے ویٹرز۔

ایبہا کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔
یہ تو کوئی اور ہی دنیا تھی۔ غموں سے دور بے فکر۔
"تم آن بیا! بی کانفیڈنٹ۔ کیا جاہلوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہو۔ ایسی جگہوں پر یوں ظاہر کرنا چاہیے جیسے کتنی ہی دفعہ آچکے ہوں۔"
حنا متلاشی نظروں سے ہال میں دیکھتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھی۔ پھر اس کو لیے ایک کارنر کی ٹیبل کی طرف چل دی۔
اونچا لمبا' مناسب شکل و صورت کا وہ شخص حنا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھا اور والہانہ انداز میں اسے ملا۔ اس نے گلے سے لگتے ہوئے حنا کے رخسار پہ پیار کیا تھا۔
"کیسی ہو۔" وہ یوں ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے پوچھ رہا تھا۔ ایبہا کا دل عجیب سا ہونے لگا۔
بہن بھائی کی ایسی بے باک بے تکلفی شاید حنا کی کلاس کا ہی حصہ تھی۔
حنا اس سے الگ ہو کر پلٹی اور ایبہا کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ کر لیا۔
"یہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ ایبہا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا فون پہ۔" حنا اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ جبکہ مقابل کی گہری نگاہوں نے لمحہ بھر میں ہی ایبہا کو سرتاپا پسینے میں شرابور کر دیا۔ اس کا شدت سے وہاں سے غائب ہو جانے کو جی چاہا۔
"نائس ٹو میٹ یو۔"
اس نے ایبہا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی رنگت اڑ گئی۔ اس نے بے اختیار خود کو حنا کی اوٹ میں کر لیا۔
"کم آن سیفی۔" حنا نے بے تکلفی سے اپنے بھائی کے شانے پہ ہاتھ مارا۔
"یہ ہماری کلاس کے رویوں کی عادی نہیں ہے۔" کہتے ہوئے اس نے ایبہا کو کرسی پر بٹھایا۔
"آئی سی۔" وہ اب بھی ایبہا کے دہکتے روپ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر حنا کو دیکھ کر معنی خیزی سے بولا۔
"خیر۔ حسن کی ہر خطا معاف ہوتی ہے۔" حنا ہنستی ہوئی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔
"بڑی دیر لگا دی آنے میں۔ میں تو کب سے آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا تمہاری راہ میں۔" وہ حنا کو والہانہ نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔
جانے بہن بھائی کی ملاقات کتنے لمبے عرصے کے بعد ہو رہی تھی۔ ایبہا کو عجیب سا محسوس ہوا۔ حنا ہلکے سے کھنکھار کے بولی۔
"ایبہا کو منانے میں ٹائم لگ گیا۔ میں نے کہا میری برتھ ڈے پر میری دوست ہی ساتھ نہ ہو تو کیا مزہ۔ مگر تمہاری موجودگی کی وجہ سے یہ جھجک رہی تھی۔ میں نے کہا میرا بھائی' تمہارا بھائی۔" حنا کے انداز میں ہلکی سی شرارت تھی مگر سیفی جیسے بدک اٹھا۔
"بھائی۔۔۔؟" حنا نے بے اختیار سیفی کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے دبایا۔
"جی میرے بھائی۔" وہ جیسے تنبیہی انداز میں بولی تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔
"لعنت ہے یار! بندہ کم از کم لفظ تو سوچ سمجھ کے نکالے منہ سے۔" حنا زور سے ہنسی۔
"تمہیں زیادہ اعتراض کس پر ہے۔ میرے بھائی ہونے پر یا ایبہا کے؟"
"شٹ اپ۔" وہ قدرے برہم سا ہوا۔
"اچھا۔ چلو سوری۔۔۔ اور اب جلدی سے آرڈر دو۔ وارڈن نے صرف ایک گھنٹے کا ٹائم دیا ہے۔" حنا نے فوراً

ہی بات کے ساتھ موڈ بھی بدل لیا۔

"حنا! واپس چلیں۔" ایبہا کا دل ہنوز کسی نے مٹھی میں لیا ہوا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ ماحول اس کی تربیت اور اقدار سے میل نہیں کھاتا۔

"بور کر دیا نا میری فرینڈ کو۔" حنا نے سیفی کو گھورا پھر ایبہا کو پیار سے دیکھ کر بولی۔

"آئم سوری یار! اسی لیے تو تمہیں کہتی ہوں کہ اپنی دقیانوسیت کی چادر کو اتار پھینکو۔ ہر جگہ آیا جایا کرو تب ہی کانفیڈینس آئے گا تمہارے اندر۔"

ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے کر وہ دونوں مدھم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے تو ایبہا کو اپنی موجودگی غیر ضروری لگنے لگی۔ وہ دھیان بٹانے کے لیے ڈائننگ ہال میں نظریں دوڑانے لگی۔ جہاں ہر چہرے پر رونق اور بے فکری تھی۔ اور یہ دونوں ایسی چیزیں تھیں جن کا ایبہا کی زندگی میں فقدان تھا۔ وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔

ہر کوئی اپنی فیملی اپنے فرینڈز کے ساتھ مگن تھا۔ یوں جیسے کبھی کوئی دکھ انہیں چھو کر نہ گزرا ہو۔ کرسی گھسیٹنے کی آواز پر ایبہا بے اختیار چونکی۔ اس نے سیفی اور حنا کو کھڑے ہوتے دیکھا۔

"کھانا آنے میں تھوڑی دیر لگے گی بیا! تم ذرا بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔" حنا نے عام سے انداز میں کہا مگر اس کی رنگت اڑ گئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"یہ بڑا خبیث ہے۔ میرا گفٹ کمرے میں ہی بھول آیا ہے اور اب اکیلے لانے پہ راضی بھی نہیں۔ جا کے دیکھوں تو سہی ایسا کون سا نادر و نایاب گفٹ ہے۔ بس میری جان! میں دو منٹ میں آئی۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی تو سیفی کی موجودگی میں ایبہا کوئی اعتراض بھی نہ کر سکی مگر اسے بہت عجیب سا لگا۔

جن نے اسی شہر میں گھر ہوتے ہوئے بھی ہاسٹل میں پناہ لے رکھی تھی تو بھائی کون سا کم تھا۔ اس نے ہوٹل میں کمرا لے رکھا تھا۔ وہ گہری سانس بھرتی پھر سے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔

ذرا دیر کے بعد ویٹر آ کے برتن سیٹ کرنے لگا۔

ایبہا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر حنا کی واپسی کے کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے۔

اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اپنا موبائل ہاسٹل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ ورنہ کم از کم حنا کو کال ہی کر لیتی۔ تقریباً "بیس منٹ کے بعد وہ دونوں بڑے فریش اور اچھے موڈ میں واپس آئے۔ اس دوران ایبہا کئی دفعہ حنا کے ساتھ آئندہ نہ آنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ حنا نے ایک ہی نظر میں اس کا بگڑا موڈ بھانپ لیا۔

"آئم سوری یار! پاپا کی کال آ گئی تھی سیفی کے موبائل پہ۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔ سو سوری۔" وہ جھک کر ایبہا کے گال پہ پیار کرتے ہوئے بولی تو اسے موڈ ٹھیک کرنا ہی پڑا۔

"اتنا کچھ رکھ گیا ہے ویٹر۔ ان کا وقت تو بہت اچھے سے گزر سکتا تھا۔" سیفی کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ گہری تھی۔

"یہ دیکھو... ڈائمنڈ رنگ اور بریسلٹ گفٹ کیا ہے سیفی نے مجھے۔" حنا اسے دکھا رہی تھی۔ ایبہا نے سرسری نگاہ ڈالی مگر واپسی پر وہ حنا سے الجھ پڑی۔

"یہ دونوں چیزیں اتنی وزنی تھیں کہ تمہارا بھائی اٹھا کر لا نہ سکا کمرے سے۔" حنا دل کھول کے ہنسی۔

"کچھ تحفے لینے کے لیے مقابل کی ہر بات ماننی پڑتی ہے میری جان!" ایبہا اس کی ڈھٹائی پر کڑھتی رکشے سے باہر دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼
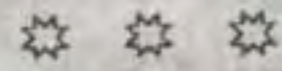
سب کی رضامندی کے ساتھ سفیر کا رشتہ زارا کے لیے منظور کر لیا گیا تھا۔ ان دنوں سفینہ کا موڈ اور مزاج قدرے بہتر تھا۔ جانے صالحہ کے مرنے کی خبر پہ یقین آ گیا تھا یا پھر بیٹی کا بہترین جگہ رشتہ لگ جانے کی خوشی تھی۔

چونکہ ان لوگوں کا ارادہ نکاح کرنے کا تھا، اس لیے شاپنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ابھی بھی وہ زارا کے ساتھ اس کے سسرال والوں کے لیے شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔

"اف!" زارا نے شاپنگ بیگز صوفے پہ ڈھیر کیے اور خود بھی وہیں گر سی گئی۔

"اس سے پہلے شاپنگ کرنے میں اتنی تھکاوٹ کبھی نہیں ہوئی مجھے۔" زارا ماں کی طرح کچھ زیادہ ہی نزاکت پسند تھی۔ بلکہ اس پر شاید ماں کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا۔

"اس سے پہلے تمہاری بات بھی تو طے نہیں ہوئی سسٹر!" ایزد نہا دھو کے فریش سا جملہ کستا ٹی وی کے آگے جم کے بیٹھ گیا۔

"ماما! اب ایزی کیا کرے گا؟" زارا نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے سفینہ سے پوچھا تو ایزد ماں سے پہلے ہی بولا۔

"میں تمہاری شادی کے بعد ایزی فیل کروں گا اور کیا۔"

"جی نہیں۔ ٹوئنز ہو، ہر کام میں شروع سے میری نقالی کرتے آئے ہو۔ میں تو ڈرتی تھی کہیں اب تم بھی نکاح کے لیے شور نہ مچا دو۔" وہ شرارت سے بولی۔

"ارے واہ۔" ایزد کو بھی جیسے دھیان آیا۔

"مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ کچھ سوچیں ماما! کہیں سے کوئی لڑکی بر آمد کریں۔" وہ جیسے بے تاب ہوا شادی کرنے کو۔ سفینہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ایسے تھوڑی بوجھ کی طرح سر سے اتار دوں گی۔ میں تو اپنے بیٹوں کے لیے چاند سی دلہنیں لاؤں گی۔ دنیا دیکھے گی جیسے چاند کو دیکھتی ہے۔"

"چاند جیسی... یعنی گڑھے پڑے ہوں گے چہرے پہ؟" اس نے چہرے پر صدماتی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا تو سفینہ کو ہنسی آ گئی۔

"بے وقوف! مثال دے رہی تھی۔" پھر انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ "جب تک معیز کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک تم اپنے بارے میں سوچنا بھی مت۔"

"لو۔ اب ان ہی کے بارے میں سوچتا رہوں گا تو میرے بارے میں کون سوچے گا۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

"تمہارا میں خود سوچ لوں گی۔" انہوں نے مسکراہٹ دبائی۔

"میرا تو خیال تھا کہ اس بلی کے ساتھ ہی بھائی کی نیا بھی پار لگا دیتیں۔ کم از کم میرا راستہ تو صاف ہو جاتا۔ پھر میں جب جی چاہے اپنے بارے میں سوچ لیتا۔" وہ یونہی باتیں بگھار رہا تھا۔

"وہ مانے بھی تو نا۔ ایسے بدکتا ہے شادی کے نام سے جیسے کوئی خطا کرنے کو کہہ دیا ہو۔" سفینہ واقعی معیز کے رویے سے پریشان تھیں۔

"آپ کہیں تو میں پتا لگاؤں، موصوف کہیں دل ول نہ لگا بیٹھے ہوں کسی غریب سی لڑکی سے۔ اور اب اس ڈر سے آپ کو نہ بتا رہے ہوں کہ کہیں آپ اسے ریجیکٹ نہ کر دیں۔" اس نے لمحوں میں کہانی بنا لی تھی۔ سفینہ نے اسے گھورا۔

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔"

"لو جی۔" وہ ہنسا۔ "ہر ماں کا یہی ڈائیلاگ ہوتا ہے۔ تو جو ایسا کرتے ہیں وہ پتا نہیں پیڑوں پہ اُگتے ہیں شاید۔"
اس کی بات پہ سفینہ کے ساتھ زارا بھی ہنسی تھی۔ باہر کی طرف جاتے معیز کو سفینہ نے آواز دے کے بلا لیا۔
"جی ماما؟"
"کہاں جا رہے ہو؟"
"یوں ہی۔ دوستوں کی طرف۔" وہ مختصراً بولا مگر سفینہ شاید تفصیلی بات کے موڈ میں تھیں۔
"اپنے بہن بھائی کی فرمائش سنی تم نے... یہ کہہ رہے ہیں کہ زارا کے ساتھ ہی تمہاری بھی شادی ہو جانی چاہیے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"جیسا چل رہا ہے چلنے دیں۔ فی الحال میں شادی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں ماما!" وہ بڑی بے زاری سے کہہ کر ایکسکیوز کرتا چلا گیا۔
"واہ واہ!... کیا نخرے ہیں بھئی۔" ایزد نے متاثر ہو کر سر دھنا۔ پھر شکایتاً بولا۔
"یہ اب موڈ پہ چلیں گے اور ادھر ہم ارادہ باندھے بیٹھے ہیں اور کسی کو پروا نہیں۔"
"شٹ اپ ایزد! ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ بھائی کے رویے کو دیکھو۔ یہ نارمل نہیں ہے۔ پہلے ہمارے ساتھ ہر ہلے گلے میں شامل ہوتے تھے، موج مستی، سیر و تفریح... اور اب انہوں نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بنالی ہے۔ یونیورسٹی، آفس اور گھر کے علاوہ بس دوستوں کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔ ہمارے لیے تو جیسے وقت ہی نہیں ان کے پاس۔" زارا جذباتی ہونے لگی۔
"وہ بڑے ہو گئے ہیں اب۔" ایزد نے اسے پچکارا۔
"وہ پہلے بھی ہم سے بڑے ہی تھے۔ کوئی نئے نئے بڑے نہیں ہوئے۔" وہ چڑ کر بولی۔
"خیر۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس موضوع پر معیز سے کھل کے بات کروں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟" سفینہ نے کہا۔
"اور اگر ان کی ڈیمانڈ آپ کے لیے قابل قبول نہ ہوئی تو؟" ایزد نے ماں کا امتحان لیا۔ وہ اسے ٹالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو گئیں۔
"وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے اس سے بات تو کرنے دو۔ دیکھتے ہیں پٹاری میں سے کیا نکلتا ہے۔"
"سانپ ہی نکلے گا ماما! سپیرا تو نکلنے سے رہا۔" ایزد کی زبان پھر پھسلی تو وہ ہنس دیں۔ زارا اپنی شاپنگ سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

سفینہ نے یہی موضوع امتیاز احمد کے سامنے چھیڑا تو وہ بے ساختہ بولے۔
"تو اس میں غلط کیا ہے۔ جب موڈ ہو گا، کر لے گا۔" سفینہ ان کے جواب پر لحہ بھر کو انہیں دیکھ کر رہ گئیں پھر بولیں۔
"کیا دماغ ملتا ہے باپ بیٹے کا۔ ایسے فیصلے موڈ کے پابند نہیں ہوا کرتے امتیاز احمد!"
"اُفوہ۔ میرا مطلب تھا اسے سوچنے کے لیے وقت دو۔" انہوں نے گڑبڑا کر کہا۔
"اس کا کام صرف رضامندی شو کرنا ہے۔ لڑکی میں خود تلاش کروں گی اپنے بیٹے کے لیے... اعلا خاندان کی۔" سفینہ نے تفاخر سے کہا تو امتیاز احمد نے بے اختیار پہلو بدلا۔
"اتنی جلدی کس بات کی ہے تمہیں۔ پہلے خیریت سے زارا کا نکاح ہو جانے دو۔ پھر سوچتے ہیں اس بارے میں بھی۔" سفینہ نے انہیں گھورا۔

"کمال ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تم میرا ساتھ دو گے، مگر تم تو اسی کی زبان بول رہے ہو۔"
"حقیقت ہے سفینہ! کہ ہم معیز کی رضامندی کے بغیر اس کی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کچھ عرصہ صبر کرو۔ ہو سکتا ہے ابھی واقعی وہ شادی نہ کرنا چاہتا ہو۔ پڑھ رہا ہے وہ ابھی۔"
"لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اس کا۔ اس کے بعد فل ٹائم فیکٹری سنبھالے گا۔ تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے وہ اسکول میں پڑھ رہا ہے۔" وہ بدمزہ ہو کر بولیں۔
تو ان کی کج بحثی سے واقفیت کی بنا پر امتیاز احمد نے بہتر سمجھا کہ اپنا پہلو بچا جائیں۔ ویسے بھی معیز خود ہی شادی کے لیے راضی نہیں تھا۔ وہ اس کی حمایت نہ بھی کرتے تو یہ معاملہ سر چڑھنے والا نہیں تھا۔
"چلو ٹھیک ہے۔ تم جو مناسب سمجھتی ہو وہ کر لو۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔"
"وہ مانے تب نا۔" سفینہ جھنجلائیں۔
"تو پھر فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔" ان کے اطمینان کو سفینہ نے شکی نظروں سے دیکھا، مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ امتیاز احمد کے آفس میں بیٹھا تھا۔ ان کی بات سن کے اچھل ہی تو پڑا۔
"کیا کہہ رہے آپ ابو! اس کو زارا کے نکاح میں انوائٹ کریں گے؟" بے یقینی سے زیادہ ناگواری اس کے لہجے سے ہویدا تھی۔
"تو؟" امتیاز احمد نے استفہامیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔
"جائز اور شرعی رشتہ ہے اس کا سب سے۔"
"آپ اپنے لفظوں سے پھر رہے ہیں۔ شادی کے وقت آپ نے کہا تھا کہ اس کا ہمارے گھر اور اس کے مکینوں سے کوئی رشتہ نہ ہو گا۔" معیز نے بھنچے ہوئے لہجے میں کہا۔
"بہت سے فیصلے وقت اور حالات کو دیکھ کر کرنے پڑتے ہیں معیز! اور اس وقت حالات کا تقاضا یہی ہے کہ میں اسے تنہا نہ چھوڑوں۔ جو ذمہ داری میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کے اپنے شانوں پہ لی تھی، اُسے نبھاؤں۔"
وہ بے حد سنجیدہ تھے۔ معیز نے اپنی چیخنے کی خواہش پر بہت مشکل سے قابو پایا تھا۔ خود کو بدقّت تمام سنبھال کر وہ تلخی سے بولا۔
"اور ماما... وہ جو قیامت مچائیں گی، اس کا کچھ سوچا ہے آپ نے؟"
"اگر تم میرا ساتھ دو گے تو میں اسے سنبھال لوں گا معیز!" انہوں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ معیز نے فی الفور قطعیت سے انکار کر دیا۔
"ہرگز نہیں ابو! میں پہلے ہی آپ کا بہت ساتھ دے چکا ہوں، مگر اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ آپ اسے گھر بلائیں گے تو اپنی ذمہ داری پر۔ ماما کے سامنے آپ کو کھڑا ہونا پڑے گا۔"
"تم صرف اس کے ساتھ اپنے رشتے کا تعین کر لو معیز! باقی کام میرا ہے۔" معیز نے تاسف سے باپ کو دیکھا۔ پھر خفیف سے غصے بھرے لہجے میں کہا۔
"اس کا ہر رشتہ صرف آپ سے ہے ابو! میں نے تو فقط ایک مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دیا تھا۔ آپ کا بھرم رکھا تھا اور بس۔"

"اور بس...؟" نہیں اس کے لفظوں نے تکلیف دی تھی۔

"جی اور بس۔ دیٹس اوور اینڈ آل۔" وہ تلخی سے کہتا پھر وہاں رکا نہیں تھا۔ اٹھا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

امتیاز احمد نے بے اختیار اپنے دل کو مسلا۔ جہاں وہ ہلکا سا درد محسوس کر رہے تھے۔

"جانے میں یہ ذمہ داری نبھا پاؤں گا یا نہیں؟"

☼ ☼ ☼
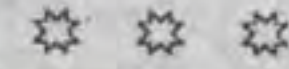
زارا کے نکاح کی تقریب شہر کے بہترین میرج ہال میں منعقد ہوئی۔ سفیر اور زارا کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج معیز کا موڈ بھی بہت اچھا تھا۔ بہت عرصے کے بعد وہ سب کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ ایسے میں کتنی ہی بار اس نے خود کو کسی کی نگاہوں کے حصار اور کسی کی توجہ کا مرکز پایا۔

وہ رباب تھی۔ زارا کی نند۔ بے حد ماڈرن اور بولڈ۔ ایک ایسی لڑکی جسے اپنی خوب صورتی کا پوری طرح احساس تھا۔ اور اسی احساس نے اسے اتنا اعتماد دیا تھا کہ جب معیز سفینہ کے پاس کھڑا تھا تو وہ خود آکر سفینہ سے بولی۔

"دیکھ رہی ہیں آنٹی! یہ ویلیو ہے لڑکے والوں کی۔ یہاں تو ہمیں کوئی لفٹ ہی نہیں کروا رہا۔" بڑا ناز بھرا شکوہ تھا۔ نگاہ غلط لاپروا بنے کھڑے معیز پر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" سفینہ کی پریشانی فطری تھی۔

"بھئی کوئی کمپنی ہی نہیں دے رہا ہمیں یہاں۔ بور ہو گئی میں تو۔ ایک ایزد سے دوستی ہوئی تھی، مگر آج تو وہ بھی اسٹیج پہ بیٹھا پوز دے رہا ہے۔" اس نے منہ بسورا تو سفینہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ انہوں نے معیز کا بازو تھام کر کہا۔

"تو چلو اب معیز سے دوستی کر لو۔ یہ بھی بہت اچھی کمپنی دیتا ہے۔" سفینہ جیسے اسے معیز کے حوالے کر کے ایکسکیوز کرتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی ٹھہری گئی۔

"آپ اپنی زبان دکھائیں گے؟" رباب نے اچانک فرمائش کی تو معیز حیران ہوا۔

"جی۔ وہ کیوں؟"

"تھینک گاڈ! دراصل میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بے زبان مرد نہیں دیکھا تھا۔ مگر آپ تو اچھا خاصا بول لیتے ہیں۔" وہ شرارت سے بولی تو وہ بے ساختہ ہی ہنسا بڑے عرصے کے بعد... مگر اسے اپنا ہنسنا خود ہی کچھ اتنا عجیب لگا کہ فوراً" ہی ہونٹ سمیٹ لیے۔

"ہائے... آئی ایم رباب۔" اس نے جیسے نئے سرے سے تعارف کراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا جسے تھام کر وہ اسی سنجیدگی سے بولا، جو اس کا خاصہ بن چکی تھی۔

"مجھے معیز احمد کہتے ہیں۔"

"تو معیز احمد صاحب! آپ کو اچھا لگ رہا ہے یہ آپ جناب اور بناوٹی تکلفات؟" وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ معیز نے شانے اچکائے۔

"تمہاری مرضی۔ تم جیسے جی چاہے بات کرو۔ میں نے تمہیں ادب و آداب کا آرڈر نہیں دیا۔"

"شکریہ۔" وہ سر جھکا کر ممنونیت سے بولی۔

"معیز یار! تمہاری گاڑی کسی کی گاڑی کے پیچھے کھڑی ہے پارکنگ میں۔ جاکے دیکھو۔ انہوں نے گاڑی نکالنی ہے اپنی۔"

معیز کے کزن نے آکر پیغام رسانی کی تو رباب نے بد مزہ ہو کر اسے دیکھا۔ معیز ایکسکیوز کرتا ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ رباب کی ستائشی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ پارکنگ ایریا میں آکر معیز نے اپنی گاڑی نکالی تو آگے والی گاڑی کو نکلنے کا راستہ ملا۔

وہ دوبارہ اپنی گاڑی پارک کر کے اندر کی طرف بڑھا۔

"ایکسکیوز می۔" ایک نسوانی آواز نے بعجلت اسے پکارا تو وہ ٹھٹک کر پلٹا۔ سیاہ چادر میں ملفوف وجود۔ معیز کو شک ہوا۔ کیا اس نے مجھے ہی پکارا ہے؟

"جی! فرمائیے؟" سیاہ چادر کا پردہ رخ سے تھوڑا سا ہٹا تو معیز کی نگاہ لحہ بھر کو ٹھٹک سی گئی۔

"وہ... یہاں کوئی شادی کا فنکشن ہے؟" وہ گھبرائی سٹپٹائی سی لڑکی تھی۔

"کس کی شادی پہ انوائیٹڈ ہیں آپ؟" معیز نے استفسار کیا۔

"جی۔ وہ دراصل شادی... نکاح تھا شاید۔ امتیاز احمد صاحب کی بیٹی کا۔"

اس کی پیشانی چمک اٹھی تھی۔ معیز بڑے زور سے چونکا۔ اس کی خاموشی پر وہ گھبرا سی گئی۔

"میں ان کے ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔ اس نے مجھے باہر ڈراپ کیا ہے۔" معیز کے تن بدن میں شرارہ سا دوڑ گیا۔

"کون ہو تم؟"

"جی... میں... ایبہا۔" وہ اس کے بدلتے انداز سے خوف زدہ سی ہو کر بولی تو معیز لحہ بھر کو لڑکھڑا سا گیا۔ جس قیامت کا وہ سوچنا بھی نہ چاہتا تھا آج وہ اس کی دہلیز پہ آن کھڑی ہوئی تھی۔

اسے اندر ہال میں سب کے ہنستے مسکراتے مطمئن چہرے نظر آئے اور اگر یہ فتنہ اندر چلا گیا تو کیا فساد مچے گا کیسی جگ ہنسائی ہو گی اور ماما... وہ تو قیامت اٹھا دیں گی۔

معیز کی رگوں میں لاوا دوڑنے لگا۔

اس نے بے اختیار آگے بڑھ کے ایبہا کا بازو ہاتھ میں جکڑ کر غراتے ہوئے کہا۔

"میں امتیاز احمد کا بیٹا ہوں۔ جانتی تو ہو گی تم مجھے۔ معیز احمد نام ہے میرا اور میں تمہیں اپنے ہنستے بستے گھر کو تباہ کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ ابو نے تم سے جو رشتہ جوڑا ہے، اس میں ان کا ساتھ دینا میری مجبوری تھا، مگر تمہاری وجہ سے میری ماں کا سکون برباد ہو، یہ مجھے قطعاً" قبول نہیں۔ آئی بات سمجھ میں۔"

معیز نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تو اس کی چادر سرک کر شانوں پر ڈھلک گئی۔ معیز کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے اس کا تعارف اس پر پہاڑ بن کے گرا ہو۔ معیز نے اسے خفیف سا دھکیلا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے اور بھول جاؤ کہ کسی کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ گیٹ آؤٹ۔"

وہ نفرت بھرے لہجے میں کہتا لمبے ڈگ بھرتا اندر کی طرف بڑھا اور جیب سے موبائل نکال کر امتیاز احمد کے ڈرائیور کو کال ملائی۔

"حبیب خان! باہر پارکنگ میں ابھی جس لڑکی کو ڈراپ کیا ہے اسے واپس وہیں چھوڑ آؤ، جہاں سے لائے تھے۔" وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

موبائل آف کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے معیز احمد نے خود کو عجیب سی وحشت کا شکار ہوتے محسوس کیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اس شام احمد رضا جب گھر پہنچے تو حسب معمول بے حد تھکے ہوئے تھے۔ ایک تو چلچلاتی' آگ برساتی ہوئی' بدن کو جھلساتی ہوئی دھوپ' گرم ہواؤں کے تھپیڑے اِس پر کنسٹرکشن سائٹ پر حسب معمول مزدوروں کے ساتھ سارا دن کی مغز ماری۔ نڈھال سے احمد رضا اس یقین کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے کہ ہاجرہ کو دیکھتے ہی ان کے دن بھر کی تھکن راحت میں بدل جائے گی۔ وہ ان کی آنکھوں کا نور اور کلیجے کی ٹھنڈک جو تھی۔۔۔ اور آج تو ویسے بھی اس نے ان سے شام جلدی گھر آنے کی تاکید کی تھی' حالانکہ وہ ایسا کبھی نہیں کرتی تھی۔

احمد رضا پیشے کے اعتبار سے ٹھیکے دار تھے اور گھروں کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔ کئی مزدور ان کی زیر نگرانی رزق کماتے تھے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ احمد رضا دولت میں کھیل رہے ہوتے' لیکن واجبی سی دنیاوی تعلیم رکھنے والے احمد رضا دل میں دینی علم کا سمندر رکھتے تھے۔ چنانچہ کوئی ایسا کام کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے' جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریحاً "نافرمانی" کے زمرے میں آئے۔ وہ بے حد فرض شناس اور ایمان دار تھے۔ کسی دوسرے کی وجہ سے خود ان کا کتنا ہی نقصان ہوجائے' لیکن کسی دوسرے کی تکلیف یا پریشانی کا سبب ان کی اپنی ذات بنے' یہ انہیں گوارا نہیں تھا اور ایسی صفات کے ساتھ ان کے گھر میں بے شک مال و دولت کا انبار نہیں تھا' لیکن دلوں میں راحت اور زندگی میں سکون وافر تھا۔ ان کی نوکری مقررہ گھنٹوں والی نہیں تھی۔ بعض دفعہ وہ صبح فجر کی نماز ادا کرکے گھر سے نکلتے اور رات گئے گھر میں گھستے۔

دوسرے گھر والوں کی طرح خود ہاجرہ کو بھی احمد رضا کی اس مشقت بھری زندگی کا احساس تھا۔ اس کے باوجود آج جلدی گھر آنے کی تاکید نما فرمائش ہاجرہ نے ان سے کی تھی کیونکہ آج زندگی میں پہلی بار وہ اپنی گڑیا کی شادی کررہی تھی اور ہاجرہ کی کسی فرمائش کو کیسے ٹالا جائے؟ یہ احمد رضا کو آتا ہی نہیں تھا۔

وہ ان کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ تین بیٹوں کی پیدائش کے بعد نہ جانے کتنی دعاؤں' منتوں اور مرادوں کے طفیل اللہ نے انہیں اس من موہنی گڑیا سے نوازا تھا۔ کون سا پیر فقیر اور درویش تھا جس سے انہوں نے دعا نہیں کروائی تھی' وہ جن بڑے چھوٹے علاقوں میں کام کرتے رہے تھے وہاں کی مساجد سے لے کر اپنے محلے کی مسجد کے پیش امام اور دیگر نمازی تک ان کی اس خواہش سے واقف تھے۔ دوست احباب' رشتے دار' بہن بھائی یہاں تک کہ ان کی شریک حیات یاسمین بھی بیٹی کے لیے ان کی تڑپ پر ان کا مذاق اڑاتے تھے اور حیرت کا اظہار بھی کرتے تھے کیونکہ وہ جس معاشرے میں رہتے تھے وہاں بیٹی کی پیدائش "قسمت" تصور کی جاتی تھی "خواہش" نہیں۔ سب کو بیٹوں کی چاہ ہوتی تھی۔ ان ہی کی پیدائش پر شادیانے بجتے تھے' مٹھائیاں تقسیم ہوتی تھیں۔ احمد رضا بعض دفعہ ان کی حیرت پر مسکرا دیتے لیکن زیادہ تر وہ خاموشی پر ہی اکتفا کیے رکھتے۔ صرف ایک بار یاسمین کی بات کا انہوں نے کچھ برا مانا تھا۔

"احمد صاحب! دنیا سے نرالی خواہش پالے بیٹھے ہیں آپ۔ لوگ تو بیٹوں کی دعائیں کرتے ہیں تاکہ ان کا بازو بنیں' باپ کے کندھوں پر سے ذمے داریوں کے بوجھ کو کم کرسکیں اور ایک آپ ہیں۔۔۔ اللہ نے تین تین بیٹے دیے ہیں' بن مانگے کیسے جھولی بھری ہے اللہ نے اور بیٹی۔۔۔ بیٹی کیا ہوتی ہے احمد صاحب! نرا بوجھ' پالو پوسو' لکھاؤ پڑھاؤ اور اگلوں کے گھر رخصت کردو۔

اس پر بھی سو طرح کے دھڑکے' خوف اندیشے۔۔۔ بیٹی لاکھ اچھی ہو مگر والدین کی زندگی کا سب سے بڑا سمجھوتا ہوتی ہے اس معاشرے میں جہاں ہم رہتے ہیں۔"

"یاسمین! میرے آقا سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے' بیٹی رحمت ہوتی ہے والدین پر اللہ کی۔ جنت کا دروازہ کھولتی ہے بیٹی اور تم کہتی ہو بیٹی کی خواہش دنیا سے نرالی ہے۔ اری نیک بخت! جنت کے دروازے کی خواہش کرنا دیوانگی ہے کیا؟" احمد رضا کے لب کپکپانے لگے تھے۔ "میں تو اللہ سے اپنی خوش بختی مانگتا ہوں' کیا اللہ سے اس کی رحمت نہیں مانگنا

چاہیے؟"
پھر یاسمین کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔
اس دن کے بعد سے انہوں نے احمد رضا کی جنون بنتی ہوئی خواہش پر کوئی رائے نہیں دی تھی بلکہ وہ خود بھی نمازوں میں اللہ سے بیٹی کی دعا کرنے لگی تھیں۔ یاسمین کو بہرحال اس بات کا احساس ہو ہی گیا تھا کہ بیٹے لاکھ بہت نیک' فرماں بردار تھے' لیکن وہ جو گھر میں ایک مخصوص ملاحت' نرمی اور رونق ہوتی ہے' جو بیٹی کے دم سے ہوتی ہے' وہ ان کے گھر میں نہیں تھی۔
اور پھر اللہ نے ہاجرہ کی صورت میں احمد رضا کی دعائیں قبول کرلی تھیں۔ یاسمین موہنی صورت گلابی پلکوں اور رخساروں والی اس ننھی کلی کو پاکر بے حد مسرور تھیں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ اللہ نے انہیں ایک سہیلی سے نوازا ہے۔ تینوں بیٹے بھی ننھی پری کو "پہلے میں لوں گا" "نہیں پہلے مجھے دو" کے مقابلے میں پیش پیش تھے اور احمد رضا۔۔۔
احمد رضا کی اس روز بار بار آنکھیں نم ہوتی رہی تھیں۔ کیسی راحت سی راحت تھی' جو اس معصوم کو گود میں لینے پر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بن کر پھوٹی تھی۔ کیسی شفقت سی شفقت تھی' جو اسے سینے سے لگاتے ہی ان کے دل سے دھڑکنیں چیرتی ہوئی نکلی تھی۔ اس دن کوئی احمد رضا سے پوچھتا کہ دونوں جہانوں کا خزانہ کسے کہتے ہیں تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے بازوؤں میں سوئی ہوئی ننھی منی سی ہاجرہ کو آگے کردیتے۔
اور آج گھر میں قدم رکھتے ہوئے وہی ہاجرہ تھی' جو انہیں روتی ہوئی نظر آئی تھی۔ ان کی لاڈلی بیٹی۔۔۔ وہ بیٹی جو لاڈ پیار سے ہرگز نہیں بگڑی تھی۔ سات برس کی عمر سے وہ یاسمین کا گھرداری میں ہاتھ بٹا رہی تھی بھائیوں کو بھی جیسے اس نے باندھ لیا تھا۔ ایسی حساس اور ذہین۔۔۔ بعض دفعہ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ احمد رضا کی ہاجرہ۔۔۔ ایک سات برس کی بچی اور اتنی مدبر اور سمجھ دار۔۔۔ ہر چیز کو شدت سے محسوس کرنے والی۔۔۔ ہر بات کا عمیق گہرائی سے جائزہ لینے والی۔۔۔ ماں کو ہر وقت کسی مشین کی طرح گھر کے کام دھندوں میں مصروف دیکھا تو بنا کسی کے کہے' یاسمین کے منع کرنے کے باوجود ان کی مددگار بن گئی۔
بھائی زیادہ تر گھر سے باہر رہتے تھے۔ کبھی تعلیم کے سلسلے میں تو کبھی یاری دوستی۔ لہٰذا ہر قسم کے احساس ذمے داری سے عاری' انہیں گھر کے اندر بھی مصروف کردیا کہ کم از کم وہ اپنے ذاتی نوعیت کے کام خود کرنے لگے تھے۔ وہ خود بھی تو بھائیوں کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ان کے امتحانات ہوتے یا وہ کبھی بیمار پڑتے تو ساری ساری رات ان کے ساتھ جاگتی' انہیں وقت بے وقت بھوک ستاتی تو کچھ نہ کچھ بنا کرلے آتی۔ بھائیوں کا بھی یہی خیال تھا' اپنے جیب خرچ سے اس کے لیے ہر شام کچھ نہ کچھ کھانے کو لے آتے یا کھلانے لے جاتے' اس کی کتابیں لیے چلے آتے۔ وہ جیسے کوئی سپر پاور بن گئی تھی۔ خود اپنی تعلیم سے بھی اسے عشق تھا کیونکہ یہ باپ کی خواہش تھی کہ وہ خوب پڑھے لکھے۔ سات برس کی عمر میں اس کا یہ عالم تھا' اب تو خیر سے وہ چودہ برس کی ہوگئی تھی' لیکن احمد رضا کے گھر آتے ہی وہ اب بھی سب کچھ بھول کر باپ کو "پیاری" ہو جاتی تھی۔۔۔ کبھی ان کے پیر دباتی تو کبھی سر۔ احمد رضا جتنے بھی تھکے ہوئے گھر آتے' ہاجرہ کی ہلکی سی مسکراہٹ ان کی ساری تکان ایک لمحے میں ختم کردیتی تھی۔۔۔ لیکن آج۔۔۔ ہاجرہ کو روتا دیکھنا اور اس بری طرح روتا دیکھنا۔۔۔ کیسا لگا تھا انہیں۔۔۔؟
وہ یہ توقع لیے گھر میں داخل ہوئے تھے کہ گھر میں خوب رونق لگی ہوگی۔ ہاجرہ بہت مسرور اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوگی۔ ڈھولک پر مہندی کے گیت گائے جا رہے ہوں گے۔۔۔ مگر۔۔۔ بہت محبت سے پاس بیٹھ کر وجہ دریافت کی لیکن ہاجرہ کی سسکیاں رکنے میں ہی نہ آرہی تھیں۔ یاسمین الگ پریشان بیٹھی تھیں۔ دوپہر سے سمجھا سمجھا کر ہار گئی تھیں۔ تینوں بھائی' جو کچھ دیر قبل ہی اکیڈمی سے گھر آئے تھے الگ گم صم کیفیت میں اسے روتے دیکھ رہے تھے۔
احمد رضا پوچھ پوچھ ہارے مگر جب ہاجرہ نے کچھ بتا کر نہیں دیا تو یاسمین کو مختصر ترین الفاظ میں سارا ماجرا سنانا پڑا۔ احمد رضا پہلے تو کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہے' پھر یکدم ان کا قہقہہ بلند ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی تینوں بھائیوں کی بھی دبی دبی ہنسی گونج اٹھی۔ یاسمین بھی مسکرانے لگیں۔ صرف وہی تھی' جو آنکھوں میں آنسو لیے شاکی نظروں سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ باپ سے مخاطب ہوئی۔
"مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی ابو۔۔۔ مجھے تو یقین تھا کہ آپ۔۔۔" آنسوؤں کا گولہ یکدم حلق میں پھنسا تھا اور بات ادھوری چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی اور احمد رضا کے قہقہے کا گلا ایک لمحے میں گھٹ گیا تھا۔۔۔ کیا نہیں تھا اس کے مختصر سے جملے میں۔۔۔ یہ ناممکن ہی تھا کہ احمد رضا' ہاجرہ کی بات کا متن نہ سمجھ پاتے۔ اس یقین۔۔۔ اس اندھے بھروسے کو نہ محسوس کرپاتے' جو ایک بیٹی کو ایک باپ پر ہوتا ہے۔ ہاجرہ کو کیسے یہ مان نہ ہوتا کہ اس پر جان دینے والا باپ اس کے ایک مسئلے کو جو خود اس کی اپنی نظر میں ہرگز معمولی نہیں تھا' چٹکی بجا کر ختم نہیں کرسکتا۔
چند ہی لمحوں بعد احمد رضا اپنے تیسرے بیٹے کو ساتھ لے کر گھر سے نکل گئے تھے۔ یاسمین نے بے حد تاسف سے شوہر کو باہر جاتے دیکھا تھا' جس نے گھر آکر ابھی پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا۔ یاسمین اٹھ کر ہاجرہ کے پاس چلی آئیں۔
"بہت بری بات ہے ہاجرہ۔ دن بھر کا تھکا ہارا باپ گھر آیا اور تو نے اپنا رونا ڈال دیا۔ اب وہ بنا کچھ کھائے پیے نکل گیا ہے بازار کی خاک چھاننے۔۔۔ ہے کوئی تک۔"
"امی! ابو کو دیکھ کر مجھے وہ تذلیل پھر سے یاد آگئی تھی۔" اس کے جواب نے یاسمین کو چپ لگا دی تھی۔ اس کی باتیں تو یوں بھی ان کے سر کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ آج بھی اس کی منطق ان کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ اب پچھتا رہی تھیں کہ انہیں ہاجرہ کے اس "گڑیا کی شادی" کے شوق کو پورا کرنے کی اجازت دینی ہی نہیں چاہیے تھی۔ دوپہر سے گھر کا ماحول سوگوار تھا اس شادی کے معاملے پر۔
ہاجرہ کو جہاں یہ ملال ستانے لگا تھا کہ ناحق باپ کو پریشان کیا' وہاں یہ اطمینان بھی تھا کہ باپ اب اس کا مسئلہ حل کرکے ہی لوٹے گا۔
ہاجرہ کی سہیلی نے محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ آکر اس کی گڑیا سے اپنے گڈے کی شادی سے انکار کردیا تھا کیونکہ ہاجرہ اپنی گڑیا کو اپنی سہیلی کی حسب منشا جہیز نہیں دے سکتی تھی۔ اب اسے جہاں سے جہیز ملنے کی امید تھی وہ اپنے گڈے کی شادی وہاں کررہی تھی۔ اس نے اپنی کمر پر ہاتھ ٹکا کر بالکل کسی بڑی عورت کی طرح ہاجرہ کو باتیں بھی سنائی تھیں۔ اسے اتنا رنج اس کی باتوں' شادی سے انکار اور جہیز کی فرمائش سے نہیں ہوا تھا' جتنا غصہ اور تکلیف اسے اس کی اس بات پر ہوئی تھی کہ "ویسے تو تم اپنے ابو کی اتنی لاڈلی ہو مگر تمہارے ابو بیٹی کی گڑیا کا معمولی سا جہیز بھی نہیں دے سکتے۔" اسی وقت ہاجرہ نے ارادہ باندھ لیا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو منہ توڑ جواب دے گی۔ بات اس کے باپ کی عزت پر آگئی تھی اور ہاجرہ کو اپنے باپ کی ذات پر آنے والا حرف کسی طور پر برداشت نہیں تھا۔
قصور ان بچیوں کا بھی نہیں تھا۔ ہوش سنبھالنے پر اپنے آس پاس اپنے گھروں میں انہوں نے شادی بیاہ کے حوالے سے جو مسئلے مسائل اور جس قسم کی باتیں سنی تھیں' وہی باتیں اسی انداز میں انہوں نے ہاجرہ کو بھی سنادی تھیں۔ رہ گئے بڑے۔۔۔ تو بڑوں کو بھی اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی باتوں' رویوں اور خواہشوں سے چھوٹے اور معصوم ذہنوں پر کس طرح منفی اثرات ڈال رہے ہیں۔
ڈیڑھ گھنٹے بعد احمد رضا گھر واپس آئے۔ اس دوران وہ ایک ہی جگہ بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی تھی۔ جس وقت وہ گھر کی دہلیز عبور کرکے اندر داخل ہو رہے تھے' اس نے ان کے چہرے پر چھائی تھکن اور پریشانی کو نہیں دیکھا تھا' وہ ان کے دائیں ہاتھ میں موجود شاپر

کو دیکھ رہی تھی۔ یکدم چمکدار ہنسی اس کے ہونٹوں پر آگئی تھی' وہ دوڑ کر ان کے پاس گئی۔ اسے خوش اور ہنستا ہوا دیکھ کر احمد رضا کا طویل مشقت بھرا دن ڈھل گیا تھا۔

اگلے چند دنوں تک احمد رضا منتظر ہی رہے کہ گھر میں ہاجرہ کی گڑیا کی شادی کے حوالے سے دوبارہ کوئی رونق میلہ لگے' لیکن ایسا پھر کچھ نہ ہوا۔ اس روز احمد رضا کو ہاجرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

مگر چند سالوں بعد انہیں اس کی ساری باتیں سمجھ میں آگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼
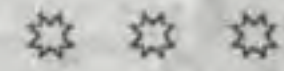
آنگن میں شام اتر آئی تھی۔ چند مہینوں سے گھر میں جو رونقیں اور چہلیں تھیں' وہ جیسے چراغ کی مدھم لو ثابت ہوئی تھیں' جسے ہلکی سی پھونک نے بجھا دیا ہو۔ یاسمین ماتھے پہ دوپٹا باندھے صحن میں تخت پر بیٹھی مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں۔ بار بار امڈ آنے والی نمی صاف کر رہی تھیں مگر قرار... قرار آکر نہیں دے رہا تھا۔ تیسرے نمبر والا بیٹا پاس بیٹھا تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں کی حالت پر بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے وہ الفاظ بھی نہیں مل رہے تھے' جو اس کی ماں کے لیے تسلی اور تشفی کا باعث بن جاتے۔ گھر کی فضا میں خاموشی' اداسی' ویرانی اور وحشت گھلی ہوئی تھی' وہ اسے بھی ختم نہیں کر سکتا تھا۔

آس پڑوس کے لوگ' دور و قریب کے رشتے داروں میں سے "فردا" فردا" لوگ وقفے وقفے سے آرہے تھے اور یاسمین کا کلیجہ اپنے سوالوں کے تیروں سے گھائل کرتے جارہے تھے۔ یاسمین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوگوں کی زبانوں میں اگ آنے والے کانٹوں اور نگاہوں میں در آنے والے تجسس نما تمسخر کو کس طرح برداشت کریں؟ اور جس کی وجہ سے یہ وقت آیا تھا ان پر' وہ وجود اپنے کمرے میں بند تھا...

کیسا عذاب سا عذاب تھا' جو ان پر آیا تھا۔ یہ ان میں سے کسی نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے گھر پر جو قیامت ٹوٹے گی' وہ کسی اور کے نہیں' ہاجرہ کے طفیل ٹوٹے گی۔

بڑی بہو پورے دنوں سے تھی۔ اس کی حالت الگ خراب تھی' اس پر گھر میں آنے والا یہ طوفان۔ بڑا اور منجھلا بیٹا گھر میں ٹک ہی نہیں رہے تھے' نہ جانے گھر سے باہر کس چیز کی تلاش تھی انہیں؟ کیا مل جانا تھا ان کو؟ یاسمین کو سب سے زیادہ ڈر بھی ان ہی دونوں سے تھا' دونوں غصے کے تیز تھے اور پھر مردوں میں اتنا حوصلہ کہاں ہوتا ہے کہ اپنے گھر کی کسی عورت کا ذکر سر عام سن سکیں... دفعتا" انہیں احمد رضا کا خیال آیا تھا۔ چھوٹے بیٹے کو چھت پر دوڑایا' جا کر اپنے ابو کی تو خبر لو... بستر سے ہی لگ گئے ہیں۔ چھوٹا بیٹا سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔ یاسمین ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھنے لگی تھیں کہ سب سے بڑی نند کی آمد ہوئی۔ یاسمین نے گہری سانس لی اور کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا کہ بوڑھی ہو گئی تھیں مگر آج تک سسرال کے دل میں اپنے لیے گنجائش پیدا نہیں کروا سکی تھیں' جس عداوت اور عناد کا بیج ان کی مرحومہ ساس نے بویا تھا' اس کی جڑیں ان کی اولاد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ نند صاحبہ نے آتے ہی پہلے تو جی بھر کے بین ڈالے... خوب سر پیٹا... اتنا روئیں دھاڑیں کہ ان کا واویلا سن کر احمد رضا بہ نفس نفیس نیچے چلے آئے۔

"ارے کیسی مصیبت سر پہ آن پڑی میرے بچے کے۔" لاڈلے بھائی کو دیکھا تو جذبات میں مزید شدت آگئی۔ احمد رضا سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ یوں بھی اب ان کا سر کبھی نہیں اٹھنا تھا۔

"کہاں ہے وہ آفت کی پرکالہ... کروں تو میں اس کا دماغ درست۔" اب توپوں کا رخ ہاجرہ کی جانب تھا۔

"دیکھ لیا احمد رضا! لاڈ پیار کا انجام... اسی دن کے ڈر سے تمہیں سمجھاتے تھے کہ نہ چڑھاؤ بیٹی کو اتنا سر... ایسی لاڈوں پلی ہی عزت کو بٹا لگاتی ہیں۔ اوپر سے کالج تک پڑھایا... یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے اس موئی انگریزی تعلیم کا۔" فرد جرم تھے کہ بڑھتے ہی جارہے تھے۔

"کیسا صاف انکار کر دیا شادی سے... وہ بھی مایوں بیٹھنے سے دو دن پہلے۔ غضب خدا کا ایسی جرات... ایسی دیدہ دلیری... ہمارے خاندان میں کسی لڑکی تو چھوڑ غیر خاندان کے کسی لڑکے کی بھی ایسی بے شرمی نہ دیکھی نہ سنی... توبہ توبہ۔" انہوں نے کلے پیٹے۔

"جس ڈھٹائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے کیا ہے' میں پوچھتی ہوں کہ باپ دادا کے سر میں خاک ڈال کر اب کس کونے کھدرے میں چھپی بیٹھی ہے۔ جس یار نے اتنی ہمت دلائی' وہ اب سامنے کیوں نہیں آتا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپا؟" احمد رضا ان کے آخری جملے پر تڑپ سے گئے۔

"کیا غلط کہہ رہی ہوں میں۔ جوان جہان لڑکی میں اتنی جرات کب آتی ہے بھلا؟ تب ہی نا جب کسی نے اسے سبز باغ دکھائے ہوتے ہیں۔" وہ چمک کر بولیں۔

"کالج جاتی تھی یہ کیسے ناممکن ہے کہ اس کا کہیں نین مٹکا نہ چل پڑا ہو۔" احمد رضا نے مدد طلب نظروں سے یاسمین کو دیکھا' جو خود نگاہیں چرا رہی تھیں۔

"پھر بھی آپا..." احمد رضا نے کمزور سے لہجے میں بیٹی کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ سب میں نہیں کہہ رہی احمد رضا... یہ باتیں ساری دنیا کر رہی ہے' بلکہ اس سے بھی زیادہ گری ہوئی باتیں' گندے اندازے... اور لوگوں کو ایسا موقع دیا کس نے ہے؟ لڑکی جب اپنے سسرال والوں کے سامنے عین مایوں سے دو دن پہلے شادی سے صاف انکار کرے گی تو لوگ تو ایسی باتیں کریں گے ہی۔" انہوں نے وضاحت کی تھی یا توجیہہ احمد رضا فیصلہ نہیں کر سکے۔

"جو کچھ بھی کہنا ہے مجھ سے کہیں' ابو سے بات نہ کریں۔" یکدم ایک پاٹ دار آواز آئی۔ یاسمین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ احمد رضا کی بڑی بہن بھونچکی رہ گئی تھیں۔ احمد رضا نے البتہ سر نہیں اٹھایا تھا۔ وہ یاسمین سے مخاطب ہوئے۔

"اس سے کہو کہ اندر جائے۔ بہت برداشت کر رہا ہوں۔ نہ آزمائے یہ میرے صبر و حوصلے کو اتنا کہ جسے کبھی پھول کی پنکھڑیوں سے نہیں چھوا' آج اس پر ہاتھ اٹھاؤں۔" کپکپاتی آواز' بھیگا لہجہ "زندہ در گور تو کر ہی دیا ہے اس نے مجھے اور اب..." وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔

"ابو... خدارا ایسا مت کہیں... ایسا مت سوچیں۔"

"کیوں نہ کہے ایسا؟ جس باپ کی تجھ جیسی بے دید اور نامراد بیٹی ہوگی' وہ تو پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر لٹک جائے گا۔" احمد رضا کی بڑی بہن نے مزید گل افشانی کی۔

"باپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا بیٹی نہیں ڈالتی... یہ کام دنیا والے کرتے ہیں اور کر رہے ہیں... بیٹی تو باپ کو ذلت اور مجبوری کی صلیب پر چڑھنے سے بچا رہی ہے۔" بے حد چبھتے ہوئے لہجے میں اس نے جواب دیا۔

"ابو! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے آپ کو زندہ در گور ہونے سے بچانے کے لیے انکار کیا تھا' اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ یہ بات اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ باپ اس کی شکل تک نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے ہرگز کسی بات سے تکلیف نہیں ہو رہی تھی... نہ ہمدردی کی آڑ میں اپنے تجسس کی تسکین کرنے آنے والے لوگوں پر... نہ ان کے سوالوں پر اور نہ ہی ان کے اندازوں پر اور نہ ہی آن کی آن میں اپنی ذات کے متنازعہ بن جانے اور معتوب ٹھہرائے جانے پر...

دو دن ہو گئے تھے اسے اپنے کمرے میں بند ہوئے۔ ہر وقت واری صدقے جاتی ماں' جان نچھاور کرنے والے بھائی' بڑی بہن جیسی بھابھی اور سر پر کسی تاج کی طرح سجا کر پھرنے والے باپ میں سے کسی نے اس کے کمرے میں جھانک کر تک نہیں دیکھا تھا۔ ابتدائی لعن طعن کرنے کے بعد کوئی اس سے مخاطب نہیں ہو رہا تھا۔ ہر آئے گئے کے سوالوں' باتوں اور حیرت انگیز فقروں کو وہ سن رہی تھی۔ نظریں

جھکا کر۔ نیچی آواز میں اپنی ماں اور بھائیوں کے وضاحتی جملے بھی اس کے کانوں میں پڑتے رہے تھے۔ اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے بھی وہ جانتی تھی کہ وہ سب شرمندہ ہیں بلکہ شرمندگی' ذلت' رسوائی تو بہت ہی معمولی الفاظ تھے اس ایک چیز کے لیے جو وہ سب محسوس کررہے تھے اور جس کا سبب اس کی اپنی ذات تھی۔

جس لڑکی نے مایوں بیٹھنے سے محض دو دن پہلے اپنے سسرال والوں کے سامنے دوٹوک اور بے لچک انداز میں شادی سے انکار کردیا ہو' جہیز کا وہ سامان بھی واپس منگوالیا ہو' جو اس کے باپ اور بھائی چار دن پہلے ہی اس کے سسرال چھوڑ کر آئے ہو۔ اس لڑکی کی دماغی حالت اور کردار کے بارے میں چہ مگوئیاں کیسے نہ ہوتیں؟ اس کے باوجود وہ بے حد مطمئن تھی۔۔۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔" ہر بار وہ خود کو یہی کہہ کر دلاسا دیتی رہی تھی۔

"تم نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔۔۔ تم میری اولاد ہو۔۔۔ وہ اولاد جس سے عشق کیا تھا میں نے۔۔۔ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا تھا' مگر تم۔۔۔ تم ویسی بیٹی نہیں ہو۔۔۔ دل نہیں دکھایا ہاجرہ تم نے۔۔۔ دل دکھا ہوتا تو یہ سب نہ کہتا۔۔۔ تم ۔۔۔ تم نے تو مجھے۔۔۔" آنسوؤں سے روتے ہوئے احمد رضا کہہ رہے تھے۔

"میں تو تمہیں بددعا بھی نہیں دے سکتا۔ صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ اس سے کہو' اپنے ماں باپ کو بھیجے۔۔۔ میں اس سے تمہاری شادی جلد از جلد کردینا چاہتا ہوں۔" چند ہی لمحوں میں احمد رضا نے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنی بہن کے ایک "امکان" پر نہ صرف غور کرلیا تھا بلکہ اسے "حقیقت" بھی تسلیم کرلیا تھا۔

ہاجرہ بے یقینی سے باپ کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ کبھی ماں بھی اولاد کو بے یارو مددگار چھوڑتی ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار یہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی پھپھو کو دیکھا' جو بے حد جتلاتی ہوئی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

وہ ذہین تھی۔۔۔ بے حد ذہین۔۔۔ اور اسے بہت ہی خوش فہمیاں بھی تھیں۔ اسے یہ گمان بھی تھے کہ وہ "انسان" تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے کی پوری صلاحیت اور اہلیت رکھنے والی انسان۔۔۔ اسے یہ گمان دلایا بھی کس نے تھا؟ والدین اور بھائیوں نے۔۔۔ اسے ایک مضبوط اور پراعتماد انسان والدین نے ہی بنایا تھا' ان کی پرورش نے۔۔۔ پھر شخصیت سازی میں جو کمی بیشی رہ گئی تھی' وہ تعلیم نے پوری کردی تھی۔ اسے شعور دیا تھا۔۔۔ لیکن ایک لمحہ۔۔۔ محض ایک لمحہ لگا تھا اور اس کی ساری خوش فہمیاں ختم ہوگئی تھیں۔

اس ایک لمحے نے اس پر منکشف کیا تھا کہ وہ "انسان" نہیں' ایک "لڑکی" ہی' جسے بہرحال اس معاشرے میں فیصلے کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا بس یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں ہونے والے فیصلوں پر صرف سر جھکائے اور نیک' پارسا اور پاکیزہ ہونے کا ثبوت دے۔ چاہے دنیا والے اسی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اسے کسی بازار کی کسی دکان میں سجا کوئی شوپیس سمجھ کر اس کے بارے میں مول تول کریں۔ بولیاں لگائیں مگر وہ کسی کو ایسا اختیار دینے پر تیار نہیں تھی۔ اس ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کیا تھا اور اب۔۔۔ اب بات ایک بار پھر باپ کی عزت کی آگئی تھی۔

"پھپھو! آپ کو اپنے بھائی اور خاندان کی خاک ہوتی عزت کا بہت خیال ہے نا؟" اس نے اپنے چہرے پر پھیلی نمی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ لہجہ بلا کا صاف اور کاٹ دار تھا۔ "تو پھر اب اس عزت کو بحال بھی آپ ہی کریں۔"

پھپھو استعجابیہ نظروں سے اسے گھورنے لگیں۔ یاسمین نے یکدم اپنا دل تھاما' وہ اب کیا کرنے والی تھی۔

"میرے لیے رشتہ آپ ڈھونڈیں۔۔۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔۔۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرسکیں تو پھر میرے باپ کو تماشا بنانے بھی مت آئیے گا۔" وہ کہہ

کر نہایت اطمینان سے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھپھو ہکا بکا "سر پھری" کو جاتے دیکھتی رہیں۔ یاسمین کی شرمندگی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور احمد رضا۔ احمد رضا نے ان دو دنوں میں پہلی بار اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی' وہ جانتے تھے' لیکن وہ کیا چاہتی ہے۔ یہ شاید وہ کبھی سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔

☼ ☼ ☼

احمد رضا پنڈال میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان بیٹھے تھے' کھانا کھایا جا رہا تھا۔ پچاس باون کے قریب مرد مہمانوں کے درمیان بیٹھے احمد رضا بے حد مطمئن تھے۔ چند مہینوں سے وہ جن دھڑکوں' واہموں اور اندیشوں کے ساتھ پل پل مرتے جیتے کی سی کیفیت میں مبتلا تھے' وہ نکاح خواں کے نکاح پڑھاتے ہی ختم ہو گئے تھے۔ چند مہینوں سے ان کے جان پہچان' رشتے دار اور محلے والوں نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا اور جن کے بارے میں ہاجرہ نے ان سے کہا تھا۔

"ابو! لوگوں کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے' یا یوں کہہ لیں کہ لوگوں کو چٹخاروں کے لیے ہر دوسرے دن ایک نیا قصہ چاہیے ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی کہ ان کے ڈر سے انسان اپنی زندگی عذاب میں ڈال لے۔"

آج واقعی وہی سب وہاں موجود تھے' انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا' وہ سب کچھ فراموش کیے انہیں اتنے عمدہ انتظامات پر سراہ رہے تھے۔ مبارک باد دے رہے تھے' حالانکہ ہاجرہ نے انہیں کچھ بھی کرنے نہیں دیا تھا اور اس کی خواہش کے مطابق علاقے کے ایک نسبتاً" چھوٹے میدان میں شامیانہ لگا کر مرد و خواتین کے لیے علیحدہ نشستوں کا سامان کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی تعداد بھی کم تھی۔ باراتیوں اور دلہن والوں کے سمیت کل سوا سو کے قریب افراد تھے۔ کھانے میں بھی اسراف سے اجتناب برتا گیا تھا اور تو اور ہاجرہ نے اپنی سسرال والوں کو بری وغیرہ کے اہتمام سے روک دیا تھا۔

"آپ چاہتے ہیں نا کہ میں عزت سے اپنے گھر رخصت ہو جاؤں تو پھر میں جیسا کہہ رہی ہوں بالکل ویسا ہی کریں۔" ہاجرہ نے ان کے ہر اعتراض کے جواب میں کہا تھا۔

"آپ کو ہاجرہ بلا رہی ہے۔" یاسمین نے محلے کے ایک بچے کے توسط انہیں پیغام بھجوایا۔ وہ یکدم اٹھ کر اس جانب چل پڑے' جہاں قناتیں لگا کر مکمل پردے میں دلہن بنی ہاجرہ بیٹھی تھی۔ یاسمین بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" بے حد گھبرائے ہوئے انداز انہوں نے یاسمین سے پوچھا۔ یک بہ یک ماضی کا ایک منظر انہیں یاد آ گیا تھا۔ "جو لڑکی مایوں سے دو روز قبل۔" احمد رضا کو لگا تھا کہ نکاح ہو جانے کے باوجود کوئی تلوار ان کے سر پر ابھی بھی لٹک رہی ہے۔

"ہاجرہ کچھ کہنا چاہتی ہے آپ سے۔" یاسمین نے دھیمے سے کہا۔

"ہاں کہو۔" احمد رضا نے کہتے ہوئے تھوک نگلا۔

"ابو! آپ کو یاد ہے۔" ہاجرہ نے سر جھکائے ہوئے کہنا شروع کیا۔ لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ "سالوں پہلے میری گڑیا کی شادی ہوئی تھی۔ اس شام جب آپ گھر آئے تھے تو میں آپ کو روتی ہوئی نظر آئی تھی۔" احمد رضا حیران نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ شام تو انہیں یاد آ گئی تھی مگر اس شام کا آج کیا ذکر۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ہاجرہ ان کے تاثرات سے انجان بولتی جا رہی تھی۔

"اس کے بعد بھی میں نے اپنی گڑیا کی شادی اپنی سہیلی کے گڈے سے نہیں کی تھی۔ پتا ہے کیوں ابو؟" اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ احمد رضا گنگ ہو گئے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا جس نے احمد رضا کے تن بدن میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

"کیوں کہ میری سہیلی لالچی تھی۔ پلاسٹک کے چند برتنوں' سستے سے کھلونوں اور کھانے پینے کی چیزوں کی ہی سہی۔ لیکن لالچی تھی۔ اور لالچ کا کہیں اختتام نہیں ہوتا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے' مگر وہ بے نیاز بولتی گئی۔

"آپ نے میرے لیے اپنی ہڈیاں ریت کرتے ہوئے جو کچھ جوڑا تھا' وہ لوگ اس سب چیزوں کے قدر دان نہیں تھے۔ میں نے اپنی گڑیا لالچی لوگوں کو نہیں دی' مگر آپ نے اپنی گڑیا کے لیے لالچی لوگوں کا ہی انتخاب کیا تھا۔ وہ آپ کی بیٹی کو بیاہنے نہیں آ رہے تھے ابو! وہ آپ کی اپنی بیٹی کے لیے بے حد و حساب محبت کی قیمت وصول کرنے آ رہے تھے۔ وہ تین بھائیوں سے ان کی اکلوتی لاڈلی بہن کا تاوان طلب کر رہے تھے۔ اپنی حیثیت کا سب کچھ دینے کے باوجود مایوں سے دو روز قبل وہ ایک نئی فرمائش لیے چلے آئے تھے۔ ابو! آپ اپنا سب کچھ بیچ کر وہ فرمائش پوری کر دیتے۔ مجھے ان کے گھر رخصت کر دیتے پھر بھی میری آئندہ زندگی کی خوشیوں کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے۔ آپ اور بھائیوں کا سر ان کے آگے ہمیشہ جھکا ہی رہنا تھا۔" وہ اب ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

"ابو! آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ بیٹیاں جنت کا دروازہ ہوتی ہیں' مگر ابو جنت کا دروازہ بیٹیوں کی اعلا پرورش سے کھلتا ہے' عمدہ اور مہنگے جہیز سے نہیں۔"

یاسمین نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور احمد رضا۔ تو ہلنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اللہ نے کیسا انعام دیا تھا انہیں۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور پھر روتے ہوئے تیزی سے باہر چلے گئے۔

احمد رضا کی گڑیا۔ احمد رضا کا فخر تھی' ان کے سر کا تاج۔ اس نے ان کا سر جھکنے نہیں دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ساری باتیں ہاجرہ نے ان کے دل میں اپنے لیے ناراضی کو ختم کرنے کے لیے بالآخر بتا دی تھیں' جو وہ شاید ہمیشہ خود تک محدود رکھتی۔

احمد رضا کی گڑیا نے کیسا سبق انہیں سکھایا تھا۔

"دنیا اور دنیا کی باتوں کے خوف سے لڑکیاں رسوم و رواج کی سولی چڑھ جاتی ہیں' خود کو رولتی ہیں' والدین کی زندگیاں جہنم بنتے دیکھتی رہتی ہیں مگر ہمت اور حوصلے سے کسی غلط فعل کے خلاف ڈٹ کر کھڑی نہیں ہوتی ہیں۔ وہ غلط کرتی ہیں۔"

احمد رضا نے اپنی گڑیا کو ایک کونے میں کھڑے ہو کر دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ جسے اس وقت اس کی ساس اور نندیں بے حد محبت سے گاڑی میں بٹھا رہی تھیں جبکہ اس کا دولہا احترام بھری نگاہوں سے نئی نویلی دلہن کو دیکھ رہا تھا۔

"کون کہتا ہے کہ نیک اور اچھے لوگوں کے قدر دان نہیں ہوتے؟ جن کو دنیا کا ڈر نہیں ہوتا صرف اللہ کا ڈر ہوتا ہے' اللہ انہیں کبھی رسوا نہیں ہونے دیتا۔ اپنے والدین کی عزت' محبت اور لازوال خوشی کا پاس رکھنے والے ہیرے کو اللہ کبھی مٹی میں رلنے نہیں دیتا۔"

احمد رضا نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اپنی گڑیا کو رخصت کرنے آگے بڑھ گئے۔۔۔!

☼

قانتہ رابعہ

اپنی عادت کے برعکس عید کی نماز پڑھ کے آئی تو دروازہ بند نہیں کیا۔ چوری کا ڈر' نہ چکاری کا...... آج تو امید اور آس ہی تھی۔ دروازہ کھلے اور قدموں کی چاپ سنائی دے۔

سریلی مدھر دھیمی سی آواز۔

"باجی! یہ گوشت رکھ لیں..... اماں نے بجھوایا ہے"

..... لیکن..... نہیں۔

اس نے رات کی چائے گول کردی تھی۔ چلو بھر دودھ تو بچ ہی گیا تھا۔ کچھ صبح کی چائے کا دودھ..... آج اس نے خوب عیاشی کا سوچا اور دودھ پتی کے دو مگ بنا کے ایک خود پیا اور ایک اماں کے حوالے کیا۔ رضیہ اور نجمہ للچاتی نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔ اس نے پرواہی نہ کی۔

عید گاہ سے واپسی پر گلیوں میں وہ جانور ذبح ہوتے تو دیکھ ہی رہی تھی..... کئی جگہ پر ٹرے میں بجی رانیں بھی نظر آئیں۔ اپنی غربت بے بسی اور کم مائیگی پر دل میں ہوک سی اٹھی اور آنکھوں کے راستے بہہ نکلی۔ آنسو پونچھتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی اور ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

"غریب نفس پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ لذتوں سے بھی منہ موڑ سکتا ہے۔ کیا یہ اس کی غربت کی سزا ہے۔" ابا تو گول گپوں کا ٹھیلا لے کر کب کا عید گاہ کی طرف جا چکا تھا۔ اماں کے آگے اس نے اپنا سوال رکھا۔

اماں اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولیں۔

"بٹیا! اللہ کی شان بڑی نرالی ہے۔ یہ شک کے کانٹے بیچ میں مت لایا کرو۔ شک کفر کی طرف لے جاتا ہے۔"

"پر اماں! امیر خطا کار ہو کر بھی ان سب چیزوں سے فائدہ اٹھائے اور غریب بندگی کر کر کے بھی محروم رہے؟"

اماں مسکرائیں..... ثمینہ کو یوں لگا اماں کے تہجد کا نور مسکراہٹ میں ڈھل کر چاروں اور پھیل گیا ہے۔ اماں نے بس ایک ہی بات کی۔

"ہم تو صبر کریں گے۔ محروم ہیں۔ اللہ نے ہمارے مقدر میں نہیں لکھا' پر راضی رہنا ہمارا اجر بن جائے گا ۔ لیکن ثمو رانی! یہ تو سوچو کہ وہ امیر جو آج تین تین بکرے اور سالم گائے ذبح کرے گا' وہ تکے' بریانی سامنے رکھ کر بھی نہیں کھا سکے گا..... اس کا صبر زیادہ مشکل نہیں ہو گا؟ چیز موجود ہو۔ لیکن کولیسٹرول' بلڈ پریشر جیسے روگ ڈرا ڈرا کر ایک بوٹی تک نہیں چکھنے دیں گے۔ محروم وہ ہوئے کہ ہم؟" اب اماں نے سوال کی گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔

"ہائیں!" ثمینہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا....." وہ چیخ کر بولی اور پھر اپنی امی کی گود میں گھس گئی' دو سال کی بچی بن کر ..... "ہائے اللہ جی! آپ کتنے اچھے ہیں۔"

اسے یہ سوچ کر مزہ آ رہا تھا کہ امیر لوگ بھی محروم رہیں گے' جی بھر بھر کے کھانے سے..... ابھی ان ہی سوچوں میں مگن تھی کہ ایک بچے کی آواز نے واپس اسی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

"باجی! یہ لو قربانی کا گوشت..... گائے میں حصہ ڈالا تھا..... " پلیٹ کے بجائے وہ شاپر ثمینہ کے ہاتھ میں تھما کر یہ جا وہ جا.....

ثمینہ نے شاپر میں سے گوشت نکالا۔

ایک بڑی اور چھوٹی سی بوٹی کو موٹی سی چربی نے یوں چھپایا ہوا تھا کہ جیسے مہنگائی اور بے حیائی نے لوگوں کو قابو کر رکھا ہو۔ ثمینہ کا دل بجھ کر رہ گیا۔

اب اس آدھی چھٹانک کی بوٹی کو کون پکائے؟ اس نے بوٹی جا کر کچن میں رکھ دی۔ پڑوس میں مرزا صاحب کے حالات تو ان ہی جیسے تھے۔ ایک وقت

پیٹ میں جاتا تو دو وقت کی فکر ہی سر پر مسلط رہتی۔ لیکن انہوں نے بیٹے کو ورکشاپ میں ڈلوا دیا تھا۔ کچھ نہ کچھ لگی بندھی آتی ہی تھی۔۔۔۔ اس دفعہ انہوں نے بھی گائے میں حصہ ڈالا تھا اور رضیہ، ثمینہ، نجمہ تینوں اندازے لگا رہی تھیں دیوار کے اس پار۔ بریانی کا مسالا بن رہا ہے یا کبابوں کا۔۔۔۔ چھوٹا بھائی فرحان کھیلتا کھیلتا اندر آیا۔

"نہ بریانی نہ کباب۔ فاخرہ آپی تکے بنا رہی ہیں۔"

"تکے۔" رضیہ چیخی۔

"ثمینہ باجی! تکے کیسے بنتے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا میں تو جیسے تکے اور کوفتے بناتی رہتی ہوں۔" اس نے اپنی دوست کے ہاں ایک دفعہ کوفتے کھائے تھے۔ مانو! جیسے منہ میں اب تک ذائقہ گھلا ہوا ہو۔ گھنٹہ بھر وہ تینوں گوشت کی بنی ان ڈشوں پر تبصرے کرتی رہیں، جو وہ کبھی کھا چکی تھیں یا دیکھ چکی تھیں۔

"آپی! میری کلاس فیلو چپلی کباب بھی لاتی ہے اور کیچپ ڈال ڈال کر کھاتی ہے۔ پتا نہیں ان کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟" نجمہ نے سوال کیا۔

"چلو اٹھو! ماسی الفت کو دیکھو۔ وہ کیا لے کر آئی ہے؟"

تینوں کی نظر سامنے والی ماسی الفت کے ہاتھوں پر تھی۔

ایک پلیٹ میں گوشت والے چاول تھے۔ دوسری میں گوشت۔ ہڈیاں تو کم تھیں۔ البتہ چربی کافی تھی۔

پلیٹیں دھو دھلا کر واپس کیں تو تینوں چاولوں پر ٹوٹ پڑیں۔۔۔۔ دو دو لقمے بھی نہ کھائے کہ پلیٹ ختم۔

"آپی! جس چیز میں گوشت ڈل جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ اتنا مزے کا کیوں ہو جاتا ہے؟" نجمہ نے پھر سوال داغا۔

"تم سوال اپنے پاس رکھو اور جلدی سے لہسن پیاز لاؤ۔ صبح والی بوٹی اور یہ والا گوشت ملا کر شوربہ بنا لیتے ہیں۔ ابا آنے والے ہیں۔ آج تو بغیر ناشتے کے ہی چلے گئے تھے۔"

رضیہ آٹا گوندھ رہی تھی۔۔۔۔ نجمہ لہسن پیاز کاٹنے میں مصروف تھی اور ثمینہ گوشت دھو کر چربی الگ کر رہی تھی۔ لیکن تینوں ایک ہی سوچ میں گم تھیں۔ کیا کبھی ان کے گھر میں قربانی کا جانور بندھ سکتا ہے۔

کیا ان کے ابا بھی کبھی رب کی رضا کے لیے قربانی کا جانور خرید سکتے ہیں۔

"اگر ایسے ہو تو میں اس دن اپنی ساری حسرت پوری کروں گی۔ کڑھائی گوشت، بریانی، چانپیں، سارا گوشت الگ الگ کروا کے ہر چیز بناؤں گی۔" ثمینہ نے اعلان کیا۔

☼ ☼ ☼

ابا کے گول گپوں کی ریڑھی جہاں پر لگتی تھی، وہ کسی لئیق صاحب کی سائیکلوں کی مرمت کی دکان تھی۔ ابا ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ بہت نیک دل اور انسان دوست بندہ ہے۔

اس بقر عید پر کلو بھر گوشت کا شاپر تھماتے ہوئے ابا کے کان میں سرگوشی کی۔

"آج رات ہم لوگ آپ کے گھر آئیں گے۔"

"ضرور، ضرور۔۔۔۔" ہاتھ تنگ سہی، دل کے بڑے کھلے تھے ابا۔

"آپ کی شرافت اور ایمان داری کا گھر میں اکثر تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ میری گھر والی اکثر بیمار رہتی ہے۔ اب تو اس کے گھٹنے گوڈے جواب دے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں نے بھی مایوسی ظاہر کر دی ہے۔ گھر میں دو بیٹے ہیں، میری بوڑھی اماں۔۔۔۔ آپ نے میرا عتیق پتر تو دیکھا بھی ہے۔۔۔۔ اپنی دامادی میں لے لیں تو ہماری خوش قسمتی ہوگی۔"

ابا تو گم صم ان کی شکل ہی دیکھتے رہے۔ عتیق بھی ان کا دیکھا بھالا تھا۔ خاموش طبع، ملنسار۔ اکثر مینہ آندھی میں ان کا ٹھیلا اندر کروا دیتا۔

شام ڈھلے لئیق صاحب کا قافلہ ان کے غریب خانے آیا اور وہ غریب خانہ خوشیوں کی بھرمار سے دولت کدہ بن گیا۔ وہ مٹھائی، کیک، پلاؤ، کباب ساتھ لائے تھا۔ ثمینہ نے کلو گوشت جو ابا نے پکڑایا تھا، شوربے والا بنا لیا تھا۔۔۔۔ ساتھ میں اس نے اپنی بچتوں کو خرچ کر کے دودھ پھینیاں۔۔۔۔ سلاد رائتہ۔ اچھا سا دعوت کا سامان ہوا۔ آج بار بار ابا کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔

اماں بھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

ثمینہ بار بار سوچ رہی تھی۔

"کیا دولت گھر کے دکھوں کو قہقہوں میں بدل دیتی ہے۔"

جاتے جاتے ہزار کا نوٹ ہاتھ پر رکھ کے صرف رشتہ ناتا طے ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ ربیع الاول کی نو تاریخ کو شادی کا عندیہ بھی دے دیا۔

مہمانوں کی رخصتی کے بعد گھر کا ہر فرد ہلکا پھلکا تھا۔۔۔۔ ابا اسے بار بار پیار کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ربیع الاول کی نو بھی آ گئی۔ ثمینہ عتیق کی امانت بن کر رخصت ہو گئی۔ ابا نے اس کا ہاتھ عتیق کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بس اتنا کہا۔

"غربت ضرور گھر میں دیکھی میری بچیوں نے۔ لیکن میں نے ان کی تربیت شہزادیوں کی سی کی ہے۔"

نئے گھر، نئے لوگ نئے طور طریقے۔ اگلے سات آٹھ ماہ گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور بقر عید کا چاند نظر آ گیا۔ ثمینہ میکے گئی۔ بہنیں بار بار پوچھ رہی تھیں۔

"آپی! قربانی تو تمہارے سسرال والے کرتے ہی ہیں۔ اس دفعہ اپنی مرضی سے خوب ڈشیں بنانا۔ ہم بھی آئیں گے۔۔۔۔ کچے قیمے کے کباب کھانے۔"

ثمینہ مسکراتی رہی۔۔۔۔ کہا کچھ نہیں۔

بقر عید کے دن گائے کا گوشت پہلے آ گیا۔ بکرا بعد میں ذبح ہوا۔۔۔۔ ثمینہ کے لیے اس کی زندگی کا یہ ایسا منظر تھا، جو بچپن سے آنکھوں کے راستے دل و دماغ میں جم چکا تھا۔

اس کے سامنے گوشت کا ڈھیر ہو۔۔۔۔ اور وہ چانپیں الگ کرے۔

قیمے کا گوشت الگ۔

پسندے، سب کو پسند۔۔۔۔ اور کھڑے مسالے کے گوشت کے لیے وہ سینے کا گوشت الگ کرے۔۔۔۔

آج وہ موقع آ گیا تھا۔۔۔۔

رضیہ اور نجمہ بھی امی کے ساتھ عید ملنے آئی تھیں۔

اتنا بڑا گوشت کا ڈھیر دیکھ کر ثمینہ بار بار آنکھوں کا پانی صاف کر رہی تھی۔

پھر سب نے دیکھا۔ اس نے ہاتھ مار کے الگ کیے گوشت کے حصوں کو اکٹھا کر دیا۔ پلیٹیں بھر بھر کے وہ محروموں اور منتظر کو بھجواتی رہی۔

"آپی! یہ تو سارا ہی بانٹ دیا۔ آپ نے تو رکھا ہی نہیں۔ اب ان بوٹیوں سے کیا بنائیں گی؟"

گوشت کی چند بچی کھچی بوٹیوں کو دیکھ کر وہ ہکا بکا تھیں۔۔۔۔ ان کے حصے کا گوشت ان کے محلے کے غریبوں کے لیے وہ پہلے پکڑا چکی تھی۔۔۔۔ اور اب اس کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی۔۔۔۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ میں گوشت سارا تقسیم ہونے پر رو رہی ہوں۔ میں تو اس لیے رو رہی ہوں، دینے والوں نے تو اپنا صالح، فرماں بردار بیٹا اللہ کو دیا تھا۔۔۔۔ یہ تو چند بوٹیاں ہیں۔ پتا نہیں اللہ نے قبول کیں یا نہیں؟" ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کہاں جیتا جاگتا، بڑھاپے میں ملا بچہ۔۔۔۔ آنکھوں کا نور، دل کا سرور اور کہاں یہ چند بوٹیاں۔" بھل بھل اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس لمحے عتیق اندر آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا سارا کمرا ان دیکھی روشنی سے بھرا ہوا ہے۔۔۔۔

تقویٰ کی روشنی۔۔۔۔ ایمان اور اطاعت کے ساتھ ساتھ ممتا کی روشنی!!

☼

آسیہ رزاقی

کس کے گھر سر

آم جھروکے کیوں کھڑی ری لاڈو
کیا تیرا من پچھتائے رے
اک پچھتاوا یہ کروں ری اماں
میں گوری، ساس کے جائے سانورے

آج تین دن سے گھر میں ڈھولک کھڑک رہی تھی۔ شام ہوتے ہی جانے کہاں سے لڑکیاں قافلے کی صورت نمودار ہوتیں، پھر ہنسی قہقہے، ڈھولک کی ڈھم ڈھم۔ کان پڑی سنائی نہ دیتی۔

جنید میاں نے بھلا یہ شور شرابا، یہ ہنگامہ کب دیکھا یا سنا تھا۔ گیارہ سال کے بعد پاکستان آئے تھے۔ زچ ہو گئے۔ بقول چچی جان کے ان کو اسی لیے اوپر کا کمرا دیا گیا تھا کہ شور سے پریشان نہ ہو جائیں۔ لیکن آوازیں ہوا کے دوش پر لہراتی کھڑکی سے، روشن دان سے کمرے میں پہنچ جاتیں۔ کھڑکی بند، روشن دان بند۔ مگر جھریوں کے یا درزوں کے ذریعے سفر کرتی جنید میاں کی سماعت میں گنگناتیں۔ رات کے وقت کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ کسی سے واقفیت نہ تھی۔ راستے بھی انجانے۔ چچا جان نے یہ وسیع و عریض کوٹھی پانچ چھ سال پہلے خریدی تھی۔ ورنہ پرانا آبائی مکان جو گنجان محلے میں تھا۔ جنید میاں وہاں کے راستوں سے واقف تھے۔ لوگوں سے کچھ جان پہچان بھی تھی۔ لیکن یہ علاقہ ان کے لیے قطعی نیا تھا۔

گانے والی آج نئی آواز تھی اور کئی آوازیں مل کر نہیں، بلکہ ایک ہی سریلی لے میں گا رہی تھی۔ سمجھ میں بھی آ رہا تھا کہ وہ کیا گا رہی ہے جبکہ سب مل کر تو سوائے شور کے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لو بھئی۔ لاڈو کو تو ساس کے بیٹے کا سانولا ہونا ہی پسند نہ تھا۔ جبکہ یہاں تو ہر سانولے یا کالے مرد کے لیے گوری دلہن ہی درکار تھی۔ یہ شکوہ بھی اپنی جگہ خاصا اہم تھا۔ گانے والی کی آواز میں سریلا پن تھا اور اس طرز کا اتار چڑھاؤ قابل سماعت تھا۔ کوئی نئی آواز تھی۔

”یہ پچھتاوا مت کرو ری بیٹی! اماں گوری ابا سانورے“

چلو جی۔ اماں نے تو گل مکا دی۔ واہ کیا مزے دار مکالمہ تھا۔ جنید میاں نے کھڑکی پاٹوں پاٹ کھول دی۔ ڈھولک کی آواز بھی دھیمی تھی۔ اس لیے الفاظ صاف سمجھ میں آ رہے تھے۔

”آم جھروکے کیوں کھڑی ری نندی!
کیا تیرا من پچھتائے رے“۔

اب بھابھی نند کو آم تلے کھڑی اداس دکھائی دی تھیں۔ وہی سوال وہی جواب۔

”اک پچھتاوا یہ کروں ری بھابھی!
میں گوری، ساس کے جائے سانورے“۔

”یہ پچھتاوا مت کرو ری نندی!
بھابھی تم گوری، بھیا سانورے“

وہی پچھتاوا۔ وہی تسلی اور ہائے بے چاری گوری حسینہ... چچی، خالہ، مامی، پھوپھی سب نے یہی تسلی دی۔ ایک ہی جواب۔

"ائے ہے۔ سارے مرد کیا ویسٹ انڈیز سے لائے گئے تھے۔" کسی نے ہنسی ہنسی میں مذاق میں اعتراض جڑ دیا۔

اس کے بعد گانے والی کی آواز کی تعریفیں شروع ہوئیں۔ گانا بھی پسند کیا گیا۔ قہقہے تو تھے ہی۔

"سمانہ! کوئی اور پھڑکتا ہوا گانا سنا۔" فرمائش۔

اچھا سنیے!"

"گنگنا لے دو جان، گنگنا لے دو جان
ہیں پتلی گوری بیاں رے"

"گوری فرمائش کر رہی ہے میاں سے کہ اسے ایک کنگن دلا دے۔ وہ گوری ہے اور پتلی پتلی بانہیں ہیں۔ سونی بانہیں کنگن سے سجتی ہیں۔" گانے والی خود تشریح کر رہی تھی۔ "اب آگے سنیے!"

"ساس کو ہو گیا نزلہ
نندی کو بخار، بالی کو بخار
سیاں کو ہو گیا رتوندا رے
دن سوجھے نہ رات... دن سوجھے نہ رات
میں پتلی گوری بیاں رے..."

رتوندا ایک بیماری ہے۔ آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں دن کو نظر نہیں آتا۔ مگر سیاں کو رات میں بھی نظر نہیں آ رہا۔ گوری پتلی بانہیں۔ اسی طرح سونی ہیں۔" تشریح جاری تھی۔

"اوئی، لو اور سنو۔ معاملہ خراب ہو گیا۔" آوازیں۔

"ساس کو مل گیا بڈھا۔
نندی کو جوان۔ بالی کو جوان بالا سا جوان
سیاں کو مل گئی پڑوسن رے
جیا جل گیا لو جان... جیا جل گیا لو جان
ہیں پتلی گوری بیاں رے..."

واہ بھئی ساس کو بڈھا مل گیا۔ نند کو اس جیسا جوان بانکا سجیلا جوان، سیاں کو کیا ملا؟ پڑوسن؟ جی جلے نہ... تو اور کیا ہو گا۔ پڑوسن کے پلے بندھے سیاں جی۔ پتلی گوری بانہیں کنگن کو ترستی رہ گئیں۔"

"ہائے ہائے۔ منہ جلی پڑوسن، خاک پڑے کمبخت پہ۔" آوازیں، تجزیے۔ اظہار تاسف۔

"اب آگے سنیے۔

"ساس کے ہو گئی بیٹی
نندی کے دو لال
بالی کے دو لال
سیاں کے ہو گئی بندریا رے
اچک کاٹے جو گال... اچک کاٹے جو گال
ہیں پتلی گوری بیاں رے
گنگنا لے دو جان..."

"چلو بھئی، چھٹی ہوئی۔ موئی بندریا نے خوب اچک اچک کے گال نوچے۔ موا اسی قابل تھا۔" قہقہے... شور

"ایک دفعہ اور نقل کر کے بتا سمانہ! کیسے گال کاٹے بندریا نے۔" ہو ہو ہو۔

گانا فی الحال رک گیا۔ چائے آ گئی تھی پھر نماز مغرب ہو گئی۔ ضیا اس کے لیے چائے اور کیک لے آئی۔

"یہ کون گا رہا تھا۔ میرا مطلب گانے والی کون تھی ضیا؟"

"جنید بھائی جان! سمانہ باجی تھیں۔ اتنا اچھا گاتی ہیں نا... اتنا مزا آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ نقل بھی کرتی ہیں۔"

ضیا کے چہرے سے اس کے لطف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں پوری کھلی ہوئی۔ ہاتھوں کے اشارے خوشی سے بے قابو۔

"پتا ہے۔ نانی جان کو بھی بہت اچھا لگا۔ جھٹ سے سو روپے نکال۔ فٹ سے ان کو تھما۔"

"اچھا اور یہ سمانہ باجی ہیں کون...؟"

"آپ کو نہیں پتا... ہائیں! تو پھر راشد بھائی کا کیا پتا ہو گا۔"

"کو... کون راشد بھائی۔" وہ الجھ گئے۔

"دیکھا۔ مجھے پتا تھا۔ ارے اپنی سمانہ باجی کے میاں۔"

جنید میاں نے ایک کیک پیس اس کی طرف بڑھایا "لو کھاؤ اب بتاؤ۔ کون ہیں یہ سمانہ باجی۔"

وہ جلدی جلدی کیک نگلنے لگی پھر "پوچھ کر بتاتی ہوں گی۔" کہہ کر نیچے بھاگ گئی۔

"پتا نہیں اب کس سے کیا پوچھے گی اور کوئی کیا نتیجہ اخذ کرے گا۔ خیر میں نوید سے پوچھ لوں گا۔" نیچے ڈھولک بند تھی۔ بس کچھ آوازیں۔ کچھ ڈانٹ ڈپٹ۔ مستقل کسی کو پکارا جا رہا تھا۔ نوید نہ جانے کہاں تھا۔ اس کا انتظار فضول تھا۔ بے زار ہو کر نیچے آئے۔

مرد لوگ نماز کے لیے مسجد گئے ہوئے تھے۔ خواتین برآمدے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ لڑکیاں فی الحال ڈھولک سے الگ ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔

کچن میں چند لڑکیاں کام سے زیادہ باتوں میں مگن تھیں۔ وہ اپنی چائے والی ٹرے لے آئے تھے۔ جس میں کیک اور ایک خالی پلیٹ تھی۔ وہ اندر آ کر کھنکارے تو لڑکیوں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"ہائے اللہ جنید بھائی! آپ یہ ٹرے کیوں لے آئے۔ ضیا لے آتی۔ آپ مہمان ہیں۔" ایک چلبلی سی لڑکی بولی۔

"جنید بھائی! آپ تو خاصے دولہا دولہا سے لگ رہے ہیں۔ بنے سنورے۔" دوسری پٹاخہ نے شوشا چھوڑا۔

(ہائیں صرف نہا کر لباس اچھا سا پہنا۔ اور بال ہی بنائے تھے۔)

"ارے ہٹو! دولہا نہیں، ہیرو لگ رہے ہیں۔" تیسری نے رائے زنی کی۔

"ہاں ہاں، یہی کہنا چاہتی تھی۔ منہ سے دولہا نکل گیا۔"

"اسی لیے کہتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر بات منہ سے نکالنی چاہیے۔ کبھی کوئی ساعت قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔"

"اور بھی اچھا ہے۔ اگر یہ ہم میں سے کسی کے دولہا بن جائیں۔" بڑی تیز بے تکلف قسم کی لڑکیاں ہیں۔ وہ جھینپ گئے۔

"آئیے۔ کرسی موجود ہے۔ ہم سے بھی کچھ راز و نیاز کر لیں۔ کینیڈا کے موسم پر بات ہو جائے۔"

ایک لڑکی تو آگے آ کر انہیں پکڑ کر کھینچنے لگی۔ کرسی پر بٹھا کر ہی چھوڑا۔ (اوہ۔ یہ تو بہت بولڈ ہے۔ توقع نہ تھی)

ایک لڑکی پلیٹیں جمع کر رہی تھی۔ دوسری چمچے گن گن کر رکھتی جا رہی تھی۔ تیسری چولہے پر رکھے بڑے دیگچے میں بڑا چمچہ چلا رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر سب نے اپنا کام موقوف کر دیا اور انہیں دیکھنے اور اشارے کرنے لگیں آپس میں۔

"کھانے میں کتنی دیر ہے؟" سٹپٹا کر پوچھ بیٹھے۔ (اتنی حسین لڑکیوں کی نگاہوں کا مرکز بنے رہنا۔ اف)

"بھوک لگی ہے تو آپ کھا لیں۔ ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ سب کے ساتھ کھاؤں گا۔"

"آپ امریکا کی کس ریاست میں رہتے ہیں؟" ایک لڑکی اس کے سامنے کرسی پر ڈٹ گئی۔

"میں کینیڈا سے آیا ہوں۔ ٹورنٹو سے۔"

"اوہ اچھا یاد آیا۔ میری ایک سہیلی بھی ٹورنٹو میں رہتی ہے۔ اس کا نام نشا ہے آپ اسے جانتے ہیں؟ اس کے ابا کا بہت بڑا اسٹور ہے وہاں۔"

"نہیں بھئی۔" وہ جھینپ گئے۔ "میں وہاں کسی پاکستانی لڑکی کو نہیں جانتا۔"

"تو آپ صرف کنیڈین لڑکیوں سے ہی ملتے ہیں بس؟"

جنید میاں شرما گئے۔ "نہیں میں کسی... ارے نہیں بھئی۔"

کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور کچن سے نکل گئے۔ تعاقب کیا شدید قہقہوں نے۔

☆ ☆ ☆

"دولہا بھاگ گیا۔" یہ خبر نہیں۔ بم کا دھماکا تھا۔ ہر سمت ہاہاکار مچ گئی۔ پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا ہوا۔ پھر تبصرے۔ رازونیاز۔

"ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ غیروں میں شادیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اب بھگتیں۔"

مگر یہ سب ایسے ہی نہیں ہوا۔ ہوا یوں کہ نماز عشا کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ مرد لوگ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی۔ چچی جان اور باجی شاہدہ کچن سمیٹنے' کھانا بانٹنے' رکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ جنید میاں اوپر جانے کے لیے ادھر سے گزرے۔ فون برآمدے میں تھا۔ انہیں گھنٹی سنائی دی تو سامنے کسی کو نہ پا کر خود ہی فون اٹھا لیا۔ دوسری جانب بھی کچھ شور سا تھا۔ پھر ایک تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سنو! تم جو بھی ہو۔ اپنے گھر والوں کو بتا دو۔ دولہا بھاگ گیا ہے۔ اے بھائی برابر انکار کرے جا رہا تھا۔ کسی نے سنا نہیں۔ ماں باپ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اب..... کل ہے مہندی۔ وہ آتا ہے کہ نہیں۔ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مہندی ہو کہ نہ ہو۔ شادی ہو کہ نہ ہو۔ بس سب سے کہہ دو۔"

"ہیلو' ہیلو..... سنیے آپ ہیں کون' کہاں سے بول رہی ہیں؟" جنید میاں ہکابکا تھے۔

"تمہیں' جو بھی ہوں۔ شادی والے گھر سے بول رہی ہوں۔ تمہاری طرف بھی ڈھولک کھڑک رہی ہے۔ میں نے پیغام پہنچانا تھا پہنچا دیا۔ لڑکی والوں کو بھی بتا دو..... خیر صلا۔"

جنید میاں ازحد پریشان' حیران ریسیور کو گھور رہے تھے' جہاں اب خاموشی تھی۔ کیسا پیغام۔ کس کا پیغام' ۔ وہ انجان تھے کس سے کہیں اور فون کرنے والی کا نام تک نہیں' پھر ہمت کر کے لاؤنج کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ نہ چچی جان نظر آئیں۔ نہ باجی شاہدہ' خواتین تو کئی تھیں۔ مگر وہ زیادہ پہچانتے نہ تھے۔ نہ جانے اتنی عورتیں کہاں سے جمع کر لی تھیں چچی جان نے۔

"سنیے۔ ذرا سنیے۔" ایک بنی سنوری لڑکی گزری۔ اسی کو پکار بیٹھے وہ آ گئی۔

"جی کہیے۔" منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"وہ' آپ چچی جان کو بلوا سکتی ہیں۔ ان سے بات کرنی ہے' بہت ضروری۔"

"کیوں' میں پسند نہیں آئی۔ کیا برائی ہے مجھ میں؟ مجھ سے کر لیں' جو بات کرنا ہے۔"

"آپ..... آپ سے نہیں۔ چچی جان یا باجی شاہدہ سے....."

"اف! سب کی سب پٹاخہ ہیں۔"

منہ بناتی وہ پٹاخہ لڑکی جھومتی جھامتی گئی اور باجی شاہدہ کو پکڑ لائی۔

"لیجیے۔ آ گئیں آپ کی باجی شاہدہ۔ کر لیں بات۔"

"کیا بات ہے جنید میاں! کچھ پریشان ہو؟" وہ سمجھ گئیں۔

"جی باجی! وہ ابھی ایک فون اٹینڈ کیا تھا میں نے۔ میں تو چاہتا تھا۔ آپ کو یا چچی جان کو بلاؤں' مگر کوئی سامنے نہ تھا۔ اس لیے میں نے....." بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی۔

"ہاں' فون' اچھا کس کا فون؟"

"باجی! میں نے پوچھا۔ آپ کون ہیں۔ تو انہوں نے کہا۔ میں جو بھی ہوں۔ لڑکی والوں کو پیغام دے دو۔ لڑکا شادی پر راضی نہیں۔ وہ انکار کرتا رہا۔ کسی نے سنا نہیں۔ اب وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ پتا نہیں مہندی پر بھی آتا ہے کہ نہیں۔ شا..... شادی بھی ہوتی ہے کہ....."

باجی ٹکر ٹکر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ "تم نے..... سنا یہ سب۔"

"جی باجی! میں پوچھتا رہا آپ کون مگر....."

باجی حواس باختہ ہو کر انہیں دھکا دیتی ہوئی باہر نکلیں' ان کا رخ ڈرائنگ روم کی جانب تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ ظاہر ہے سب ان سے ہی گواہی طلب کریں گے۔

باجی شاہدہ نے چچا جان سے کیا کہا۔ وہ سن نہ سکے۔ مگر وہاں موجود چند بزرگ اور چند دوسرے حضرات بھی حیران اور پریشان ہو گئے۔ چچا جان بے حد الجھے ہوئے لگ رہے تھے۔ بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

اشارے سے جنید میاں کو پاس بلایا اور موجود حضرات سب ان سے حجت کرنے لگے تھے۔ "ہائیں نام نہیں بتایا۔ لڑکے کا نام بھی نہیں۔ واہ یہ تو معما ہو گیا۔" چچا جان کو کچھ بولنے پوچھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ دوسرے لوگ ہی بولتے رہے۔ پھر چچی جان کو بلا لیا گیا۔ ان کو باجی شاہدہ نے بتا دیا۔ چچی جان رونے لگیں۔ ماحول خاصا سوگوار ہو گیا۔

"چچا جان! آپ ان کے گھر فون کر کے معلوم تو کریں معاملہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی رانگ نمبر ہو۔" جنید میاں نے مشورہ دیا۔

"ارے میاں! کیا معلوم کریں۔ جب انہوں نے کہہ دیا کہ لڑکا انکار کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ کھل کر کوئی کیا کہے گا؟ اور مجھے تو شرم آئے گی پوچھتے ہوئے۔ یعنی کہ ہم اتنے گئے گزرے ہو گئے۔ خود سے پوچھیں کہ بھئی ہماری لڑکی میں کیا عیب ہے' جو وہ انکار کر رہا ہے۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔" وہ سخت برافروختہ تھے۔

جنید' باجی کو الگ لے جا کر انہیں سمجھانے لگے کہ "باجی! آپ فون کر لیں۔ معلوم تو ہو قصہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔"

"میں.....؟ مجھ سے تو بات نہیں کی جائے گی۔ گلا بند ہو جائے گا۔"

باجی شاہدہ بے حد رنجیدہ تھیں۔ وہ ان کے جذبات سمجھتے تھے۔ پھر بھی کوئی تو ان لوگوں کے مسئلے کا سبب معلوم کرے۔ کوئی بھی' مگر وہاں سب غصہ' گرمی' جلال کے زیر اثر۔ چچا جان خاموش صوفے میں دھنسے بیٹھے تھے۔ چچی جان لڑکے کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں۔ کوئی بھی جنید کے مشورے کو ماننے پر راضی نہ تھا۔

"نوید..... یہ نوید کہاں ہے؟" جنید میاں نوید کی تلاش میں باہر نکلے۔ وہ لان میں تھا۔ وسیع و عریض لان جس کی گھاس بھی اب سوکھ چکی تھی۔ بچوں نے کرکٹ کھیل کر گھاس کے علاوہ کنارے پھولوں کی کیاریاں بھی تباہ کر دی تھیں۔ نوید لان میں شامیانے لگوا رہا تھا۔ کرسیاں کنارے رکھوا رہا تھا۔ مہندی کا انتظام۔

"اف کس قدر ذمے دار لڑکا ہے یہ نوید۔ اب کن الفاظ میں اس سے کہیں کہ بھائی یہ سب چھوڑو اور فون سے چپک جاؤ۔" آخر اسے جا پکڑا۔ وہ شامیانے لگانے والوں کو کچھ ہدایات دیتا ہوا جنید میاں کے پاس آیا۔ انہوں نے اسے پکڑ کر اندر لے جاتے ہوئے ساری بات بتائی۔ نوید کی سٹی گم ہو گئی۔

"یہ کیسے..... بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

مگر یہ ہو چکا تھا۔ جنید اسے پکڑ کر فون کے قریب لائے۔ سمجھایا کہ کس طرح بات کرنی ہے۔ مگر وہ چیختا چلاتا اندر بھاگا۔ پھر جو نئے سرے سے شور ہوا اور عجیب طرح کا سناٹا۔ ہاں ڈھولک یک لخت بند ہو گئی تھی۔ لڑکیاں اپنی جگہ گم صم۔ ٹک ٹک دیدم..... دم نہ کشیدم کے زیر اثر۔

جنید کو تھکن نے گھیر لیا۔ اچانک دھاڑ سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور حواس باختہ ایک لڑکی کچھ کہتی' کچھ تلاش کرتی باہر نکلی۔ "بے ہوش ہو گئی چچی! نازی بے ہوش ہو گئی۔" کہتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گھسیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر

بعد سب باہر آگئیں۔ جنید کو نازی پر ترس آرہا تھا۔ اچانک انہوں نے دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گئے۔ نازی تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ انہیں دیکھ کر سنبھل کر اٹھی۔ دوپٹا سر سے اوڑھ لیا۔ اداس حسینہ۔ نظریں جھکی ہوئی۔ رنگ زرد۔

"میں بیٹھ جاؤں؟" کرسی کھینچ کر بیڈ کے قریب لاتے ہوئے اجازت طلب کی۔ نازی نے گردن کے اشارے سے اقرار کیا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "نازی! تم پریشان نہ ہونا۔ ہمت کرو۔ حوصلے سے کام لو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" کمزور سی آواز میں اس نے کہا۔

جنید میاں ہنسے "ٹھیک ہونا اسے تو نہیں کہتے۔ آواز میں نقاہت ہے اور رنگ ہلدی جیسا پیلا۔ حالانکہ تمہارا رنگ تو سرخ سفید تھا۔ اچانک یہ کیا ہوا۔"

"ہی ہی ہی ہاہا۔" نازی کے عقب سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔ جنید نے دیکھا نہ تھا کہ وہاں کوئی اور خاتون بھی موجود ہیں۔ تعجب سے نظر اٹھائی۔ ایک بے حد صحت مند خاتون کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔

"ارے میاں یہ پیلا رنگ پریشانی کا نہیں ہے۔ تین دن سے صبح شام ابٹن ملا جارہا ہے۔ خوشبوؤں والی جڑی بوٹیوں کو رگڑ کر ہلدی ملا کر۔ آیا کچھ سمجھ میں۔ دلہن کی رنگت پیلی ہو تو میک اپ اچھا ہوتا ہے۔ روپ آتا ہے۔"

کافی تفصیل پسند محترمہ ہیں۔ یہاں سب بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔ یہ محسوس کیا جنید میاں نے۔ وہ چپ ہوئیں تو جنید نے گلا صاف کر کے آہستہ سے کہا۔ "دیکھو نازی! تمہارے پاس تمہارے منگیتر کا فون نمبر ہوگا۔ اسے فون کرو۔ اس سے بات کرو۔ آرام سے مسئلہ پوچھو۔"

"اتنی بڑی توہین کے بعد میں اسے فون کروں؟" حیرانی تھی۔

"کوئی حرج نہیں۔ معلوم تو ہو کہ یہ بات درست ہے بھی کہ نہیں۔ کسی نے ــــ ویسے ہی ــــ میرا مطلب ہے کہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔"

"اجی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ کوئی اور پسند آگئی ہوگی۔ آج کل کے لڑکوں میں تلوّن بہت ہے۔" نازی کے پیچھے سے ارشاد ہوا۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" نازی تڑپ گئی۔ "وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔" اتنا اعتماد۔

"کرتا ہے نہیں۔ کرتا تھا کہو بنو! بلکہ کرتا ہوگا۔" عقب سے لقمہ دیا گیا۔

"تم فون تو کرو۔ ابھی پتا چل جائے گا۔" جنید نے اصرار کیا۔

"کیا کہوں ــــ سمجھ میں نہیں آرہا۔" بہت مایوس ہو کر نازی نے کہا۔

"یہی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ وہاں سے جو فون آیا اس کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اگر یہی کرنا تھا تو ــــ آخر مقصد کیا ہے؟ جو بھی پوچھ سکتی ہو' پوچھو۔"

جنید کے اصرار پر آخر نازی نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا۔ نمبر ملایا۔ منہ بنا کر بولی۔ "بند ہے۔"

"اس کی بہن یا بھابھی کا نمبر ــــ کسی سے بھی رابطہ کرو۔"

"اکلوتا ہے۔ بہن ہے نہ بھائی۔" پھر بھی بار بار نمبر ملاتی رہی۔ کوئی جواب نہ ملا۔

"ویسے تمہارا موبائل تو بہت خوب صورت ہے کافی قیمتی لگتا ہے۔" جنید نے اس کے چہرے کی مایوسی سے متاثر ہو کر توجہ ہٹانے کے لیے بات بدلی۔

"شرجی کا دیا ہوا ہے۔ عید کا گفٹ۔" نازی کے حلق سے آواز نکلی۔

"شرجی کون؟"

"ارے وہی ہرجائی بے وفا۔ شرجیل۔" پیچھے سے مطلع کیا گیا۔

اب یاد آیا۔ دولہا کا نام شرجیل تھا۔ نازی اب

پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"بے وفا ہرجائی کے لیے قیمتی آنسو بہا کر خود کو اذیت پہنچانا فضول ہے۔" وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آگئے۔ ادھر سے باجی شاہدہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"تم یہاں نازی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟" عجیب مشکوک سا لہجہ تھا۔

"کچھ نہیں۔ میں تو نازی کو تسلی دینے آیا تھا کہ فکر نہ کرے' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جنید میاں نے ان کو بھی تسلی دینی چاہی۔

"سب ٹھیک کیسے ہو جائے گا خود بخود؟" باجی شاہدہ غصے میں تھیں یا صدمے کے باعث بگڑی ہوئی تھیں۔ تیکھے لہجے میں کہنے لگیں۔ "یہ خوب ہے۔ آج کل ٹی وی کے ہر ڈرامے میں یہ ڈائیلاگ ضرور ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا نقصان ہو یا پریشانی' یہی کہا جاتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے بابا۔ کیسے بغیر ہاتھ پیر ہلائے؟ عقل استعمال کیے بغیر ہی؟"

"تو ــــ فون تو کریں ان کے گھر پر۔" (اگر عقل استعمال کرنی ہے)

"کیا تھا ــــ فون خراب ہے۔ یا جان بوجھ کر انہوں نے ریسیور ہٹایا ہوا ہے۔ بے جان ہے بالکل۔ ٹوں ٹوں کے سوا کوئی آواز نہیں۔"

"ان کے گھر کسی کو بھیجیں۔"

"کوئی راضی نہیں ہوتا۔" مایوسی سے گویا ہوئیں۔ "یا پھر تم چلے جاؤ مگر ــــ تم انجان آدمی' نہ تم کسی کو پہچانو گے نہ وہ تمہیں۔"

"یہ تو ہے۔ میں تو ایسی بات کرنے کی پوزیشن میں ہوں ہی نہیں۔ آپ ایسا کریں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ بات آپ کریں۔"

"لو۔ میں جاؤں؟ تو تم جا کر کیا کرو گے۔ فالتو فنڈ میں۔"

"یہ فالتو فنڈ کیا ہوتا ہے؟" جنید سمجھ نہ سکے۔ پھر سرہلایا۔

"میں ــــ آپ کی سپورٹ۔ میرا مطلب ہے مدد یا تعاون کے لیے۔"

"مگر' میں جاؤں کیوں؟ ذلت کم ہوئی ہے؟ اور بھی ذلیل ہونے کے لیے جاؤں؟ نہ بابا! کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو امی' ابا مجھے الزام دیں گے کہ میں نے بات خراب کر دی۔" صاف جواب۔

"تو ــــ جو درست بات کر سکتا ہو۔ اسے بھیجیں۔ نوید کو بھیج دیں۔ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔" نوید کے ساتھ جانا ٹھیک لگا انہیں۔

"آخر تم ہر کسی کے ساتھ کیوں لٹکنا چاہتے ہو فالتو فنڈ میں۔"

لو پھر فالتو فنڈ۔ آخر پوچھ لیا۔ "یہ فالتو فنڈ سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"مطلب تو کون میں خوامخواہ۔" چلو ایک اور پہیلی مگر خوامخواہ کا مطلب تو سمجھتے تھے۔

"دیکھیے۔ مجھے کسی کے ساتھ لٹکنے کا شوق نہیں ہے۔ میں تو صرف نازی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ اسے کس جرم کی سزا دی جائے۔ آخر لڑکے والوں سے سوال کرنے کا حق تو ہے نا بھائی کہ عین وقت پر یہ انکار کا کیا مطلب ہے اور اگر لڑکے کی مرضی نہ تھی تو کیوں اسے مجبور کیا۔ ہماری لڑکی کو کیوں سزا ملے۔" جی چاہا کہہ دیں (فالتو فنڈ میں)۔

"بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" ان کی سمجھ میں آگیا۔ "اچھا رکو' میں ابا جان سے یا امی سے بات کرتی ہوں۔"

وہ مڑ کر چل پڑیں اپنی امی یا ابا کی طرف۔ جنید میاں ٹہلتے ہوئے آگے بڑھے اور لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ معلوم تو ہو۔ اب کیا طے ہوا ہے۔ وہاں کئی بزرگ خواتین ٹھسے سے ایک تخت پر براجمان تھیں۔ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے اور دو ایک نیم دراز تھیں۔ دبی زبان سے بات چیت چل رہی تھی۔ ساتھ ہی چونا بھی چاٹا جا رہا تھا۔ درمیان میں بڑا سا پاندان کھلا ہوا دعوت عام دے رہا تھا اور سب خواتین اس میں ہاتھ ڈال کر انگلیوں کے ساتھ کچھ ٹونگ رہی تھیں۔ چھالیہ' سونف' ناریل اور تمباکو وغیرہ۔ دوسروں کی خاطر بھی کی جا رہی تھی۔

"یہ ناریل کھالو۔ چونے سے منہ نہیں کٹے گا۔ چھالیہ باریک کر کے دوں آپا...؟ پان میں کوئی لذت ہی نہیں۔ عجب طرح کے پھیکے سیٹھے پان ہیں۔"

"اری تم کو لذت کی پڑی ہے۔ طاہرہ کی خبر لو جاکر۔ کیسی ہے نگوڑ ماری۔ بچی کا کیا حال ہے۔ اس کی مہندی کا کیا ہوگا۔"

"باجی! طاہرہ تو مردانے میں ہے۔ سمانہ سے کہو۔ سمانہ... اے سمانہ! ذرا کسی سے جاکر پوچھ بیٹی! کہ اب مہندی کا کیا پروگرام ہے۔ ہم اب رہیں یا گھر چلے جائیں اپنے۔"

"اے ہاں ہم تو مایوں اور مہندی کے لیے آئے تھے۔ تو اب..."

ایک بہت ہی طرح دار حسینہ سلیقے کا میک اپ کیے۔ گلابی شوخ رنگ کے سوٹ اور رنگ برنگی چنری کندھے پر لٹکائے نخروں سے درمیان سے اٹھ کر آئی۔ اصل میں ڈھولک والی لڑکیاں درمیان میں فرش پر جمع کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ سمانہ صاحبہ ان کے درمیان بیٹھی ان سب سے باتوں میں مشغول تھیں۔ اٹھ کر آئیں۔ سب کی بات سنی۔

جنید نے ان کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ جنید کی نظروں کو خود پر مرکوز محسوس کر کے رکیں اور گردن اٹھا کر انہیں مسکراتے دیکھ کر پوچھ لیا۔

"آپ کون؟"

جواب تو تھا کہ میں خوامخواہ فالتو فنڈ میں۔ جنید خوش ہو کر بولے۔ "دیکھا آپ مجھے نہیں پہچانیں۔ مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ سمانہ صاحبہ ہیں۔ آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔ میں نے آپ کے گانے سنے۔ بہت لوچ ہے آواز میں۔"

"شکریہ۔" وہ کچھ خشک آواز میں کہہ کر چلنے کو ہوئیں۔

جنید میاں نے فوراً" ہی دوسرا سوال ٹھوک دیا۔ "ویسے یہ راشد بھائی کہاں ہیں۔ میرا ان سے تعارف نہیں ہے۔ ملوائیے نا۔ ہم بھی اس خوش نصیب کو دیکھیں۔"

جنید کی بات پر سمانہ کا رنگ فق ہو گیا۔ پھر وہ سرخ ہو گئیں۔ اب وہ پیر پٹختی پیچھے کو مڑیں اور تخت نشین خواتین سے احتجاجاً" چیخ کر بولیں۔

"دیکھیں نانی جان! یہ، یہ نہ جانے کون ہیں۔ مجھے راشد کے نام کا طعنہ دے رہے ہیں۔ شرم نہیں آتی۔"

جنید میاں کی سٹی گم ہو گئی۔ یہ کیا طرز تخاطب ہے۔ ادھر تخت پر آرام کرتی خواتین جیسے ہڑبڑا کر خواب خرگوش سے جاگ اٹھیں اور جو بیٹھی تھیں انہوں نے ہاتھوں کا چھجا بنا کر سامنے دیکھا اور ہنس دیں۔

"ائے ہے لو یہ تو اپنا جنید ہے۔ ارے اقبال میاں کا بیٹا۔ افوہ... اپنی سکندرہ کا لڑکا۔ ائے لو۔ ابھی تین دن پہلے ہی تو آیا ہے۔ ادھر آؤ بیٹا۔ میں تمہیں سب سے ملواؤں۔"

سفید لباس والی بزرگ خاتون جن کے دوپٹے پر چمکیلی گولڈن پٹی لگی ہوئی تھی، اشارے سے بلا رہی تھیں۔ وہ ان سے آنے کے بعد ملے تھے۔ مگر بھول گئے تھے کہ کیا رشتہ ہے۔ سٹپٹا کر تخت کے پاس پہنچے تو انہوں نے اشارے سے تخت پر بیٹھنے کا کہا۔ "آؤ بیٹا، میرے پاس بیٹھو۔"

وہ ڈرتے ڈرتے تخت کے کنارے پر ٹک گئے۔ خطرہ تھا کہ تخت اتنا مضبوط نظر نہیں آرہا تھا اور اس لیے بھی کہ پہلے ہی کئی بھاری بھرکم خواتین اس پر تشریف فرما تھیں۔ کہیں ان کے وزن سے بے چارہ تخت بیٹھ ہی نہ جائے۔

"یہ تو ہیں تمہاری چچی اور یہ ممانی... اور ان کو تو جانتے ہو گے۔ ائے بھئی یہ تمہاری دادی ہوتی ہیں رشتے میں اور میں نانی۔ سکندرہ کو گود میں کھلایا ہے میں نے اور اقبال تو ہمارے آنگن میں کھیل کر جوان ہوئے تھے اور تمہاری ایک بڑی بہن بھی تو ہیں۔ کہاں ہیں۔ بچے کتنے ہیں اللہ رکھے اور کسی بچے کی شادی بیاہ بھی ہوا کہ ابھی نہیں۔"

جنید میاں نے تابڑ توڑ سوالوں کے جواب پھو... سانسوں کے ساتھ دیے۔

"جی، جی وہیں ہیں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ یعنی کہ میں ان کے ساتھ رہتا ہوں۔ اچھی ہیں۔ چار بچے ہیں۔ شادی کسی کی نہیں ہوئی۔ ابھی پڑھ رہے ہیں سب۔"

"نانی جان! میرا تو انصاف کریں۔ یہ مجھے راشد کے نام سے چھیڑ رہے تھے۔ میرا مذاق کا رشتہ تو ہے نہیں۔" سمانہ صاحبہ پھر اڑیل ٹٹو کی طرح پیر زمین پر مار کر قدرے ٹھنک کر بولیں۔

"اے لڑکی! زیادہ بڑبڑ نہیں کرتے۔ چلو جاؤ جو تم سے کہا ہے، وہ کرو۔ ہم بتاتے ہیں جنید میاں کو۔ انہوں نے کسی سے کچھ سن لیا ہو گا۔ چلو جاؤ۔ ٹلو ادھر سے۔" بزرگ خاتون ڈپٹ کر بولیں۔ سمانہ صاحبہ واقعی وہاں سے فوراً" ٹل گئیں۔

"وہ... مجھے تو ضیا نے بتایا تھا۔" جنید جلدی سے صفائی پیش کرنے لگے۔ "میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔ یہ کون گانا گا رہا ہے۔ تو اس نے کہا سمانہ باجی۔ میں نے کہا کون سمانہ باجی۔ تو بولی۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ تو راشد بھائی کو کیا جانیں گے۔ بس نانی! اس لیے میں نے راشد صاحب کی خیریت پوچھ لی۔" اٹک اٹک کر جنید نے بات پوری کی۔

"اچھا یہ ضیا کی بچی کی کارستانی ہے۔ سچ تو ہے۔ بچہ کیا جانے، سمجھو۔ ابھی بلاتی ہوں اس ضیا کی بچی کو۔ بدذات کہیں کی۔"

"چھوڑیں خالہ جان وہ بچی تیز ہے ذرا۔ مگر کام کتنے کرتی ہے۔" ممانی ٹائپ خاتون چھالیہ کا پھنکا لگا کر بولیں۔

"ہاں خیر بیٹا! بات یہ ہے کہ یہ جو سمانہ ہے۔ یہ بھی اپنی ہی بچی ہے۔ تمہاری خالہ کی نند کی بیٹی ہے۔ نگوڑی کے ساتھ ایسا ہوا کہ عین شادی کے دن بارات آکر لوٹ گئی۔ کچھ مہر پر جھگڑا ہوا تھا۔ لو جی! وہ دن آج کا دن۔ بچاری لنڈوری پھر رہی ہے۔" نانی جان نے پاندان سے چونے کی چچی نکالی۔ زبان سے چاٹ کر پھر واپس رکھ دی۔

"اوہ!" جنید پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "مگر ضیا نے بتایا تھا کہ راشد صاحب ان کے شوہر ہیں۔" بے حد تاسف سے کہا۔

"ارے وہ راشد... وہ دوسرا قصہ ہے۔ نگوڑا وہ بھی اپنے خاندان کا لڑکا ہے۔ اس سے سمانہ کا بعد میں نکاح ہو گیا مگر یہ سمانہ... کم نہیں ہے۔ نکاح کے بعد فرمائشیں شروع کر دیں۔ بس وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ دوبئی جاکر طلاق بھیج دی بدذات نے۔"

"ارے!" وہ تقریباً" اچھل پڑے۔ مزید تاسف۔

"یہ کیسا ملک اور کیسا خاندان ہے جہاں مہندی کے دن دولہا شادی سے انکاری ہو جاتا ہے۔ بارات واپس چلی جاتی ہے۔ نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے طلاق۔ کس قدر بداخلاق معاشرہ ہے۔ لڑکیوں کی زندگی کو کھیل سمجھ کر جو مرضی کرتے رہو۔ افسوس ناک بلکہ شرمناک رویہ ہے۔ کیا لڑکیاں اتنی بے بس ہیں۔ کیا وہ انسان نہیں۔ ان کو اتنا ادنیٰ درجہ دیا ہوا ہے کہ جو چاہے دھتکارے۔ جب چاہے ٹھوکر مار دے اور یہ خاندانی لوگ کس طرح اس المیے کو چٹخارے لے کر بیان کر رہے ہیں۔ جیسے یہ عام سی بات ہے مذاق ہے۔ شاید یہاں اسے مذاق سمجھا گیا۔ اسی لیے تواتر سے ہوتا رہتا ہے۔ غور کرو تو کتنی اذیت ناک کہانی ہے۔ پتا نہیں اب بچاری نازی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کتنی معصوم سی ہے۔ کس قدر رونق، چہل پہل شادی کے نام پر ہو رہی ہے۔ اب کیا ہو گا۔ مہمانوں سے کیا کہا جائے گا۔"

"نانی، نانی جان! طاہرہ مامی کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ وہ بستر پر منہ لپیٹے پڑی ہیں۔ کہہ رہی ہیں۔ جس کا جو جی چاہے کرے۔ مجھے نہیں پتا۔"

یہ سمانہ تھی۔ جنید گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ "گھر والے کچھ کرتے کیوں نہیں۔"

"نانی! آپ چچا جان سے کہیے۔ کسی کو لڑکے والوں کے گھر بھیجیں۔ وہاں جاکر معلوم کر کے آئے۔" انہوں نے نانی سے کہا۔

"سچ کہتے ہو۔ کسی کو ان لوگوں سے بات کرنے کے

لیے جانا چاہیے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔ اچھا کہتی ہوں۔" وہ تخت سے اترنے لگیں تو جنید نے انہیں سہارا دے کر اتارا۔ سمانہ ابھی بھی جنید کو گھور رہی تھی۔ وہ گھبرا کر نانی کے ساتھ ہو لیے۔ سمانہ بھی ساتھ چل پڑی۔ نانی بے حد تیز رفتار نکلیں خلاف توقع۔ جنید اور سمانہ پیچھے رہ گئے۔ نانی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو جنید اور سمانہ ابھی چند قدم پیچھے تھے۔

"سنیے! آپ کو راشد کے بارے میں کس نے بتایا۔" سمانہ کی آواز کہیں دور سے سنائی دی۔ وہ رک گئے۔

"نیا نے" چور سے بن گئے۔

"اچھا فتنی نہ ہو تو۔" دانت کچکچائے۔

"آپ کی آواز... بہت اچھی ہے۔ سریلی اور لوچ دار اور وہ گانا تو بہت دلچسپ تھا۔ بندر یا والا۔" وہ تکلف کی دیوار گرانے میں کامیاب ہو گئے۔

"اچھا؟ آپ کی سمجھ میں آگیا۔ پسند آیا؟"

"ہاں اتنی اردو تو سمجھتا ہوں۔"

"کمال ہے۔ مگر راشد کو اس پر اعتراض تھا۔ ادھر ہر منگنی شادی پر لوگ مجھ سے گانے سننا چاہتے ہیں اور وہ کہتے تھے تم کیا ڈومنی ہو۔"

"ڈومنی کیا؟" خاک پلے نہ پڑا۔ "ویسے کیا صرف اتنی سی بات پر طلاق ہو گئی؟ نانی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ نے فرمائشیں شروع کر دیں۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اسی لیے طلاق دی۔"

اب انہیں اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی۔ برآمدے میں کرسیاں پڑی تھیں۔ دونوں ان پر بیٹھ گئے۔

"سب یہی سمجھتے ہیں۔" سمانہ کی آواز بھاری ہو گئی۔ "میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ جو لوگوں کی زبان پکڑیں۔ راشد ہے تو اسی خاندان کا۔ اور مرد جو فیصلہ کر لے۔ اس پر یقین کر لیتے ہیں لوگ۔ سنیے! کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ حق مانگنا، حق کے لیے ڈٹ جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔ عورت کو بس چپ چاپ سمجھوتا کر کے زندگی کی قربانی دے دینی چاہیے؟"

"حق مانگنا تو عین ایمان کی نشانی ہے۔" جنید میاں نے سر ہلایا۔ "مگر سنا ہے آپ نے کچھ غلط قسم کی فرمائشیں شروع کر دیں۔"

"ہوا یہ کہ... میں نے آئندہ زندگی کی مضبوطی کے لیے۔ راشد سے۔ بس اتنا کہا کہ شادی کے بعد کچھ عرصہ ہم الگ رہیں گے اور جب ہمارے درمیان ہم آہنگی ہو جائے گی۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے تو پھر میں سسرال میں رہوں گی سب کے ساتھ۔"

"اس سے کیا ہوتا؟"

"اصل میں... راشد کی ماں بہت تنگ دل ڈکٹیٹر قسم کی ہیں۔ وہ اپنے دو بڑے بیٹوں کی شادیاں کروا کے چند ماہ بعد ہی بیٹوں کو طلاق کے لیے مجبور کر کے بہوؤں کو گھر سے نکال چکی ہیں۔ انہیں اپنی راجدھانی میں دوسری عورت کا عمل دخل گوارا نہیں۔ لڑکے بہت فرماں بردار ہیں۔ میں نے راشد کو اس عمل سے بچنے کے لیے تجویز دی تھی کہ تین چار ماہ ہم دونوں الگ رہ کر ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے۔ اس دوران راشد کو مجھ سے محبت بھی ہو جائے گی۔ تو وہ ماں کو سمجھا لے گا میری حمایت کر کے۔ اس طرح میں گھر میں بس جاؤں گی۔ ہمارا گھر بچ جائے گا۔ مگر اس الٹی کھوپڑی کے بندے نے ماں کو بتا دیا کہ میں الگ رہنے کی فرمائش کر رہی ہوں۔ بس ادھر سے ماں نے کہا۔ دے طلاق اور وہ حکم کا غلام۔ مجھ سے بات تک نہ کی۔ حالانکہ میں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کس وجہ سے میں عارضی الگ رہنا چاہتی ہوں مگر... وہ پیٹ کا ہلکا جھٹ ماں سے جڑ دیا۔ ماں فٹ سے آگ بگولہ۔ چلو قصہ ختم۔ اب تینوں بھائی بغیر بیویوں کے چھڑے چھانٹ پھر رہے ہیں اور سنا ہے اپنے عمل پر پچھتا رہے ہیں۔"

"خیر! ان کی تو کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی۔"

"ایسے ہی ہو جائے گی۔ جی نہیں۔ ان کا واسطہ اب سمانہ سے پڑا ہے۔ میں ان کے گھر کی پل پل کی خبر رکھتی ہوں۔ ان کی ماں جب بھی کہیں لڑکی دیکھنے جاتی ہیں میں لڑکی والوں کو خبردار کر دیتی ہوں کہ شادی کے بعد بیٹی کی طلاق کے منتظر رہنا۔"

سمانہ پر جوش تھی۔ جنید حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ سمانہ ان پر دھاک بٹھانا چاہتی تھی۔ اپنی عقل کی۔

"بھئی یہ پاکستان ہے۔ آزاد ملک کے شہری ہیں ہم اور میں جو ہوں نا بے قصور سزا ملنے پر انتقام لینا جانتی ہوں۔ یہ حق ہے میرا۔"

یہ لڑکی انہیں حیران کیے جا رہی تھی۔

"اور یہ جاسوس کون ہیں جو ان کے گھر کی پل پل کی خبر دیتے ہیں؟"

"میری خبر رساں ایجنسی بہت اسٹرانگ ہے جی۔ ان لوگوں کے پڑوس میں رہتی ہے میری پکی دوست۔ راشد کے پڑوسیوں سے خاندانی تعلقات ہیں۔ راشد کی ماں جہاں جاتی ہیں۔ میری دوست کی ماں کو ساتھ لے جاتی ہیں۔ میری دوست مجھے خبر دے دیتی ہے۔ میں نئے پھنسنے والوں کو سارا کچا چٹھا سنا دیتی ہوں۔ وہ معلومات کراتے ہیں۔ سب سچ ہوتا ہے۔ بس بات ختم۔ تین جگہ ختم کرائی ہے۔"

"بہت خطرناک ہو تم۔" جنید کے منہ سے نکلا۔

"خطرناک نہیں۔ اب کچھ عقل آگئی ہے۔ پہلے بہت سیدھی سادی سی تھی مگر اب... میرا مستقبل اندھیروں کی نذر ہو گیا ہے تو کیا احتجاج بھی نہ کروں؟ کب تک منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی رہوں۔"

"کیا ڈالے؟" گردن آگے بڑھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" افسردگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"اب یہ ہے کہ کوئی مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوتا۔ راشد کے گھر والوں نے گل پھندنے لگا کر ایسا مجھے بدنام کیا ہے۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ ایک بھائی ہے۔ وہ بھی ناراض۔ بھابھی کو میرا وجود گوارا نہیں۔ کہاں جاؤں۔" بہت مایوس تھی بے چاری۔ غم زدہ ہرنی۔

"نہیں نہیں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ خوب صورت ہیں۔ ہو جائے گی آپ کی شادی کہیں نہ کہیں۔ مایوسی کی کیا بات ہے۔ کوئی کمی تو ہے نہیں آپ میں۔ لوگ بخوشی قبول کر لیں گے۔" تسلی دلاسا۔

"اچھا... تو پھر آپ ہی کر لیں مجھ سے شادی۔" بے دھڑک بولی۔

جنید نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگے۔ بلاشبہ خاصی حسین تھی۔ شوقین اور خوش مزاج بھی ہو گی کبھی مگر حالات نے...

اندر سے نانی نے انہیں پکارا۔ وہ اندر لپک گئے۔ سمانہ وہیں بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ مایوس اور دل گرفتہ۔

اندر جنید کی پیشی اور گواہی۔ فون کس کا تھا۔ کیا کہا گیا۔ دوبارہ انہوں نے حرف بہ حرف یعنی ایک ایک لفظ دہرایا۔ سب سر نیچا کر کے غور کرنے لگے۔ نانی نے کہا۔

"میں کہتی ہوں۔ کسی کو ان کے گھر بھیجو۔ فون بند ہے۔ راستے بھی بند کر دیے کیا انہوں نے۔ نوید کو بھیجو۔"

"اب تو بہت رات ہو گئی ہے۔ سب سو گئے ہوں گے۔" نوید نے کمزور سا بہانہ کیا۔ "صبح... صبح دیکھیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ رات کے دو بجے بھی کسی کو کیا تنگ کرنا۔" چچا جان رضامند۔

جنید حیران تھے۔ بھئی یہ کیسے صابر لوگ ہیں۔ انہیں تو فوراً وہاں جانا چاہیے تھا۔ ان پریشان کن حالات میں دو بجے رات کا بہانہ۔ وہاں بھی سب جاگ رہے ہوں گے۔ مہمان وہاں بھی ہوں گے۔ کون سوتا ہے شادی کے گھر میں جلدی اور لڑکے کے غائب ہونے کے بعد ماں باپ کی نیند تو خود ہی غائب ہو گئی ہو گی۔ جیسے یہاں سب جاگ رہے ہیں۔

وہ چڑ کر باہر آئے۔ سمانہ وہاں نہ تھی۔ وہ اوپر اپنے ٹھکانے پر آگئے۔ بستر پر لیٹ کر آپا کو کال ملائی۔

"آپا! یہاں ایک لڑکی مجھے پسند آگئی ہے۔ بہت خوب صورت شوخ چلبلی سی ہے۔ گاتی بھی بہت اچھا ہے۔ آواز بھی بے حد سریلی ہے۔ خاندان کی ہی ہے۔ کیا میں اس سے شادی کر لوں؟" سیدھا سوال تھا۔

جواب بھی فوری آگیا۔ "اپنے خاندان کی ہے؟ واہ

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ضرور کرلو اگر تمہیں پسند ہے تو۔ نکاح کے بعد کاغذات تیار کروالینا ویزے کے لیے۔ کچھ زیورات میرے پاس ہیں۔ بھیج دوں یا وہیں خرید لو۔ شادی کے لیے اچھے سے کپڑے اس لڑکی کی پسند سے لینا۔"

"شکریہ آپا! آپ بہت اچھی ہیں۔ بس اب انتظار کریں۔"

وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اب سمانہ کے لیے کس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ بھائی نہ جانے کون اور کہاں ہے۔ صبح شاہدہ باجی سے رابطہ کرکے سمانہ کے بھائی کا پوچھوں گا۔ بھئی واہ۔ یہ تو بڑا آسان نسخہ ہے۔ خوشی میں نیند غائب ہو گئی۔ سمانہ اچھی تو تھی لیکن مصیبت زدہ بھی تھی۔ غمزدہ اور بے سہارا۔ اس کا سہارا بننا ثواب بھی ہو گا۔ سمانہ نے خود ہی ان سے شادی کی فرمائش کی تھی۔ اس لڑکی کو مطالبات کی عادت تھی شاید۔ اچھی بات ہے۔ اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے۔ خوشیوں کے حصول کے لیے دل کی بات ظاہر کرنا۔ وہ آپا کی منظوری کے بغیر اس کے سامنے اقرار نہ کرسکے۔

دراصل آئے تو اسی مقصد کے لیے تھے۔ بلکہ بھیجے گئے تھے۔ آپا کی ایک رشتے کی نند کنواری بیٹھی۔ کسی کنیڈین یا امریکن رشتے کے انتظار میں۔ بھائی صاحب نے کہا کہ جنید انہیں جا کر دیکھیں۔ مل کر کوئی فیصلہ کریں۔ اگر پسند آجائے تو فوری شادی۔ دوسری صورت میں گوجرانوالہ میں بھائی صاحب کی سگی بڑی بہن رہتی ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ جو اچھی لگے۔ اس سے شادی کرلینا۔ میں خود آپا سے بات کرلوں گا۔ وہ انکار نہیں کریں گی۔

ادھر جنید کی آپا نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی سسرال کی کوئی لڑکی جنید کی بیوی بن کر آئے اور ان کے سینے پر مونگ دلے۔ انہیں یہ رشتے پسند نہ تھے۔ مگر بھائی صاحب کے اصرار پر جنید میاں مجبور ہو کر آ گئے۔

چچا جان کے گھر ہی ٹھہرنے کا پروگرام تو تھا مگر یہاں شادی کی گہما گہمی دیکھ کر پریشان بھی ہو گئے لیکن نوید نے انہیں تسلی دی اور اپنا کمرا بھی دے دیا۔ کوٹھی تو بہت ہی وسیع تھی۔ آٹھ دس بیڈ روم تھے۔ مہمان بھی آئے ہوئے تھے مگر۔۔۔ شادی سے پہلے تو اب وہ کہیں جا نہیں سکتے تھے لڑکی سے ملنے، نہ گوجرانوالہ۔ یوں بھی آپا کا خیال تھا کہ لاہور والی نند کی عمر زیادہ ہے۔ گوجرانوالہ والی بھانجیاں آفت کی پرکالہ ہوں گی۔ کیونکہ ان کے خیال میں چھوٹے شہر کی رہائشی لڑکیاں بڑے شہر میں آکر دیدہ ہوائی ہو جاتی ہیں۔ بہرحال اب تو انہوں نے سمانہ کے لیے اقرار کرلیا تھا۔ بخوشی۔ تقریباً" صبح کو نیند آئی۔ دیر سے آنکھ کھلی۔ نوید اپنی الماری کھولے کھٹر پٹر کر رہا تھا۔

"کیا ہوا نوید! تم ہو آئے نازی کی سسرال سے؟" وہ کہنی کے بل بیڈ پر بیٹھے یا لیٹے تھے۔

"لو کہاں ابھی تو سو کر اٹھا ہوں اور امی نے منع کردیا ہے۔"

جنید میاں کی کہنیاں لچک گئیں۔ دھپ سے بستر پر گرے۔ "کیوں؟" حیرت کی زیادتی۔ حواس باختہ ہو گئے۔

"امی نے کہا۔ ان لوگوں کو خود آنا چاہیے تھا معذرت کے لیے۔ فون کھڑکا دیا۔ جیسے ہم اتنے گرے پڑے دھوبی جلاہے یا پتا نہیں کیا ہیں۔ پہل ادھر سے ہوئی ہے۔ وہی کم ذات ہیں۔"

تفصیلی بیان، جنید کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ارے کیسے اللہ توکلی لوگ ہیں۔ کسی کو اپنی بیٹی بہن کی زندگی کا خیال نہیں۔ کیا نازی بھی سمانہ کی طرح۔۔۔

"فون کرکے دیکھا تھا؟"

"کیا تھا، بند تھا یا پھر خراب۔"

"ایکسچینج سے۔۔۔ مطلب کمپلینٹ کرو۔ اگر خراب ہوا تو۔"

نوید نے مڑ کر حیرت سے انہیں دیکھا۔ "کیا؟ وہ بھی ہم کریں؟ ان کا گھر بھی مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی بھی کرسکتا ہے۔ گھر والے گھر سے باہر جا کر بھی یہ کام کرسکتے ہیں مگر میرا خیال ہے انہوں نے اسی مقصد سے بند کیا ہوا ہے کہ یہاں سے بات نہ ہوسکے۔"

"ایک ہی شہر ہے۔ اب کیا وہ گھر بھی چھوڑ گئے ہوں گے۔ جانتے تو ہوں گے کہ یہاں سے کوئی دریافت حال کے لیے جا سکتا ہے۔ (جو کہ نہیں جا رہا)"

"اگر یہاں سے کوئی گیا بھی تو یقین ہے گھر کے افراد اندر گھس کر بیٹھ جائیں گے۔ ملے گا کوئی نہیں۔ پھر کیا ہم دیواروں سے سر پھوڑنے جائیں؟" کس قدر پریقین ہیں سب۔ وہ بستر چھوڑ کر اٹھ گئے۔ واش روم سے نکلے تو دیکھا۔ ضیا ان کا ناشتا لائی تھی۔

"ارے میں نیچے آجاتا۔ سب کے ساتھ ناشتا کر لیتا۔"

"سب کے ساتھ۔ کس کے ساتھ۔" ضیا منہ بنا کر بولی۔ "سب سو رہے ہیں۔ جو اٹھتا ہے، وہ چائے بنا کر پی لیتا ہے۔ نوید بھائی نے بتایا کہ آپ جاگ گئے ہیں تو باجی نے آپ کے لیے ناشتا بھیجا ہے۔"

"باجی شاہدہ نے؟ نہ جانے خود بھی کچھ کھایا پیا ہے انہوں نے کہ نہیں۔ کتنی غمزدہ اور پریشان تھیں رات کو بے چاری۔"

"خا، خا، خا۔" مضحکہ اڑانے والی مصنوعی ہنسی۔ "وہ تو صبح سے کئی دفعہ کھا پی چکی ہیں۔ پہلے بسکٹ اور چائے پھر آملیٹ بنا کر توس مکھن کھایا۔ اب گرم گرم نان کباب منگائے ہیں تو وہ کھا رہی ہیں۔" ضیا خاصی ہنسوڑ تھی۔

اب جنید نے ٹرے پر نظر ڈالی۔ نان کباب۔ چائے اور چند بسکٹ۔

"اچھا آؤ۔ تم میرے ساتھ ناشتا کرلو۔ میں اتنا نہیں کھا سکوں گا۔"

"نہیں جی۔ بسم اللہ کریں۔ میرا تو پیٹ فل ہے۔"

"تم نے کیا کھا لیا۔"

"یہی نان کباب۔ حلوہ پوری۔"

"حلوہ پوری؟" ٹرے میں ایسا کوئی ذکر نہ تھا۔

"پہلے حلوہ پوری منگائی تھیں۔ وہ مہمانوں نے چٹ کرلیں۔ اب نان کباب منگائے ہیں۔" جنید حیرت کے سمندر میں غرقاب۔ یعنی ان پریشان کن حالات میں یہ خاطریں۔

"اچھا۔ تمہاری سمانہ باجی نے بھی کچھ کھایا کہ نہیں۔"

"ہاں تھوڑا تھوڑا۔"

"تھوڑا تھوڑا کیوں۔" جنید چائے انڈیل رہے تھے کپ میں۔

"باجی نے کہا تم موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ کم کھایا کرو۔ ورنہ کون تم سے شادی کرے گا۔ تو انہوں نے بس نان کباب اور تھوڑا سا حلوہ پوری کھا کر بس کر دیا۔ بسکٹوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔" ضیا خاصی خبر رساں ایجنسی تھی۔

"اچھا۔ نازی نے بھی کچھ کھایا۔"

"وہ تو سو رہی ہیں۔ رات بھر جاگتی رہی تھیں اس لیے۔"

"ہاں بے چاری۔ روتی رہی ہو گی رات بھر۔۔۔"

"لو جی۔ وہ کیوں روئیں۔ روئیں ان کے دشمن۔ وہ تو رات بھر شرجیل بھائی کو برا بھلا کہتی رہیں۔ کوستی رہیں کہ خدا کرے شرجیل کو کالی موٹی بھینگی لنگڑی دلہن ملے۔ اس کا کبھی گھر نہ بسے۔ روتا رہے ساری عمر۔ خوشیوں کو ترسے۔" بیان میں خاصی روانی تھی۔

جنید کا دل عجب طرح سے دھڑکا۔ نان کباب حلق میں پھنسنے لگے۔ بسکٹ کھا کر چائے پی لی۔ کیسے لوگ ہیں سارے بے حس، بے خبر، بے نیاز، صابر یا انتہا درجے کے لاپروا۔

"تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں نیچے۔" دل گرفتی سے بولے۔

"ارے۔۔۔ آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ آدھا کباب دو لقمے نان کے باجی ناراض ہوں گی کہ میں نے باتوں میں لگا کر آپ کی بھوک ماردی ہو گی۔"

"نہیں بس۔ دل نہیں چاہ رہا۔"

"تو میں ٹرے لے جاؤں؟" کہہ کر ٹرے اٹھالی۔ ایک نان ہاتھ میں دبوچا، پورا کباب منہ میں بھر لیا پھر مٹکتی ہوئی چلی گئی۔ فل پیٹ کے بعد۔۔۔ بے چاری

کام بھی تو بہت کرتی ہے۔ چلتے پھرتے اترتے چڑھتے کھانا ہضم ہو جاتا ہو گا۔ انہوں نے اسے بری کر دیا۔

سمانہ کا خیال آیا۔ نازی کا حال بھی کیا سمانہ جیسا ہو گا؟ یہ لوگ سوچتے ہی نہیں۔ انسان کوشش تو کرتا ہے۔ یہاں تو کوشش نام کا کوئی پرندہ پر نہیں مار رہا۔ نیچے ٹھما ٹھمی جوں کی توں موجود۔ مہمان میزبان سب باتوں میں مگن۔ نہ جانے اس گھر میں کتنے لوگ رہائش پزیر تھے اور کتنے مہمان۔ ان کی نظریں سمانہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

پھر نظر آ ہی گئی۔ سوئی دھاگا لیے نہ جانے کیا سی رہی تھی۔ وہ برآمدے میں ڈٹ گئے اور لوگوں کی مصروفیت دیکھنے لگے۔ کوئی ادھر سے ادھر' کوئی یہاں سے وہاں جاتا آتا نظر آ رہا تھا۔ بس پھر یوں ہی نظریں سمانہ پر ٹک گئیں۔ سمانہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی نظریں اپنے سوال کا جواب مانگ رہی تھیں۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے۔ آپا نے "ہاں" کر دی ہے کیسے بتائیں۔ خیر باہر آئے گی تو بتا دیں گے۔ اس نے کاسنی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنا ہوا تھا۔ کاسنی دوپٹے کے ہالے میں چہرہ چمک رہا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ وہ خاصی خوب صورت لگ رہی تھی۔ بغیر میک اپ کے سادہ بے ریا چہرہ۔ کل کے مقابلے میں آج زیادہ اچھی لگی۔ زنازن سلائی کر رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ بہت مضبوط کردار کی بہادر لڑکی جو اپنے برے حالات میں بھی خوش رہتی ہے اور لوگوں کو خوش کرتی ہے۔

نانی جان اس سے باتیں کر رہی تھیں' غالباً" نصیحتیں۔ ابھی اس کے باہر آنے کے امکان کم تھے۔ وہ نازی کے کمرے کی طرف آ گئے۔ دستک دے کر اجازت طلب کر کے اندر آ گئے۔ نازی جاگ رہی تھی۔ چہرہ ستا ہوا۔ رنگ اڑا ہوا۔ لاکھ برا بھلا کہتی رہی ہو گی مگر روئی بھی ہو گی۔ کمزور لگ رہی تھی۔ رنگت تو زرد تھی ہی' بیمار بیمار سی سوگوار حسینہ۔

"تم نے پھر کوشش کی؟ اپنے منگیتر کیا نام۔۔۔ اس سے بات ہوئی؟"

"ہاں کرتی رہی۔ بدذات نے فون بند کیا ہوا تھا۔ مردود' الو کا پٹھا' کبھی کہیں ملا تو منہ نوچ لوں گی۔ بلکہ اس کے گھر جا کر یا پھر یونیورسٹی جا کر اچھی طرح درگت بناؤں گی۔ پھر چین ملے گا۔ چین ملے یا نہ ملے۔ مگر اس کے اسٹوڈنٹ بھی اس کا منہ کالا ہوتا دیکھیں۔ فلاسفی پڑھاتا ہے اور انگلش لٹریچر بھی۔ سب ناک کے رستے انگلش میں فلاسفی نکلے گی۔ جب کالا پینٹ اس کے منہ پر اسپرے کروں گی۔ جیسا ایک دل جلے وکیل نے دوسرے وکیل کے منہ پر کیا تھا کالے پینٹ کا اسپرے۔"

وہ جل بھن کر کوئلہ بنی جا رہی تھی۔ جنید زبان کی روانی اور بے ساختگی پر منہ کھولے ہونق بنے اسے دیکھ رہے تھے۔ کوئی شک نہیں' پاکستانی نئی نسل کی لڑکیاں اپنی ذلت کا انتقام لینا خوب جانتی تھیں۔

"مگر وہ پینٹ ملے گا کہاں تمہیں؟" انہوں نے اس مشکل مرحلے کی طرف اشارہ کیا۔

"کوشش کریں تو کیا ہو نہیں سکتا۔ مل جائے گا۔ میں نے رات اکرم کو فون کیا تھا۔ اس کے گھر پر پینٹ ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے ایک کمرے کو ڈارک روم بنایا ہے۔ اس میں کالا پینٹ ہو رہا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ بچا رکھا ہے۔ لے لینا۔ اکرم فوٹو گرافر ہے۔ ہم لوگ اس کے اسٹوڈیو میں ہی فوٹو بنواتے ہیں۔ شادی مہندی کے لیے اسے ہی بک کیا ہے۔"

تفصیل روانی اور غم و غصہ۔۔۔ باجی شاہدہ اندر آئیں نازی کو ڈانٹنے لگیں۔

"تم ابھی تک سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی ہو۔ اٹھو ناشتہ کرو۔ نہا کر کپڑے بدلو۔ غضب خدا کا دوپہر کا ایک بجنے کو ہے اور جنید! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

جنید نے باہر نکلنے میں ان کی تقلید کی۔ "جی باجی! کہیے۔"

"میرے کمرے میں آؤ ذرا۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور ایک کمرے میں گھس گئیں۔ جنید نے پہلی بار ان کا کمرا دیکھا۔ خوب سجا ہوا' بے حد قیمتی پردے کھڑکیوں کی زینت بنے ہوئے۔ قیمتی قالین' جگہ جگہ بلوری یا چینی ڈیکوریشن کا سامان۔ لمبے نیلے گلدان کونوں میں نقلی خوب صورت پھولوں کو آغوش میں لیے بیٹھے تھے۔ باجی شاہدہ کی فیملی کی تصاویر سے سجی دیواریں۔ بیڈ پر مخملی خوش رنگ بیڈ شیٹ تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"جنید! تم کو نازی سے ہمدردی تو ہے نا۔ تب ہی اتنی فکر کر رہے ہو۔ میں اگر تم سے کہوں۔ آج مہندی کا فنکشن اسی طرح ہو جیسا کہ ہونا تھا۔ یعنی جیسا طے تھا۔" پراسرار انداز میں بولیں۔

"جی؟ کیسے؟ مگر۔۔۔ کیا؟" وہ کچھ دیر پہلے نازی کی تقریر سن کر جس طرح ہونق بنے تھے۔ باجی شاہدہ کی بات پر اسی طرح ہکا بکا ہو گئے۔ کیا لڑکے والوں سے بات ہو گئی۔ سوچ کر رہ گئے۔

"ایسے کہ تم نازی سے شادی کر لو۔ نہ کسی سے کچھ کہنا پڑے گا نہ رسوائی نہ شرمندگی۔ امی بھی اس بات پر راضی ہیں اور خاندان میں تو ایسا ہو بھی جاتا ہے۔"

(سمانہ کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوا) مگر بول نہ سکے۔ منہ کھول کر رہ گئے۔ احمقوں کے سردار۔

"اس میں کوئی برائی نہیں۔ بلکہ بہتر ہی ہے۔ تمہیں بھی آخر کبھی شادی کرنی ہی ہے۔ ابا امی رات بھر سوئے نہیں۔ تم ہو' جوان کی فکر دور کر سکتے ہو۔ پلیز ایک بے قصور لڑکی کی زندگی کا سوال ہے۔ میں تم سے نازی کی خوشیوں کی بھیک مانگ رہی ہوں۔" رونے لگیں۔

"لیکن میں تو۔۔۔ آپا نے۔۔۔" بولا نہ گیا۔

"میں آپا سے بھی اجازت لے لوں گی۔ خاندان کی بدنامی کا سوچو۔"

وہ سمانہ کو سوچ رہے تھے۔ ابھی اس سے اقرار کرنا تھا۔ آپا کی اجازت اور یہ باجی شاہدہ۔۔۔

"کیا وہاں سے کوئی خبر آئی ہے؟"

"ارے چھوڑو وہاں کی بات۔ وہ لوگ گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے ہیں۔ تو ہم بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ ہماری تو عزت خاک میں مل رہی ہے۔ بدنامی رسوائی۔ لڑکی کی زندگی۔ تم اپنی بات کرو۔"

"باجی! ایک بار ان لوگوں سے بات تو کر لیں۔ صرف کسی نامعلوم فون کال پر۔۔۔ اتنا بڑا فیصلہ۔۔۔ پلیز ایک بار۔۔۔" گھگھیانے لگے۔ گونگے کا گڑ کیا؟

"ارے ان لوگوں کے صبح شام دس فون آتے تھے صلاح مشورے یہ وہ۔۔۔ شرجیل کے کئی فون آتے تھے۔ اب کل سے سناٹا ہے۔ اس کا مطلب؟"

"ہو سکتا ہے فون خراب ہو۔" (گونگے کا گڑ کھانے کے بعد شاید)

"تو' سارے لوگوں کے فون خراب ہو گئے۔ اس سڑیل شرجیل کا فون کیوں بند ہے۔ تم بتاؤ! کیا تمہیں نازی پسند نہیں۔ دیکھو! مفت میں دلہن مل رہی ہے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ اس سے زیادہ حسین لڑکی کہاں ملے گی بھلا۔ سوچ لو۔"

"میں کیا کہوں۔" سمانہ نگاہوں میں' دل میں سما چکی ہے۔ روح میں بس گئی ہے۔ اس نے خود خواہش۔۔۔ کیا کروں؟

"غور کر لو اچھی طرح۔ ورنہ پھر ایک رشتہ اور ہے میرا دیور جو پولیو کا مریض ہے۔ لنگڑاتا ہے بچارا۔ میرے میاں کا تقاضا ہے کہ آج اسی سے نکاح ہو جائے۔ نازی کی قسمت پھوٹ جائے گی اگر اس سے۔۔۔ تمہارے سوا اور کوئی ہے بھی نہیں۔ بس وہی لنگڑا ہے۔"

جنید میاں کے سر پر ہتھوڑا لگتا تو اتنی اذیت نہ ہوتی۔ نازی۔۔۔ وہ نازک پھولوں کی ڈالی لنگڑا۔ منہ سے سسکاری سی نکلی۔

"ہاں۔" بہت غم ناک شکل بنا کر گردن نیچی کر کے بولیں۔ "ہاں پولیو کی وجہ سے لنگڑاتا ہے۔ لکڑی کے سہارے ٹیڑھا ٹیڑھا چلتا ہے۔ کوئی رشتہ ملتا ہی نہیں اسے۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ میں نے تمہارا سوچا۔ امی ابا سے ذکر کیا۔ وہ مان گئے۔"

جنید ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگے۔ اتنا کچھ ہو گیا۔ سب نے پروگرام بنا لیے اور وہ خود سمانہ کے تصور میں گم رہے۔ انہوں نے نظریں گھما کر پورے کمرے کا

جائزہ لیا۔ قیمتی نہیں' بیش قیمت سامان سے آراستہ باجی شاہدہ خود۔ سونے کے زیورات میں بلکہ ڈائمنڈ کے سیٹ سے آراستہ۔ ان کے شوہر اعلا درجے کے سرکاری افسر..... وہ پولیو زدہ بھائی کا علاج کیوں نہ کرا سکے۔ لکڑی کی مصنوعی ٹانگ ہی لگوا دیتے۔ اس بے چارے کو لکڑی کے سہارے نہ چلنا پڑتا۔ کیا یہاں لوگوں میں حقوق العباد' حقوق اللہ کا جذبہ ختم ہو گیا۔ اقربا پروری کی مثال باقی نہیں رہی۔ زندگیوں میں اتنا فرق۔ ایسی پستی۔ ایسی بلندی۔

"یہ مہندی اب بھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سب کچھ۔ نازی کی زندگی کا یہ غم تمہارے ہاں کہنے سے ..... خوشیوں میں بدل سکتا ہے۔" وہ گردن نیچی کیے بولے جا رہی تھیں۔

"نا..... نازی سے..... آپ نے پوچھا؟" حلق بند ہوتا جا رہا تھا جیسے۔

"اسے میں سنبھال لوں گی۔ وہ لنگڑے سے شادی پر..... آمادہ تو نہیں ہو گی لیکن تمہارے انکار کے بعد ..... تو پھر یہی کرنا پڑے گا۔ زبردستی۔"

وہ نظر نہ آنے والے دھاگے بستر سے نوچنے کی تگ و دو میں تھیں بظاہر۔ لوگ بلاوجہ دوسروں سے توقع وابستہ کر لیتے ہیں۔ وہ متاسف اور متامل تھے۔

"پھر..... ابا سے کیا کہوں۔ بھتیجے ہو' اس لیے وہ راضی ہو گئے۔" وہ پر امید نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

جنید کشمکش میں تھے۔ ایک طرف وہ چاہتے تھے۔ کوئی شرجیل یا اس کے ماں باپ سے مل کر تصدیق تو کر لے دوسری طرف سمانہ کی پر امید خواہش۔ جنید کے جواب پر اس کی زندگی کی خوشیوں کا دارومدار تھا مگر وہ ایک مضبوط قوت ارادی والی باحوصلہ لڑکی ہے اور نہ جانے کتنی مایوسیوں سے نبرد آزما رہی لیکن ہاری نہیں تھکی نہیں۔

اور نازی..... اس کی اتری ہوئی روئی ہوئی صورت معصوم ارادے' انتقامی بچکانہ جذبہ' بدنامی اور عرصہ دراز تک شادی نہ ہونے کا' سمانہ کی طرح لنڈوری پھرنے کا خدشہ..... نہ جانے سمانہ پر بارات واپس جانے سے کیا گزری ہو گی' جواب نازی کے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ خوف ناک بلکہ خطرناک صورت حال تھی۔ ابا کو لڑکی کا نام پتا کچھ بتایا نہ تھا۔ وہ تو نندوں سے پیچھا چھوٹنے کی خوشی میں فوری رضامند ہو گئی تھیں۔ اور ..... ادھر نازی پھولوں کی ڈالی۔ لنگڑے کی لکڑی کا سہارا اور وہ خود.....

شرمناک صورت حال تھی۔ ان کا جذبہ ہمدردی۔ کسی کے کام آنے کی خواہش..... وہ مجبور ہو گئے۔ باجی شاہدہ خوشی کا نعرہ لگا کر ان سے لپٹ گئیں۔ مبارک باد دی اور باہر بھاگ گئیں سب کو خوش خبری سنانے جنید کو محسوس ہوا' وہ خالی ہاتھ رہ گئے۔ دل بھی خالی ہو گیا۔ کوئی امنگ نہ خوشی۔ مجبوری' ہمدردانہ مجبوری۔ تکان سی ہوئی۔ بستر پر ہی گر گئے۔ مخملی نرم بستر..... یہ کیا ہو گیا اور کیا ہونے والا ہے ان کے ساتھ ..... نازی کے ساتھ زندگی کا تصور عجیب..... وہ ان سے بھی خلاف مرضی کچھ ہونے پر انتقام لے سکتی ہے۔ ان کے منہ پر سیاہ پینٹ اسپرے کر سکتی ہے۔ وہ ..... گھبرا کر اٹھے باہر آئے باجی سامنے سے چلی آ رہی تھیں افتاں و خیزاں۔

"چلو اب تم کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر لینا۔ شام سے مہندی کا ہنگامہ شروع ہو گا رات گئے تک۔ آرام کا موقع نہیں ملے گا۔ کھانا شروع ہونے والا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" بے چارگی۔

"ہاں۔ ناشتا خاصا ہیوی تھا۔ چلو وہ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

بتا نہ سکے۔ ناشتا کیا ہی کب تھا مگر..... چونک گئے۔

"کو..... کون ملنا چاہتے ہیں۔"

"ہمارے مرد رشتے دار۔ جو آئے ہوئے ہیں۔"

"میں سب سے مل چکا ہوں۔" بے زاری۔

"او ہو نئے رشتے' نئے تعلق سے بھئی۔" زبردستی۔

اب نازی کے پاس جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا

نہ جانے کیا سلوک کرے گی۔ کوئی چیز اٹھا کر دے ماری تو۔ لاؤنج سے سمانہ نکلی۔ بے خیالی میں ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نرم نرم اداسی تھی۔

"آ..... آپ نے..... میں نے سنا ہے۔ آپ نازی سے..... شادی پر..... راضی ہیں۔" کلیجے میں پھانس چبھی تھی۔ دل سے ہوک اٹھی۔

"سوری۔ سمانہ! میں اس وقت آپ کو جواب نہ دے سکا۔ لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ صبح پہلا کام آپ کو اپنی رضامندی دے کر اپنی پسند کا اقرار کروں گا آپ مجھے بہت پسند آئی ہیں۔ آپ کے کردار کی مضبوطی۔ ہمت اور مگر میں شاہدہ باجی کو..... انکار نہ کر سکا۔"

بہت دل گرفتی سے بول کر اسے دیکھا۔ وہ اداسی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ بہرحال مجھے یاد رہے گا کہ کسی نے مجھے پسند کیا تھا میری بری شہرت کے باوجود..... میں بہت قناعت پسند ہوں۔ اور میرا اللہ اور تقدیر پر پورا یقین ہے۔ ہر انسان کو اس کے ظرف کے مطابق انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ میں ابھی بھی تقدیر کی مہربانی کی منتظر ہوں۔ میں نہ سہی' نازی سہی۔ میں تو تقدیر کے اس وار کو بہادری سے سہ رہی ہوں۔ شاید نازی نہ پائی۔ سب کی لاڈلی جو ٹھہری نازک' آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ میرے دل میں آپ کی قدر اور بڑھ گئی۔ جو میرا نصیب ہو گا۔ کبھی نہ کبھی مل جائے گا۔ ناامید نہیں ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے پسند کیا۔"

وہ روانی سے بول رہی تھی۔ جنید بڑے صبر سے سن رہے تھے۔ اس کی ایک اور خوبی سے آگہی ہوئی۔ اس کی آواز و لہجہ اس کے کہے ہوئے الفاظ کی سچائی کے گواہ تھے۔ کہیں کوئی جھول نہ تھا۔ نہ رقت' نہ کپکپاہٹ۔ وہ مڑ کر لاؤنج میں چلی گئی۔

جنید کی اپنی پلکیں نم ہو گئیں۔ ہمدرد اور حقیقت پسند لڑکی۔ ان کے دل میں اس کی قدر اور گہری ہو گئی۔ چپ چاپ اوپر کمرے میں آ گئے۔ جو دراصل نوید کا تھا۔ چچی جان کے بقول۔ "نوید کے تو سونے کا کوئی ٹائم ہے۔ نہ کھانے پینے کا۔ نہ جاگنے کا۔ جب جہاں جگہ مل جاتی ہے' سو جاتا ہے۔ جب بھوک لگی' کچھ بھی کھا لیتا ہے۔ اس کی وجہ سے تم البتہ ڈسٹرب ہو جاؤ گے۔ اس لیے بستر پہ آرام سے رہو۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ نوید بہن کی شادی کے ہر معاملے میں پیش پیش بے حد مصروف تھا۔ اسے تو کمرے میں آنے کی مہلت ملتی نہ تھی۔ بس کپڑوں کی تلاشی میں آتا تھا۔ جنید کو یہ تنہائی غنیمت لگی۔ وہ بستر پر لیٹ گئے۔ جسم و جاں میں عجب طرح کی سنسناہٹ تھی۔ سوچنے یا کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ ورنہ اپنے کپڑے ہی استری کر لیتے۔ جو ہمیشہ خود ہی کرتے تھے۔ چچی جان کے کہنے کے باوجود ضیا کو نہیں دیتے تھے۔ سمانہ کو اپنی پسند بتا دی۔ محبت کا اظہار نہ کر سکے۔ واقعی ان کے دل اندر کہیں گہرائی میں سمانہ بڑی شان سے براجمان تھی۔ مگر اب اسے یہ بتانا..... وقت کا ضیاع ہی تھا۔

ابا سے اجازت لینے کے بعد سمانہ ان کے خواب میں شریک زندگی کے روپ میں نظر آئی۔ چند گھنٹے کی نیند اور چند منٹوں کے خواب۔ کاش.....! وہ باجی شاہدہ کو بتا دیتے۔ لیکن نازی اور لکڑی کے سہارے لڑکھڑاتا پولیو زدہ..... اوہ تو! گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

"بھائی جان جنید! آپ کو نیچے کھانے کے لیے بلا رہے ہیں۔" ضیا تھی۔

"اُفوہ جو حالات ہوں۔ جیسا وقت ہو۔ کھانے پینے کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔"

ان کی تو بھوک اڑ چکی تھی۔ مگر نیچے والوں کو تو اب اطمینان ہو گیا تھا۔ نیچے آ گئے۔ بھوک نہ ہونے کا عذر کیا مگر کسی نے مانا نہیں۔ زبردستی کھلایا گیا..... لذیذ تھا شوق سے کھا لیا۔ واہ بھئی۔

پھر نوید ایک شلوار قمیص لے آیا۔ "یہ آج شام کے فنکشن میں تم پہنو گے۔ تمہارے پاس تو شلوار قمیص ہو گا نہیں۔ اور ہاں ذرا جلدی تیار ہو جانا۔"

کہہ کر سوٹ وہیں کرسی پر رکھ کر وہ مصروف ترین

صاحب فورا" کہیں چل پڑے۔ جنید نے اس پر عمل کیا۔ یعنی نہا کر لباس تبدیل کر کے نیچے آگئے۔ وہاں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ خواتین نے گلے لگایا۔ دعائیں دیں۔ اس قسم کی کہ وہ تا زندگی دودھ میں نہائیں اور اولاد کسی پھل کی صورت ملے۔ دودھ سے نہلانے کا تصور خاصا اندوہناک تھا۔ یعنی کہ مسلسل چپ چپ۔ دہی کی بو اور مکھیوں کی یلغار۔ متلی ہونے لگی۔ نوید کہیں سے تھکا ہوا آیا تھا۔ پوچھنے پر کہنے لگا۔

"مارکیٹ.... باجی شاہدہ کے ساتھ۔ تمہارے لیے کل پہننے کا کرتا پاجامہ اور شیروانی سینے کا آرڈر دے کر آئے ہیں۔ کل شام کو لینے جانا ہوگا۔ باجی کے ساتھ مارکیٹ جانا ایسا ہی تھکانے والا سفر ہوتا ہے کہ بندہ فوت ہونے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔"

وہ بھی نہانے کے لیے چلا گیا مگر بہت جلدی نہا کر آگیا۔

"چلو۔ اب لان میں ہی چلتے ہیں۔ اسٹیج تیار ہے۔ دیکھنا کیا بمباسٹک سجاوٹ کی ہے میں نے اور میرے دوست نجم نے۔"

دونوں لان میں آئے۔ واقعی لان کی تو شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ شامیانے، قناتیں۔ گیندے اور گلاب کے پھولوں کے ہار جا بجا لٹکے ہوئے تھے۔ داخلے کے لیے بہت ہی خوب صورت آرائشی گیٹ جو سبز پتوں اور زرد پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر قطار در قطار پھولوں کی لڑیاں۔ سبز قالین پر سرخ صوفے۔ روشنیوں کی چکاچوند۔ یہ مہندی کا اہتمام ہے تو شادی پر نہ جانے کس طرح کی آرائش ہوگی۔ بلا ضرورت اخراجات.... گیٹ سے اسٹیج تک لان میں تین لائنیں کرسیوں کی تھیں۔ تین تین کرسیوں کی قطار درمیان میں پیدل چلنے والوں کے لیے سرخ قالینوں کی روش۔

نوید داد طلب نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوتی۔ جنید نے شاباشی دی۔

دونوں اسٹیج پر جا بیٹھے۔ برقی قمقمے الگ رونق کا سبب تھے۔ گو کہ ابھی رات نہیں آئی تھی مگر لائٹیں سب آن کر دی گئیں۔ پھر خواتین آنا شروع ہوئیں اور کرسیاں بھرنے لگیں۔ پھر گانے والی لڑکیاں ڈھولک لے کر آگئیں اور اسٹیج کے سامنے جگہ بنانے لگیں۔ ڈانس پارٹی نے بھی گانے والیوں کے مقابل جگہ بنائی۔ باجی شاہدہ گھر کے اندر موجود خواتین اور چچی جان کے ہمراہ آرائشی گیٹ سے گزر کر اندر آنے لگیں۔

فوٹو گرافر.... اکرم پارٹی سمیت آگیا۔ لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا۔

گاؤ مبارک بادی مائی جم جم نت نت....

میرے جنید کی شادی مائی جم جم نت نت....

ضیا کی آواز سب میں نمایاں تھی۔ سمانہ.... وہ کہیں نہ تھی۔ ڈانس پارٹی اپنی گرو سے ہدایات لے رہی تھی کب جھکنا ہے۔ کب مڑنا ہے۔ کب ہاتھ بلند کرنے ہیں۔

سمانہ نظر آگئی۔ وہ سیدھے ہاتھ والی رو میں پیچھے بیٹھی تھی۔ خاموش، غمگین خزاں رسیدہ پتے کی مانند مرجھائی ہوئی۔ اس نے پیلے اور سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ خزاں اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی شاید اس نے بھی جنید کے خواب دیکھے تھے۔

جنید افسردگی سے اپنے ہاتھ کھول کر لکیریں دیکھنے لگے۔ لکیروں کا جال تھا۔ کیا تھا ان لکیروں میں؟ ایک بار کسی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔

"خوش قسمتی آپ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ آپ من پسند زندگی گزاریں گے اپنی پسندیدہ ہستی کے ساتھ۔"

خوش قسمتی؟ یا بے چینی۔ وہ اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ جو تقدیر ان کے ساتھ کر رہی تھی۔ جو پسندیدہ ہستی تھی۔ وہ دور جاتی نظر آرہی تھی۔

اور نازی.... جس کی شادی خانہ آبادی کی تقریبات میں شرکت کے لیے نوید نے انہیں روکا تھا۔ آج وہ اسی کے ساتھ شادی پر مجبور ہیں۔ کیا یہ تقدیر کا اشارہ ہے۔ کیا اس کے لیے وہ عین اسی موقع پر کینیڈا سے آئے تھے۔ سجے ہوئے اسٹیج پر براجمان۔ دولہا کے روپ میں۔

باجی شاہدہ اور چچی جان اسٹیج پر آکر جنید کو گلے لگا کر دعائیں دے رہی تھیں۔ ان کی دعاؤں میں معذرت اور تشکر کے جذبات موجود تھے۔ جنید کو بہت شرم آئی جب چچی جان نے ان کا شکریہ ادا کیا بدنامی سے بچانے کا۔ نوید نے جنید کے دائیں جانب والے صوفے پر چچی جان کو بٹھا دیا۔ نوید خود نہ جانے کس کس کو کیا کیا ہدایات دے رہا تھا۔ پھر آرائشی گیٹ پر فوٹو گرافر دوڑے۔ دلہن اپنی کزنز اور سہیلیوں کے جلو میں سرخ سبز اور زرد رنگ کے لباس میں ہولے ہولے گیٹ سے درمیانی روش پر آئی۔ اس کی سہیلیاں ہولے ہولے کچھ گاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ادھر سامنے گانے والی پارٹی نے جوشیلے انداز میں گانا شروع کیا۔ ڈانس پارٹی نے حرکت کی۔ لڈی شروع ہوگئی۔

لڈی ہے جمالو....

پھولوں سے ڈھکی چھڑیاں لڑکیوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر مخصوص آواز پیدا کر رہی تھیں۔ فوٹو گرافر اسٹیج پر چڑھ آئے دلہن کے ٹولے کی تصویریں لینے کے لیے۔ اور وہاں موجود جنید، نوید اور چچی جان کو روشنی میں نہلانے لگے۔ دلہن کو نوید نے سہارا دے کر اوپر جنید کے برابر والے صوفے پر بٹھایا۔ سہیلیاں بڑھ چڑھ کر پیچھے کھڑی ہوگئیں۔ نوید ہدایت دیتا رہا۔

"اکرم! ادھر سے امی کو کور کرو۔ ہاں اب نازی کا سائیڈ پوز۔ جنید اور نازی کا ساتھ ساتھ...." جنید نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ارم کا لایا ہوا کالے پینٹ کا ڈبا۔ نظر نہ آیا۔

نازی بے زار سی تھی۔ ظاہر ہے وہ خوش تو نہیں ہو سکتی تھی۔

"نازی! تم راضی ہو نا۔ خوش تو ہو؟" موقع ملتے ہی جنید نے پوچھ لیا۔

نازی نے شاید دانت پیسے۔ کچکچا کر بولی "یہ تو بعد میں بتاؤں گی۔"

پھر باری باری لوگ اوپر آتے۔ دونوں کو پیار کر کے دعاؤں کے ہار پہناتے۔ نوید نے کہا۔

"امی ابا کہہ رہے ہیں۔ جلدی سے رسم کر لو۔ کھانا تیار ہے۔ ٹائم پر کھا لیا جائے تاکہ لوگ گھروں کو جائیں بارش کا امکان ہے۔"

رسم کے لیے لڑکیاں مہندی کے سجے ہوئے تھال لے کر آئیں۔ مٹکتی ناچتی گاتی بچیاں۔ موم بتیاں تھال کے اندر روشن تھیں۔ ان کی جھلملاتی روشنی بچیوں کے معصوم چہروں کو گلنار بنا رہی تھی۔

چچی جان کو دعوت دی گئی۔ ناز و انداز سے مسکراتی ہوئی اٹھیں اور پھر فورا" بیٹھ گئیں۔

"ارے شاہدہ کو بلاؤ۔ کہنا میرے کمرے سے میرا پرس تو لے آئے۔ اے بھئی۔ اس میں میرا چشمہ ہے جس کے بغیر مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔ اس میں رقم کا لفافہ ہے۔ سلامی کے لیے.... ضیا! جا بھاگ کے میرا پرس لا۔"

گانے والیوں نے موقعے کی مناسبت سے مصرعہ اٹھایا۔

"مہندی تاں سجدی۔ نازی کی امی نچ دی۔"

لڈی ڈالنے والیاں تواتر سے صحیح قدم اٹھاتی ڈنڈیاں ایک دوسرے پر مارتی گھوم رہی تھیں۔

جنید کی نظریں پچھلی رو میں سمانہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر سمانہ وہاں نہ تھی اور یک دم بے ہنگم سا شور ڈھول کی ڈھما ڈھم۔ یک لخت سب کی نظریں آرائشی گیٹ کی طرف جم گئیں۔ جہاں لڑکیوں، عورتوں کا ہجوم آگے بڑھ رہا تھا مگر اس سے بھی آگے۔ پیلے لباس میں ڈھول والے ڈھول پیٹتے بے ہنگم شور کے ساتھ آگے آرہے تھے۔ ڈھول والوں کے پیچھے ایک زرتار دوپٹے کی چھتری تنی ہوئی تھی۔

"ہائیں!" نوید اسٹیج سے نیچے کودا۔ دوپٹے کو لڑکیوں نے سر سے اونچا کیا ہوا تھا۔ ان کی کلائیاں چوڑیوں سے بجی ہوئی تھیں۔ ہتھیلیاں مہندی سے رچی ہوئی اس دوپٹے کی چھتری کے نیچے ایک پیلے کرتے میں ہنستا مسکراتا بشاش نوجوان دونوں اطراف کی کرسی نشین خواتین کو ہاتھ سے سلام کرتا ہوا آگے آگے....

فوٹو گرافر نے فوراً" رخ تبدیل کرلیا۔ اب ۔۔۔ آنے والے ہجوم پر روشنیاں تھیں۔ روشنی میں نہاتے وہ درمیان کی روش پر چل رہے تھے۔ عجیب صورت حال تھی۔ چچی جان کے ہاتھ سے پھولوں کا ہار نیچے گر گیا، جو وہ جنید کو پہنانے کے لیے لارہی تھیں۔

"شرجیل!" نوید نیچے سے چلایا۔

"شرجیل!" نازی ایک چیخ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ جنید اس سے پہلے ہی کھڑے ہو چکے تھے۔

"شرجیل!" شاہدہ باجی نے چیخ کر کہا۔ "ان کا فون سچ مچ خراب تھا امی! اور شرجیل کا موبائل کموڈ میں گر گیا تھا۔"

"چھوڑوں گی نہیں جنید بھائی! فون آپ نے سنا تھا نا۔ جب تو فون ٹھیک تھا۔"

اس نے جنید پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی۔ جنید موقع کی نزاکت کو سمجھ کر ایک لمحہ پہلے ہی اسٹیج سے نیچے کود چکے تھے۔ نازی زخمی شیرنی کی مانند غراتی ہوئی ان کے پیچھے۔

"جاتے کہاں ہیں۔"

جنید نے خطرہ سر پر منڈلاتا دیکھا تو زقند بھری۔ نازی نے لڑی ڈالتی ساکت کھڑی لڑکیوں کے ہاتھ سے دو ڈنڈیاں جھپٹیں اور دوڑی جنید کے پیچھے۔ اب چشم تماشا نے کیا نظارہ دیکھا۔

سامنے زرتار دوپٹے کے سائے تلے اصلی دولہا مسکراہٹیں بکھیرتا آرہا ہے۔ دلہن ایک نوجوان کا تعاقب کرتی ہوئی دوڑ لگا رہی ہے۔ چیختی چلاتی۔ اصلی دولہا اور ان کا ٹولہ رک کر تماشا دیکھنے لگا۔ ان کو دھکا دیتا ہوا ایک شخص، اس کے عقب میں دلہن بنی نازی۔ اصل دولہا کو ہاتھ کے اشارے سے ہٹاتی گیٹ کی جانب ۔۔۔ مگر گیٹ آنے والیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ جگہ ملی نہ راستہ۔ اب جنید نے دوسری کرسیوں کے ساتھ والی روش پر دوڑ لگائی۔ ڈنڈیاں اچھالتی نازی۔ حواس باختہ نوجوان کے پیچھے اکرم کو پکارتی جارہی تھی۔

"اکرم! وہ اسپرے لاؤ۔ جلدی۔"

اب جنید میاں نے خواتین کے اوپر جو چھلانگ لگائی تو قنات کے اوپر جا گرے۔ قنات کا بانس گیلی کیاری میں ٹھونکا گیا تھا۔ ان کے حملے سے نیچے گرا۔ جنید میاں نے کیاری پھلانگی اور قناتوں کے پیچھے سے بگٹٹ دوڑ لگائی۔ مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ باجی شاہدہ نے بروقت نازی کا راستہ روکا۔

اب وہ شرجیل کے ساتھ اسٹیج کی طرف آرہی تھی اکرم کی تیز روشنیوں کے ساتھ۔ شرجیل نے کہنی مار کر پوچھا۔

"کیا ہوا تھا۔ کس کے ساتھ ریس لگا رہی تھیں۔"

"وہ میں کل بتاؤں گی۔" نازی اسٹیج پر چڑھ گئی۔ جہاں اس کی امی، بھائی نوید اور ساری سہیلیاں قہقہے لگا رہی تھیں پھر یہ قہقہے ہر طرف سے ابلنے لگے۔ لڑی ڈالنے والیاں پیٹ پکڑے لوٹن کبوتر ہو رہی تھیں۔ ایک نئی قسم کی لڑی نے سنسنی پھیلا دی۔ پھر کسی نے چلا کر کہا۔

"سمانہ کو بلاؤ۔ وہ اس موقعے پر پھڑکتا ہوا گانا گائے گی۔"

سمانہ ۔۔۔ اندر کوٹھی کے برآمدے میں کرسی پر نڈھال بیٹھی تھی۔ جب اس نے جنید میاں کو افتاں و خیزاں ہانپتے ہوئے حال سے بے حال آتے دیکھا۔ کپڑے گھاس اور مٹی سے بھرے ہوئے، جوتے کیچڑ سے۔ سیدھے سمانہ کی طرف آرہے تھے۔ چچا جان جو کھانے کی نگرانی کے لیے پچھلے صحن میں تھے۔ دریافت حال کے لیے ادھر آئے۔ جنید کو دیکھا۔

"کہاں۔ کہاں جا رہے ہو بیٹا! کیا رسم ہو گئی؟" ہائے بے خبرے ابا جان۔

"چچا جان! آپ سے ایک درخواست ہے۔" ہانپ رہے تھے۔

"ہاں ہاں بیٹا کہو۔" لڑکا جو بھتیجا تھا۔ محسن بھی تھا اور داماد بننے جا رہا تھا۔

"چچا جان! ادھر اصلی دولہا والے آ گئے ہیں۔" سانس لینے کو رکے۔

"چچا میاں! میں آپ سے سمانہ کو ۔۔۔ مطلب سمانہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے۔ سمانہ کی اور میری مہندی بھی نازی کے ساتھ ہو جائے۔ آپ خوشی سے اجازت دے دیں۔"

چچا جان ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ میں پانی کا جگ تھا۔ وہ ہپ سے نیچے گرا۔ پلاسٹک کا تھا۔ سوچ رہا باورچیوں کے لیے پانی لینے آئے تھے۔ پھر کچھ غور کیا۔ لان سے قہقہوں کی آوازوں نے صحن تک رسائی حاصل کر لی سمانہ بھی اٹھ کر قریب آئی۔ جنید میاں کا حلیہ تو کوئی اور کہانی سنا رہا تھا۔ پھر ہنستے ہوئے نوید نے آکر ابا کو وہ خبر سنائی۔ جس کو سن کر ابا جان نے بھی قہقہہ لگایا۔

"خوب، خوب ۔۔۔ فون واقعی خراب تھا۔"

پھر انہوں نے جنید میاں کی درخواست اور ان کے حلیے پر غور کیا۔ سمانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلو بیٹی! آج تمہاری مہندی بھی ہو جائے اور آج ہی نکاح بھی۔ نوید! جنید میاں اور سمانہ کے نکاح کے لیے مولوی صاحب کو بلا لاؤ۔ آج ہی یہ فرض بھی ادا ہو جائے۔"

نوید منہ کھولے کھڑا تھا۔ لپک کر قریب آیا اور جنید کے گلے سے لپٹ گیا "زندہ باد۔"

پھر وہ باہر کو دوڑ گیا۔ مولوی کی تلاش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ آخر کل جو فون آیا، وہ کس کا تھا؟

چچا جان جب ان دونوں کو لے کر مہندی کے فنکشن میں پہنچے۔ رسم شروع ہو کر ختم کے قریب تھی۔ انہوں نے شاہدہ کو پکارا۔

"بیٹا شاہدہ! جنید میاں اور سمانہ کی مہندی بھی آج نپٹا دو پھر نکاح ہو جائے گا۔" بے شمار گردنیں اٹھیں۔ مڑیں اور ایک بار پھر قہقہے بکھر گئے۔

باجی شاہدہ نے جنید میاں کو اشارہ کیا۔ اوپر آئیں۔ سمانہ کو پکڑ کر لائیں۔ پھر افسوس سے بولیں۔

"جنید! جوتے تو بدل لیتے۔ کیچڑ قالین گندا کر رہی تھی۔"

"باجی! دلہن بدل لی۔ یہ کافی نہیں؟"

اور باجی شاہدہ سوچ رہی تھیں۔ کل پہننے والے سوٹ اور شیروانی، جوتے ۔۔۔ اب ان کی پیمنٹ کون کرے گا۔ مہنگا سودا۔

شرجیل نازی سے پوچھ رہا تھا۔ "آخر کل جو فون آیا۔ وہ کس کا تھا؟"

جنید میاں اب حواس میں آکر سوچ رہے تھے۔ "کل جو فون میں نے سنا تھا۔ شرجیل کے گھر سے نہیں تھا۔ تو پھر کس کے گھر آج قیامت ٹوٹی ہو گی؟"

☼

نازیہ جمال

"خدا پوچھے ان کم بخت ماریوں سے... لے کے سارا صحن برباد کرکے رکھ دیا... باندریوں کی طرح اچھل اچھل کے ٹانگ بھر زمین کھود ماری ہے، جیسے پیروں میں جوتوں کے ساتھ کدالیں لگا رکھی ہوں۔"

ممتاز نے غصے سے باآواز بلند کہتے ہوئے خاصے جارحانہ انداز میں پانی سے بھری بالٹی کچے آنگن میں اچھالی تھی۔

چھپاک سے پانی پڑتے ہی گرد اوپر کو اٹھی۔ کنگھی سے بال سلجھاتی طاہرہ کو ماں کا تپنا بلاوجہ ہی لگا تھا۔ آخر کو شادی والے گھر میں ہر چیز ملیٹ ہو ہی جاتی ہے۔ فنکشن تو کل سے شروع ہونا تھا۔ مگر رات میں خلاف توقع نوشہ امان اللہ کی چار عدد بہنیں۔ اپنے درجن بھر بچوں اور ایک عدد میراثن کے ہمراہ آدھمکیں کہ

"جی ایک ہی تو بھائی ہے ہمارا۔ سوچا ذرا آپ کے ہاں بھی کھنگل میلہ لگالیں۔"

اب یہ ویر کے ویاہ کی ہی اتنی چاہ تھی کہ میراثن کے حلق پھاڑ سرائیکی ماہیوں اور ٹیون پہ وہ جناتی ڈانس پیش کیا کہ برسوں سے خوب جما جمایا کچا آنگن ایک ہی رات میں گھڑ دوڑ کا میدان لگنے لگا تھا۔

"ہم نے بھی اپنی شادی خوشیوں پہ جھومریں ڈالی ہیں۔ مگر انسانیت کے جامے میں رہ کر... اگر یہ کسی ہرے بھرے کھیت میں اس طرح خوشی منانے پہ آجائیں تو اللہ قسم وہاں اگلے دس سال تک کوئی پتی نہ پھوٹے ہاں۔" ممتاز کی لن ترانیاں جاری تھیں۔

خالی بالٹی کھرے میں رکھ کر ٹونٹی کھول دی۔

"ارے اماں! پانی ڈالنے سے پہلے صحن میں مٹھی بھر بیج اچھال دیں۔ ہل شدہ زمین کاشت کے لیے بالکل تیار ہے۔ ہر روز کی تازہ سبزیاں اور ساتھ میں سبز و ہریالی کا الگ منظر۔ واہ واہ۔" جوتے پالش کرتے عمران نے اپنی بات سے خود ہی لطف لیا۔

"آپ خوامخواہ پانی ضائع کررہی ہیں۔ آخر وہ دولہا والے ہیں۔ انہوں نے ہی تو ناچنا گانا ہے۔" حمیرا نے آگے بڑھ کر ٹونٹی بند کردی۔ رائل بلیو جارجٹ کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس، بالوں کی سادہ چوٹی بنائے وہ

بالکل تیار تھی۔ اسے طاہرہ کے ہمراہ ابھی کچھ دیر میں دولہا والوں کے ہاں جاکر سمیرا کا کمرہ سیٹ کرنا تھا۔

"اب اگر شادی پہ اسی طرح ہڑدنگے مار کر صحن کا ستیاناس کیا تو ڈیوڑھی میں روک دوں گی۔" گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے ممتاز نے کہا تو حمیرا اور طاہرہ دونوں بیک وقت مسکرا دیں۔ وہ ماں کی نفاست پسندی سے بخوبی واقف تھیں۔ ذرا سی گرد بھی ان پہ گراں گزرتی۔ گھر میں چپل گھسیٹ کر چلنا منع تھا۔ کئی بار عزیز علی کی توجہ صحن پختہ کرنے کی طرف مبذول کرائی تھی۔ مگر وہ ہر بار ایک ہی جواب دے کر خرچ سے صاف دامن بچا جاتے۔

بارشوں سے نہیں مہکتا کبھی
مجھے پکا آنگن نہیں چاہیے

سنہری پالش والا فرنیچر ابھی ابھی پہنچا تھا۔ وہ دونوں آئیں تو بہن کا کمرہ سیٹ کرنے تھیں مگر اماں کی بہنوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ بیڈ کھڑکی کے ساتھ ہی مناسب لگتا تھا۔ مگر حفیظہ اور شاہدہ نے مل کر اسے کونے میں شفٹ کردیا۔ جس سے بیڈ کے کراؤن کی وجہ سے آدھی شیلف چھپ گئی تھی۔ لفافوں میں سلیقے سے بند جہیز کے جوڑے نکال کر ہینگروں میں لگائے۔ ڈھیروں بہنیں ٹھونگنے کے بعد کپڑے دیوار سے لٹکا دیے۔ جریاں، شالیں، صوفوں کی بیک اور بیڈ پہ پھیلا دیں۔ کراکری اور دیگر سامان ڈبوں سے نکال کر پورے کمرے میں پھیلا دیا۔ تاکہ آنے والے مہمانوں کو جہیز کا ہر آئٹم بغور دیکھنے کو ملے۔ حمیرا اور طاہرہ نے کئی بار جتایا کہ ان کے ہاں ایسی نمود و نمائش کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

انہوں نے سامان کی پیکنگ میں سارا دن لگایا تھا۔ اب ان چاروں نے ڈبوں کو چیر پھاڑ کر اپنے انداز میں سجانے میں پانچ منٹ لگائے تھے۔ کمرہ کسی بازار کا منظر پیش کررہا تھا۔

"یہ اماں نے آپ بہنوں کی پہناونیاں دی ہیں۔" حمیرا نے پیک شدہ جوڑے اختری کی طرف بڑھائے۔

"ہاہ! ہماری یہ پہناونیاں ہیں تو پھر یہ کیا ہے۔" اختر نے تعجب سے کہتے ہوئے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ابھی سمیرا کے جوڑے لٹکائے گئے تھے۔

"جی! یہ تو جہیز ہے باجی کا۔" حمیرا ہکلا کر بولی۔

"ہمیں نہیں۔ اختری بہن کے کہنے کا مطلب ہے ہم چاروں بہنیں اپنی بھابھی کے جہیز میں سے اپنی پسند کا جوڑا لیں گے۔" ذکیہ نے اس کی مشکل حل کردی۔

وہ دونوں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"ہمارے ہاں تو رواج ہے۔ منڈے کی بہنیں اپنی خوشی سے بھرجائی کا جوڑا لیتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھرجائی کے دل میں اپنی نندوں کے لیے کتنی چاہ اور محبت ہے۔" شاہدہ ان کی اتری ہوئی شکلیں دیکھ کر بولی۔ پھر آرام سے جھلمل کرتا رائل بلیو جوڑا اتار لیا۔ جسے سمیرا نے بطور خاص ملتان سے منگوایا تھا۔

"واہ بھین (بہن) میری! خود تو اچھی چیز لے لی۔ یہ تا ہوا کہ پہلے بڑی بہن کو پسند کرنے دیتیں۔" اختر نے شاہدہ کو طنز سے دیکھا تھا جو پُرشوق نگاہوں سے سوٹ خود سے لگائے کھڑی تھی۔

"ارے بی بی! کتنے سارے بھرجائی کے جوڑے ہیں۔ کوئی دوسرا لے لو۔" شاہدہ نے فراخدلی سے آفر کی۔

ذکیہ اور حفیظہ بیک وقت پُھرتی سے سرخ کامدار کریب کے سوٹ کی طرف لپکیں۔ حفیظہ کا قد اونچا تھا، سو وہی کامیاب ٹھہری۔ اختر کو ابھی تک منتخب کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ سارے ہی کپڑے خوب صورت اور مہنگے تھے۔

"آپ لوگوں کو چاہیے تھا، باجی سمیرا کے آنے کے بعد ان کی اجازت سے سوٹ لیتیں۔" باوجود ضبط کے حمیرا کا غصہ چھلک ہی پڑا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی تھی۔ ان کپڑوں، بلکہ جہیز کی ہر چیز کے ساتھ اس کی بہن کے رنگین خواب جڑے تھے۔ کتنی مشکلوں سے اس کے اماں، ابا نے یہ سب کچھ اکٹھا کیا تھا۔ پورے جہیز میں سے صرف کپڑوں کی خریداری میں ہی سمیرا نے دلچسپی لی تھی۔ باقی سب کچھ بہنوں کی پسند پہ چھوڑ دیا تھا۔ اب جہیز کے چار خوب صورت اور مہنگے جوڑے ان بے حس اور مطلبی خواتین کے قبضے میں دیکھ کر دل چاہا خوب کھری کھری سنائے۔ مگر مصلحتاً چپ سی لیے کہ نیا نیا سنجوگ تھا۔

"ارے اجازت کی خوب کہی۔ بھلا بھابھیوں سے کوئی اجازت لیتا ہے۔ نند، بھابھی میں کوئی تیری میری نہیں ہوتی۔" ذکیہ نے اپنی نوکیلی آواز میں جتایا۔

"اور بعد میں لے کر کیا کرتے، ہمارے ہاں تو کیا جوڑے شادی میں پہننے کا رواج ہے۔ تاکہ برادری کو بھی پتا چلے کہ ہماری اکلوتی بھرجائی کیا کچھ لے کر آئی ہے۔" دوپٹا شانوں پہ پھیلاتے اختر جھوم کر بولی تھی۔

"چلو طاہرہ! کافی دیر ہو گئی ہے۔" حمیرا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ سننا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

"سمیرا باجی کو جب پتا چلے گا کہ ان کے فیورٹ جوڑے ان کی ندیدی نندوں نے ہتھیا لیے ہیں تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔" راستے میں چادر سے گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے حمیرا گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ بے حد جذباتی اور نادان۔

"اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" طاہرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

اور شادی کے تین دنوں میں ان چاروں بہنوں نے ممتاز کا وہ ضبط آزمایا کہ وہ اس گھڑی کو کوسنے پر مجبور ہو گئیں، جب انہوں نے امان اللہ کی اچھی شہرت اور اکلوتے پن کو دیکھتے ہوئے سمیرا کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔

مہندی کی رسم کے بعد اختر وغیرہ نے چند ایک مہمانوں کے ہاتھ پہ مٹھائی رکھی اور باقی ساری واپس گھر لے گئیں۔ سالن کی مقدار بڑھانے کے لیے دیگوں میں اپنی مرضی سے بالٹی بھر پانی انڈیل دیا۔ نتیجتاً "سوپ نما سالن میں روٹی بھگو کر کھانا پڑی۔ رخصتی سے قبل مہمانوں کی تواضع کے لیے دیسی گھی میں پکے میووں والا سوجی کا حلوہ پیش کیا گیا۔ عین موقع پر بجلی دغا دے گئی۔ طاہرہ جب تک چارجنگ لائٹ کا انتظام کرتی اس وقت تک ذکیہ اینڈ کمپنی سارا حلوہ لفافوں میں بھر کر اپنے پرسوں میں ٹھونس چکی تھیں۔

خدا خدا کر کے بینڈ باجوں کے شور میں رخصتی عمل میں لائی گئی۔ پیا کے آنگن میں قدم دھرتے ہی سمیرا کو رسما" دلہن" روک دیا گیا۔ اونچی ہیل کی وجہ سے پیروں میں ہلکا ہلکا سا درد ہونے لگا تھا۔ بے تحاشا گرمی، گہرا میک اپ، زیورات اور بوجھل جوڑے میں جانے کب سے ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ چکی تھی۔ کان پھاڑتا ڈھول۔۔۔ میراثن کی چیختی آواز۔۔۔ بے ہنگم قہقہے اور تالیوں کا شور۔۔۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔

"بھابھی! جب تک اباجی سے کوئی بڑی فرمائش نہ پوری کروالینا۔ اندر نہ جانا۔ آخر کو اباجی گھر کے سربراہ ہیں۔" شاہدہ اس کے پاس آکر چیخی تھی۔

"صرف میری سزا معاف کردو۔ مجھے اندر ٹک کر بیٹھنے دو۔" اس کے دل نے التجا کی تھی۔

"بھرجائی! تو ابے سے بھوری مج مانگ۔ صبح شام پانچ کلو دودھ دیتی ہے۔ ساری زندگی تو اس کا دودھ پیتی رہنا۔" ذکیہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ارے، بھوری تو بوڑھی ہو چکی ہے۔ سال دو سال بعد بک جائے گی۔ تو کالا کٹا مانگ۔ بیچ کر ہزاروں کمالینا۔" اختر نے بھی اپنی رائے دینا ضروری سمجھا تھا۔

"چپ کرو، ساری کم عقل ہو۔" غلام فرید نے ڈپٹ کر کہا۔

"میری اکو اک نوں (بہو) ہے۔ پورے گھر کی مالک ہے، ہر چیز اس کی ہے۔" بڑی محبت سے کہتے ہوئے غلام فرید نے کرتے کی جیب سے پانچ سو نکال کر سمیرا کے حنائی ہاتھ میں دبا دیے۔

اور پھر کلمہ شکر پڑھتے ہوئے اس نے اندر کمرے میں پاؤں رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دو ہفتے پہلے بخیر و عافیت سرانجام پانے والی شادی کے آثار تقریباً مٹ چکے تھے، مگر اعزہ و اقارب کی گھر میں آمد جاری تھی۔ پورے گھر میں خوشی کے بجائے اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

"آخر میرے چچا کو کیا ہوا تھا؟" سعیدہ نے برقع اتارتے ہوئے ذکیہ سے پوچھا تھا۔

"بس کیا بتائیں۔ اچھے بھلے ہنستے مسکراتے اباجی، صبح سینے میں درد اٹھا۔ اتنا ظالم درد تھا کہ ڈاکٹر نے بڑے ہسپتال لے جانے کو کہہ دیا۔ ابھی تک کچھ پتا نہیں۔" اختر نے کہتے ہوئے منہ پر دوپٹہ رکھ لیا اور سسکنے لگی۔

"حوصلہ رکھو۔ چاچا خیر سے واپس آجائیں گے۔" سعیدہ نے آگے بڑھ کر گلے لگایا اور تسلی دینے لگی۔

"سمیرا بھلا چنگا ایا۔۔۔ شادی پر ایسی جھومر ڈالی کہ سب حیران رہ گئے۔ پتا نہیں کس کم بخت کی نظر لگ گئی ہمارے ہٹے کٹے پیو کو۔" شاہدہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

سہ پہر کو امان اللہ نے فون پہ غلام فرید کی طبیعت سنبھلنے کی اطلاع دی تو بے قرار دلوں کو ذرا سکون ملا تھا۔

"اری حفیظہ! یہ تیرا بیٹا ہے نا۔ بڑے والا۔" چاچی وسائی نے تنگ جینز پہ ٹائٹ سرخ شرٹ پہنے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں چاچی! یہ میرا دلاور ہے۔ گھبرو جوان۔ پورا شاہ رخ خان لگتا ہے۔" حفیظہ نے بڑی محبت اور فخر سے اپنے سپوت کو دیکھا تھا جو اپنے بالوں کے سپائیکس بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹھیک کہا تو نے، بہت ہکلا تا ہے۔ کیا تو نے بیٹے کا علاج نہیں کروایا تھا۔" چچا زاد دلشاد نے مصنوعی تفکر سے پوچھا تھا۔ اختر، دلشاد کی بات پہ مسکرانے لگی تھی۔ حفیظہ کو دلشاد کی بات سے زیادہ بہن کی مسکراہٹ نے آگ لگا دی۔

"نہ خدانخواستہ ہکلائے کیوں لگا۔ اچھا بھلا روانی سے بھائی کو ڈانٹ رہا ہے تو سن تو رہی ہے۔" حفیظہ نے تڑخ کر جواب دیا۔

"دے دلشاد! تو مخول نہ کر۔ میرا بھانجا اصلی نہیں تو نقلی شاہ رخ خان ضرور لگتا ہے۔" اختر ہنوز مسکراتے ہوئے بولی۔

حفیظہ نے دانت کچکچا کر اختر کو دیکھا تھا۔ جب سے اس کی بیٹی لینے سے انکار کیا تھا اس وقت سے اختر اس کے بیٹے کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ سخت طیش کے

عالم میں پیر پٹختی سمیرا کے کمرے میں آگئی۔

"ارے بھرجائی! تو کیوں ایسے منہ دھو کے بیٹھی ہے۔ نویں کنوار (دلہن) ہے۔ ہماری طرف کا کوئی شوخ جوڑا پہن۔ اپنے جہیز میں تو سارے پھیکے، بُسے رنگوں والے جوڑے لائی ہے تو۔ تھوڑا میک اپ بھی کرلے۔" وہ دھپ سے صوفے پہ نیم دراز ہوگئی اور سمیرا کا ناقدانہ جائزہ لیا۔

"ارے نہیں باجی! اچھا نہیں لگتا۔ اباجی خیر سے گھر واپس آجائیں تو سج سنور لوں گی۔" سمیرا، حفیظہ کے تند انداز اور جانچتی نظروں سے گھبرا کر بولی۔

"ناں، تو ہمارے ابا خدا نخواستہ کوئی انا للہ تو نہیں ہوگئے جو تو سوگ کی تیاری میں ہے۔" شاہدہ نے اندر آتے ہوئے سمیرا کی بات سن لی اور جُھنجھلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہم چاروں اپنے ابے کی لاڈلی دھیاں (بیٹیاں) ہیں۔ ہم نے بھی تو حوصلہ رکھا ہوا ہے تو نئی نویلی دلہن ہے۔ گھر برادری سے بھرا پڑا ہے۔ تجھے یوں منہ دھلا، مسلے ہوئے کپڑوں میں دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ تُو نے امان اللہ کو پسند نہیں کیا یا تو اس کے دل میں نہیں اتر سکی۔ اٹھ کر یہ آتشی گلابی جوڑا پہن لے۔"

ذکیہ کی آخری بات پہ گھبرا کے اس نے فوراً" جوڑا تھام لیا تھا۔ اس کی بری کے سارے جوڑے ایسے ہی تھے۔ تیز رنگوں والے شوخ بھڑکیلے، گھٹیا نگوں اور نوکیلے ستاروں سے مزین، جنہوں نے سمیرا کے بازوؤں اور گردن پہ لاتعداد خراشیں ڈال دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا کسی بھی قسم کا انکار نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوگا، سو چپ چاپ ان کی ہدایات پر عمل کیے گئی۔

"اور یہ پلنگ پر سوتی چادر کیوں بچھی ہوئی ہے۔ وہ ریشمی کیا ہوئی۔" شاہدہ کی نظر بیڈ پہ اب پڑی تھی۔

"گرمی کی وجہ سے چادر بدل دی ہے۔"

شاہدہ نے اس کی وضاحت ان سنی کرتے ہوئے سوتی چادر لپیٹ کر ریشمی پھولدار چادر بچھادی۔ اختر بھی پیٹی سے سامان نکال کر سجانے میں مدد کرنے لگی۔

"دیکھا۔ کیسے کمرہ بھرا بھرا لگنے لگا ہے۔" شاہدہ نے مسرّت سے گھوم کر دیکھا تھا۔

"ہماری چاچی اور بوا نے تمہیں کتنی سلامی دی ہے؟" اختر نے سرگوشی انداز میں اس سے پوچھا۔

"جی پچاس روپے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کیا صرف پچاس روپے؟" تینوں بہنیں ایک ساتھ زور سے چیخی تھیں۔

"بس اتنی خوشی ہے ان کو ہمارے اکلوتے بھائی کی شادی کی۔ تین دن ٹھونس ٹھونس کر کھایا، دیگ کے ساتھ جم کر بیٹھیں۔ اپنی مرضی سے بوٹیاں نکلوائیں، پر دل اتنا چھوٹا؟" شاہدہ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

"اور ہماری بھولی بھرجائی کو دیکھو، ان کے سامنے خاطر کے لیے سوڈے کی بوتلیں رکھ رہی ہیں۔ ڈیڑھ سو کی بوتل اور سلامی صرف پچاس روپے۔ نرا اپنا نقصان۔" ذکیہ نے افسوس سے سرہلایا۔

"تم ایسا کرو، آئندہ مہمانوں کے آگے مہندی اور نکاح کی مٹھائی رکھ دینا۔" اختر نے مشورہ دیا۔

وہ جواباً" خاموش رہی۔ کیا بتاتی نمک پارے اور میٹھی بوندی تو منہ میں رکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ جی متلانے لگتا تھا۔ البتہ ریوڑیاں اپنے اصلی ذائقے میں موجود تھیں۔

کھڑکی سے چند ہمسائیاں گھر میں آتی دکھائی دیں تو سب باہر صحن میں آگئیں۔

اسے یوں سجا سنورا دیکھ کر چند ایک بزرگ خواتین نے اچنبھے سے انگلی ٹھوڑیوں پہ رکھ لی تھی، اسے بے حد شرمندگی ہوئی، مگر ان چاروں کو تو کوئی پرواہی نہیں تھی۔

اپنی ہی باتوں میں مگن مجمع اس وقت ساکت رہ گیا جب غلام فرید کو دل کا دورہ پڑنے کی اطلاع آئی تھی جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے تھے۔

☆ ☆ ☆

"دیکھ منوں! ابے کے بعد اب تو ہی تو اماں کا سہارا ہے، تیری شادی اس لیے نہیں کی کہ تو بیوہ ماں کی ضرورتوں سے بے نیاز ہوکے زال (بیوی) کے گوڈے سے لگا رہے، ہم بہنیں اپنے گھر کے بکھیڑے سمیٹیں یا ادھر پیکے (میکے) کی خبر لیں۔"

ابا کے سوئم اور تعزیت کے لیے آنے والوں کا رش کم ہوا تو آج چاروں بہنیں اسے گھیر کر بیٹھی تھیں۔ حالانکہ مہینے کے اندر اندر سمیرا نے سارے گھر کا کام سنبھال لیا تھا۔ ساس کا بھی مقدور بھر خیال رکھتی، مگر ان بہنوں کے ماتھے کے بل ہی کم نہ ہوپاتے۔

"میں تو اماں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔" امان اللہ اختر کے تند لہجے پر گھبرا کر بولا۔

"خوب خدمت کر رہے ہو تم دونوں۔ صاف نظر آرہا ہے۔" ذکیہ نے طنزیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

"خود تو مزے سے کولر لگا کر ٹھنڈے کمرے میں سوتے ہو اور میری بوڑھی ماں تپتے کمرے میں جھلتی رہتی ہے۔ بھرجائی تو پرائی دھی ہے۔ تو تو اپنا پتر ہے۔ تو ہی خیال رکھا کر۔" شاہدہ کہتے ہوئے آبدیدہ سی ہوگئی۔

"میں نے اماں سے بہت کہا کہ دوپہر کو ہمارے کمرے میں آجایا کریں۔ رات کو ویسے بھی سب باہر صحن میں اکٹھے سوتے ہیں۔" امان نے بوکھلا کر وضاحت دی۔ بہنوں کی تند خوئی سے ویسے ہی اس کی جان جاتی تھی۔

"اماں! بتائیں ناں انہیں ہم نے کتنی بار کہا ہے۔ آپ سے کہ آپ ہمارے ساتھ سویا کریں۔" ساتھ ہی ماں سے بھی تائید چاہی تھی۔

"نہیں۔ میں اپنا کمرہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارے ابا کے ساتھ ساری زندگی اسی کمرے میں گزار دی۔ مجھے ان کی خوشبو آتی ہے اس کی دیواروں سے۔" اماں افسردگی سے بولیں۔

"ہاں تو اماں کیوں کمرہ چھوڑیں۔ یہ تم خود ہی کولر اماں کے کمرے میں لے آئیں۔ جوان خون ہے۔ گرمی برداشت کرلیں گے۔" حفیظہ نے آرام سے مشورہ دیا تھا۔

سمیرا کو اس کے اماں ابا نے موسم کی مناسبت سے جہیز میں روم کولر بھی دیا تھا۔ جسے اس نے آتے ہی سیٹ کردیا تھا۔

اسی وقت چاروں بہنیں اٹھیں اور اس سے اجازت لیے بغیر کولر ماں کے کمرے میں شفٹ کر آئیں۔

"ابے کی جدائی کا غم اور ہر وقت رونے سے اماں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو۔" اختر نے ماں کے کندھے دباتے ہوئے تاکید کی۔

"گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کا میکہ ہے۔ آپ کو تو سب پتا ہے۔" امان بہنوں کو وضاحت دیتے دیتے اکتا چکا تھا تب ہی چڑ کر بولا۔

"وہ میرا! ہمیں سب پتا ہے کہ ہمارے پیو کے گھر کتنی خوش حالی ہے۔ آخر غلام فرید مال دار کا گھر ہے۔ کمی بھلا کیوں ہوگی، مگر اب ابا ٹر (جا) چکا ہے۔ تو کوئی چھڑا کنوارا منوں تو نہیں ہے اب۔ اس لیے فکر رہتی ہے۔" شاہدہ مصنوعی فکرمندی سے بولی۔

امان کے چہرے پہ ناراضی کی سرخی لہرائی تھی۔ اس نے ایک نظر سر جھکا کر بھنڈیاں کاٹتی سمیرا کو دیکھا جس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

"بیوی کم عمر ہو۔ چہرے پہ بھولپن ہو تو یونہی مرد کی مت ماری جاتی ہے۔" اختر کا مخاطب نجانے کون تھا۔

اماں نے کہا تھا سسرال میں تمہاری تعلیم اور میری دی ہوئی تربیت کی آزمائش ہوگی۔ اللہ تمہیں سرخرو کرے۔ مگر یہاں تو اس کے ضبط اور برداشت کو آزمایا جاتا تھا۔

وہ سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن میں آگئی۔ طنزیہ نظروں نوکیلے فقروں سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

طویل لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اماں روم کولر کی سہولت سے خاطر خواہ استفادہ حاصل نہ کر پارہی تھیں۔

"خواہ مخواہ بھورانی کا احسان لیا۔" انہوں نے افسوس کا برملا اظہار بیٹیوں کے سامنے کیا۔

"تو امان! تم یو پی ایس یا جنریٹر کا انتظام کرلو۔" شاہدہ کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا۔

"بی بی! آپ جانتی تو ہیں' پہلے شادی پھر ابے کی بیماری اور فوتگی پہ سارا جمع جتھا خرچ ہوگیا۔ میری جیب میں تو اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔" امان نے اسی وقت جیب الٹ کے دکھا بھی دی۔

"باجی! کہیں سے آرہی ہیں یا جارہی ہیں۔" سمیرا نے اختر سے پوچھا۔ جو اس وقت تیز سرخ بنارسی کے تنگ فٹنگ والے جوڑے میں ملبوس تھی۔ سرخ لپ اسٹک' سرخ سستے سے نقلی زیورات کے ساتھ کس کے جوڑا بنایا گیا تھا۔ جوڑے پہ اکا دکا ستارے بھی ٹنگے تھے۔ سمیرا نے خاصی دلچسپی سے اختر کی تیاری ملاحظہ کی تھی۔

"نہیں ہم ابھی امین کے میرے بھائی کا ولیمہ بھگتا کر آرہے ہیں۔ سچ بڑے ہی قدردان لوگ ہیں۔ بہت کہا۔ میرا ابا فوت ہوگیا ہے۔ میں نہیں آسکتی مگر میرے بغیر تو انہیں شادی پھیکی لگ رہی تھی۔" اختر نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا۔

سمیرا ہلکے سے مسکرادی۔ معا" اختر کو احساس ہوا کہ اہم بات تو بیچ میں ہی رہ گئی ہے۔

"وے امان! تو نے بتایا نہیں۔ لوڈ شیڈنگ کا کیا حل نکالے گا؟"

"کمال کرتی ہو بی بی! اتنا بڑا مسئلہ حکومت حل نہیں کرپائی تو میں اکیلا کیا کرسکتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"مذاق نہ کر۔ بس تو کہیں سے یو پی ایس یا جنریٹر کا بندوبست کر۔" وہی حاکمانہ انداز۔ امان سوچ میں پڑ گیا۔

"ان شاء اللہ اگلے سال میں سب سیٹ کرلوں گا۔"

"ہاں۔ اگلے سال تو نے اماں کی زندگی کی گارنٹی لی ہے نا!" طنزیہ لہجے میں بولی۔

"اچھا پھر کسی دوست سے قرض وغیرہ لیتا ہوں۔"

"قرض کیوں۔ بھرجائی کو جو اتنی سلامی ملی ہے۔" چمک کر یاددہانی کرائی گئی۔

امان ایک لمبی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ یہ اکلوتا ہونا بھی کتنی بڑی آزمائش ہے۔ فرماں برداری پہ کوئی جائے انکار نہیں۔

"میں نے بھی تو شادی کے فورا" بعد اپنی سلامی سے امین کا قرض اتارا تھا۔" اختر کی گھر کے لیے دی جانے والی پہلی پہلی قربانی!

سمیرا خاموشی سے اندر گئی اور سارے پیسے لاکر امان کے ہاتھوں میں دے دیے۔

امان نے ایک نظر بیوی کے چہرے پہ ڈالی جہاں طمانیت اور سکون کے رنگ واضح تھے۔

☆ ☆ ☆

عید قرباں کی آمد آمد تھی۔

ہر دفعہ کی طرح اس مرتبہ بھی گھر کا پلا پلایا جانور راہ خدا پہ قربان ہونے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ بھوری بکری کا بہت خیال رکھتی۔ مہندی کا پیالہ گھول کر کھال کے سفید حصوں پہ لپائی کردی۔

"دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ آپ نے عید کا جوڑا ابھی تک نہیں لیا۔" وہ امان کے قریب چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"نہیں سمیرا! ابا کے بغیر یہ عید' عید نہیں لگ رہی۔ میں اور ابا ایک ہی تھان سے کپڑا کٹواتے تھے۔ جوتے تک ایک جیسے لیتے تھے۔ لوگ ہم کو بڑا چھوٹا بھائی کہہ کر پکارتے۔" امان افسردگی سے بولا۔ آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بزرگ گھر کی رونق ہوتے ہیں' مگر سنت ابراہیمی کے بھی اپنے تقاضے ہیں۔ آپ کا اتنے بڑے مذہبی تہوار میں دلچسپی نہ لینا' اللہ کی ناراضی کا موجب بن سکتا ہے۔ اماں جی تو عدت میں ہیں۔ مگر آپ کو تو اہتمام کرنا چاہیے۔" وہ نرمی سے قائل کرتے ہوئے بولی۔

دس ذی الحج کا سورج ابھی پوری طرح بھی نہ نکلا تھا

کہ آس پاس کے تمام عزیز واقارب کے گھروں سے ناشتا آگیا۔ سویاں، سوجی، کیک رس اور چائے کے لاتعداد تھرماس۔

"آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا چاچی! میں خود ناشتا بنانے والی تھی۔" اس نے چاچی فاطمہ سے کہا۔ پہلے تو چاچی فاطمہ اس کے رسم و رواج سے ناواقف ہونے پہ ذرا سی حیران ہوئیں پھر سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"دلہن! یہ تو یہاں کی ریت ہے۔ بھائی فرید کی پہلی عید ہے۔ تو برادری اسی طرح غم بانٹتی ہے۔"

وہ کندھے اچکاتی اندر آگئی جہاں امان کمرے کے وسط میں کھڑا چہرے پہ ڈھیروں الجھن لیے کھونٹی پہ ٹنگے تین چار استری شدہ جوڑوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے جانچ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔ ان میں سے کوئی سا بھی پہن لیں۔" وہ قریب آئی۔

"نہیں، سب نئے اور اچھی حالت میں ہیں۔ تم ایسا کرو یہ والا فٹافٹ استری کر دو۔" وہ الماری کھول کے خوب چھانٹ کر ایک بہت پرانا اڑے رنگوں والا براؤن جوڑا نکال لایا۔

نہ شیو بنائی نہ بال، خوشبو تک سے پرہیز۔

"سمجھا کرو۔ اماں ابے کو یاد کر کے رو رہی ہے، میں یوں بن سنور کر اچھا لگوں گا۔" وہ اس کی ناراضی محسوس کر کے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

نہا دھو کر اس نے گلابی کڑھائی والا سوٹ زیب تن کیا۔ جس پر گلابی و سرخ سوتی دھاگے سے نفیس کڑھائی کی گئی تھی۔ کہیں کہیں شیشے بھی بہار دکھا رہے تھے۔ لمبے گھنے نم بال سلجھا کر پیچھے چھوڑ دیے۔

آنکھوں میں کاجل کی لکیر ڈال کے گداز لبوں پہ پنک لپ اسٹک لگائی۔ دائیں ہاتھ کی کلائی میں سرخ کانچ کی چوڑیاں ڈال لیں۔

وہ مکمل تیار ہو کے امان کو عید مبارک کہنا چاہتی تھی کیونکہ اس کی اماں بھی ایسا ہی کیا کرتی تھیں۔ دادی کی تاکید کے مطابق ہر بیاہتا کو سجے سنورے رہنا چاہیے، اس لیے اسے اماں کی کلائیاں کبھی سونی نظر نہ آئیں، مگر عید کے دن تو خصوصی تیاری ہوتی۔ خوب دنداسہ رگڑ رگڑ کر ہونٹوں کو لال کرتیں۔ ہاتھوں، پیروں پہ گھر کی مہندی کا لیپ لگاتیں۔ دونوں ہاتھوں میں پارے والی چوڑیاں، نیا جوڑا۔ وہ تینوں بہنیں بھی خوش ذوقی میں ماں کا پر تو تھیں۔ غرض عید اپنے پورے لوازمات کے ساتھ منائی جاتی تھی۔

سسرال میں اس کی پہلی عید تھی، مگر اس عید کا رنگ گزشتہ منائی گئی تمام عیدوں سے یکسر مختلف تھا۔

"ہائے اماں! ہمارا ابا ہمیں یتیم کر کے چلا گیا۔" حفیظہ آتے ہی ماں کے گلے لگ کر زور زور سے رونے لگی۔

اختر، شاہدہ اور ذکیہ بھی تھوڑی دیر بعد آگئیں۔ ذرا سا آنسو بہانے، باپ کو یاد کرنے کے بعد اب ناشتے سے خوب انصاف کیا جا رہا تھا۔

"عید مبارک باجی!" ہلکا سا پرفیوم اسپرے کیے وہ نکھری نکھری سی قریب آکر خوش دلی سے بولی تھی۔

چاروں کی نظر اٹھی تو کرنٹ کھا کر رہ گئیں۔ ذکیہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلکا اور گرم چائے دائیں پاؤں پہ گری تو وہ بلبلا کر رہ گئی۔

"اوئی ماں! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ بھرجائی نے نواں جوڑا پہن لیا؟" اختر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا ترو تازہ سراپا دیکھا تھا۔

"جی آج عید ہے نا۔ میری پہلی عید، آپ لوگوں کے ساتھ۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"اور تو شاید بھول گئی ہے کہ یہ میرے مرحوم ابا کی بھی پہلی عید ہے۔" حفیظہ غصے سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"تاں بھرجائی! تیرا دل ذرا نہ کانپا۔ ہم سوگوار ہیں۔ عمر پڑی ہے سجنے سنورنے کو۔ اگر اتنی ہی چاہ چڑھی تھی تو کل ہار سنگھار کر لیتیں، مگر آج ایسے ہی رہتیں۔ ابھی کچھ دیر میں ساری برادری والے عید ملنے آئیں گے۔ کیا سوچیں گے کہ اکلوتی نوں کو ذرا بھی غم نہیں ہے سوہرے کے جانے کا۔ آجائے امان اللہ۔ ذرا اس سے پوچھتی ہوں۔ بیوی کو کنٹرول کرنا نہیں جانتا۔" اختر نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں باجی! اباجی کے جانے کا ہم سب کو غم ہے۔ ان کو رخصت ہوئے دو ماہ ہونے کو آگئے ہیں۔ آج عید کا دن ہے۔ خوشیوں و مسرتوں کا دن۔ اللہ تعالیٰ نے عیدین کے تہوار ہم مسلمانوں کو خوشی منانے کے لیے دیے ہیں نہ کہ رونے دھونے اور غم منانے کے لیے۔" وہ تحمل سے بولی۔

"ہمیں پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگوں کے ہاں رواج ہوگا، اپنے جانے والوں کو بھلا دینے کا۔" حفیظہ نے تپتے ہوئے کہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت سمیرا کی تیاری کا حشر نشر کر دے جو بجائے ان کے غم میں شریک ہونے کے بن ٹھن کر کھڑی ہوئی تھی۔

"معاف کیجیے گا یہ میلے کچیلے، میلے اور بدبودار کپڑے پہن کر، الجھے بکھرے بالوں کے ساتھ غم منانے کا کون سا طریقہ ہے۔ اگر صفائی ستھرائی سے اتنا ہی پرہیز کیا ہے تو اختر باجی اس وقت بھی آپ کو بننے سنورنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جب آپ کے سسرال میں کوئی شادی کا فنکشن منعقد ہوا تھا۔ اس وقت اباجی کو گئے صرف ایک ماہ ہی تو ہوا تھا۔"

صاف گوئی سے بولتے ہوئے اس نے کچھ عرصہ پہلے کی بات اختر کو یاد دلائی۔ بجائے شرمندہ ہونے کے اختر تو کھول کر رہ گئی۔

رفتہ رفتہ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اس نے بے حد سلیقے اور پھرتی سے مہمانوں کو چائے اور سوئٹ ڈش پیش کی۔ کیونکہ قربانی کا گوشت آنے میں کافی وقت پڑا تھا۔

سب ہی کی نظروں میں سمیرا کے لیے پسندیدگی اور ستائش تھی۔ کسی نے کڑھائی کی تعریف کی، تو کوئی لمبے گھنے بالوں کا ٹوٹکہ پوچھنے لگی۔ وہ دھیمے سے مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

چاروں بہنوں کو چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے عجیب سی بے چینی لاحق ہونے لگی تھی۔

ذکیہ کا تو اس وقت منہ لٹک گیا جب اماں نے ہاتھ سے اسے پرے کیا۔

"ذکی! ذرا ادھر کو ہٹو۔ تمہارے پسینے کی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔"

"اماں جی! آپ اٹھ کر کپڑے بدل لیں۔ میں نے ازار بند ڈال کر غسل خانے میں لٹکا دیا ہے۔" وہ قریب آکر نرمی اور محبت سے بولی۔ اماں جی نے سر ہلایا پھر نیچے چپلیں تلاش کرنے لگیں۔

"جادو گرنی نہ ہو تو۔ میری اچھی بھلی ماں کی بھی مت مار دی۔" اختر نے غصے سے دانت پیستے ہوئے سمیرا کو دیکھا جو اس وقت چاچی صابرہ اور ان کی بہو سے ہنس کر عید مل رہی تھی۔ اماں جی بھی کپڑے بدل کر آگئیں۔ نئے کپڑوں نے شخصیت کو وقار بخش دیا تھا۔

حفیظہ نے نظر بھر کر سارا منظر ایک لمحے کو دیکھا پھر گریبان میں ہاتھ ڈال کر چائنا کا سرخ موبائل نکالا۔

"ہاں طاہر! میرا جامنی کاٹن کا سوٹ ٹرنک میں رکھا ہے۔ وہ لے کر نانی کے گھر آجاؤ۔ میں یہیں استری کر لوں گی۔"

"اختر باجی! آپ کا لیمن کلر کا جوڑا آپ پر بہت سجتا ہے، جو آپ نے میری مہندی پر پہنا تھا۔" وہ لہجے میں محبت سموتے ہوئے اپنائیت سے بولی۔

"صرف لیمن کیا مجھ پہ تو ہر رنگ سجتا ہے۔" بے نیازی سے جواب دیا گیا۔

"میں ابھی گاجری رنگ کا جوڑا منگوا کر پہنتی ہوں۔ پھر دیکھنا، کیسا اٹھتا ہے یہ رنگ مجھ پہ۔" وہ مسکراتے ہوئے ہٹ گئی۔

"یہ ناخواندہ، جذباتی اور فرسودہ روایتوں پہ اڑے لوگ۔ اگر ان سے ان ہی جیسا طرز عمل اپناؤں گی تو زندگی مشکل نہیں، مشکل تر ہو جائے گی۔" "مگر محبت، نرم خوئی، ہمدردی، اپنائیت اور صبر و تحمل ایسے اوصاف ہیں، جو دلوں اور ذہنوں کو بدلنے میں جادوئی اثر رکھتے ہیں۔"

سمیرا دل میں سوچتی طمانیت سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆

نعیمہ ناز سلطان

ہماری آنکھوں کے خواب

مکمل ناول

چھوٹا سا صحن تھا اس میں ایک طرف واشنگ مشین میں کپڑے گھوم رہے تھے اس کے ساتھ ہی میلے کپڑوں کی الگ الگ ڈھیریاں لگا کر رکھی گئی تھیں' مردانہ' زنانہ' سادہ' رنگین چادریں' بنیان' رومال تولیے' جرابیں ہر قسم کا میلا کپڑا دھلنے کے لیے موجود تھا۔

"کتنے مہینے بعد مشین لگائی ہے؟" تائی اماں کی چشمے کے پیچھے سے گھورتی نگاہیں اچھے بھلے بندے کو گڑبڑا دیتی تھیں مگر وہ تو ناہید نور الٰہی تھی' ان سے تو کیا زچ ہوتی' الٹا انہیں ہی جب کرادیتی تھی۔

"کل تو آئی ہے مشین' ٹھیک ہو کر دو مہینے سے خراب پڑی تھی' میرے بھائی تو چلو چھوٹے ہیں ابھی' کچھ نکمے بھی ہیں' امی' ابا کے لاڈ پیار میں بگڑے آپ کا بیٹا بھی کچھ کم نہیں ہے' الٹے سیدھے مشورے تو حاضر رہتے ہیں' یہ نہ ہوا کہ مکینک کو بلا لاتا یا مشین وہاں لے جاتا' دو مہینے نکال دیے آج کل' آج کل کرتے ہوئے۔" اتنی تیز رفتار مشین بھی نہیں تھی جتنی ناہید کی زبان۔ اک ذرا چھیڑنے کی دیر ہوتی اور۔۔۔

"خیر' اب بھی اسی نے ہی ٹھیک کروائی ہے' تمہارے ابا بھائی تو اپنے مشغلوں سے فارغ ہی نہیں ہوتے۔"

تائی اماں کو اپنے بیٹے کی شان میں یہ معمولی گستاخی کچھ بھائی نہیں سو جتا دیا۔

"ہاں تو میرے ابا بھائی کو اپنے کام بہت' طارق کی طرح فارغ ہوتے تو یہ بھی کر لیتے۔" ناہید کہاں ادھار رکھنے کی قائل تھی۔

"ہائے ہائے دودھ ابل گیا۔" تائی اماں کی ناک تک دودھ کی خوشبو پہنچ گئی۔ وہ لپک کر کچن میں پہنچیں' مگر دیر ہو چکی تھی' دودھ ابل ابل کر گر رہا تھا۔ چولہے برنر دونوں کا ستیاناس ہو چکا تھا۔

"اپنے حال کی خبر نہیں' دوسروں کی خبر گیری کا بہت شوق ہے۔" ناہید بڑبڑائی۔ اس کا موڈ پہلے سے خراب ہی تھا۔ تائی اماں کی تفتیش نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ ڈھیلے ہاتھوں سے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر بالٹی میں

ڈالتی جارہی تھی جب طارق کی آمد ہوئی۔
"اف میں نہیں دیکھ سکتا یہ۔" اس نے ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھ کر ایکٹنگ کی۔ ناہید نے کہا کچھ نہیں، مگر جن نظروں سے اسے دیکھا اس کا مطالبہ تھا کہ "آگئے نوٹنکی!"
"میری نازک سی پرنسز اور کہاں یہ محنت، مشقت، میری اگاتھا کرسٹی کی مخروطی انگلیوں میں صرف قلم جچتا ہے۔ یہ کپڑے، صابن، سرف، پانی، یہ تمہارے شایان شان نہیں، سچ کہوں میرے نازک سے دل پر چھریاں چل جاتی ہیں۔"
"کچھ ڈائیلاگز میرے لکھنے کے لیے بھی چھوڑ دو، سارے تم ہی بول لوگے؟" ناہید نے تیکھی چتونوں سے اسے ایک نظر دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔
"لاؤ میں ہیلپ کردوں۔" طارق آگے بڑھا۔
"بس بس تھینک یو ویری مچ، کیوں مجھے تائی اماں سے باتیں سنواؤ گے۔" ناہید نے ڈپٹ کر اسے روکا۔
"ویسے اکثر میں اپنی امی کے ساتھ بھی کپڑے دھلواتا ہوں، جیسا کہ تم نے دیکھا ہی ہوگا۔"
"جیسا کہ تم نے کہا، وہ میں نے دیکھا تو ہے مگر تمہیں بھی یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ تمہاری ماں ہیں۔" ناہید نے اسی کی ٹون میں جواب دیا۔
"اور تم؟" سوال بے ساختہ تھا۔
"آف کورس، میں تمہاری کچھ بھی ہوسکتی ہوں، سوائے ماں کے۔" ناہید کا جواب بھی فوراً" آیا۔
"تمہاری اس بات سے میری نوک زبان پہ ایک جملہ مچل رہا ہے مگر تمہاری عادت سے ڈر لگتا ہے۔ غصے میں تمہارے ہاتھ جو آئے کھینچ مارتی ہو۔"
"تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموش رہو۔" ناہید نے کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھائی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔
"لاؤ میں اوپر لے جاتا ہوں۔" غیر متوقع طور پر وہ کچھ سنجیدگی سے بولا۔
"رہنے دو، ہمارا بوجھ ہے، ہم خود اٹھائیں گے۔"
ناہید کی شان بے نیازی اپنے عروج پر تھی۔
"میں دل و جان سے تمہارا ہر بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں۔"
"آگے پیچھے دیکھ کر ڈائیلاگ مارا کرو۔" وہ سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔
طارق نے بے ساختہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا، تائی امی کھڑی خونخوار نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔
"ہزار بار سمجھایا ہے، لڑکیوں سے الٹی سیدھی باتیں نہ کیا کر، تیرے باپ کو پتا چل گیا تو خبر لیں گے تیری۔" وہ اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں مگر طارق کا دل تو "لڑکیوں" میں اٹکا ہوا تھا۔
"لڑکیوں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ تڑپ کر بولا۔
"حنا کے پیچھے نہیں پڑا تھا؟ ہر وقت ہنسی مذاق، مخول، فالتو فالتو باتیں کرنا، وہ تو اچھا ہوا اس کی شادی ہوگئی، میری جان چھوٹی۔"
"وہ تو ہمارا ہنسی مذاق کا رشتہ تھا اور تو کوئی بات نہیں تھی۔"
"ہنسی ہنسی میں ہی "پھنسی" ہوجاتی ہے۔ ان ماں بیٹی کو تو خوش فہمی ہوگئی تھی کہ میں تیرا رشتہ لے کر وہاں جاؤں گی، وہ تو ایک روز میں نے ہی صاف صاف جتلا دیا تھا کہ طارق کی شادی اس کے ننھیال میں ہوگی، تب کہیں جا کر اس نے بیٹی کی چٹ منگنی پٹ بیاہ کیا۔"
"اوہ، تو یہ آپ تھیں جس کی وجہ سے اس نے راستہ بدلا۔" طارق نے انکشاف کرتی اماں کو بغور دیکھا۔
"پھر تو نے شاہینہ کو لارے میں رکھا، آئے دن وہ تتلی کی طرح منڈلاتی رہتی تھی یہاں۔ اس کا پتا صاف کیا بڑی مشکل سے۔"
"آہ تو وہ آپ تھیں اماں، ظالم سماج، ہائے وہ لڑکپن بلکہ بچپن کی محبتیں۔ مگر یہ تو میرا سچا اور پکا عشق ہے۔" طارق کے دل نے دہائیاں دیں۔
"اللہ نے اچھی شکل کیا دے دی، ہر جگہ راجہ اندر بنا پھرتا ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔
"اس میں میرا کیا قصور ہے اگر اللہ نے اچھی پرسنالٹی دی ہے۔ اس لیے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہوں۔" آخری بات طارق نے اپنے دل میں کہی۔ امی سے کچھ بعید نہ تھا دو منٹ میں اس کی اوقات یاد دلادیتیں۔
"باپ کی دوائیاں لے آئے تھے؟" ان کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ بے اختیار گڑبڑا گیا بروقت کوئی بہانہ بھی نہ سوجھا۔
"پرسوں رات سے بتایا ہوا ہے دماغ ٹھکانے پر ہو تو کچھ یاد رہے۔ اب شام میں وہ آجائیں گے پھر ان کی سنو، بیٹے کے نکمے پن اور نالائقی کی ساری ذمہ داری مجھ پر آجائے گی کہ ماں کے لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے۔ حالانکہ وہ لاڈلا بنا بنایا باپ پر گیا ہے۔"
طارق نے تصدیق طلب نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔
"ہاں تو اور کیا ان کی حرکتیں کیا کم تھیں شادی سے پہلے۔ سب جانتی ہوں میں۔" وہ بے خیالی میں بولتے ہوئے اک دم چونکیں۔
"تمہیں تجھے ڈانٹ کیوں رہی تھی بھلا؟"
انہوں نے اپنے دماغ پر زور دیا ان کی یادداشت کا یہ حال بھی خوب تھا چند منٹ پہلے کی کہی ہوئی بات بھول جاتیں۔
"آپ دوائیاں لانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔"
"ہاں میری دراز میں سے لے لینا پیسے اور ہاں بات سن۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔
"ہزار کا نوٹ لینے کی ضرورت نہیں، پانچ سو کا لینا اور ستر روپے بچیں گے وہ۔"
"وہ میں لے لوں؟"
"دودھ لے آنا" ہر سودے میں سے رقم مارتا ہے، اپنا حصہ پہلے چاہیے جیسے ملازم ہو اس گھر کا۔" وہ اسے سناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
"کاش ملازم ہی ہوتا اس گھر کا، تنخواہ تو ملتی۔ اتنے ڈھیروں ڈھیر کام کرتا ہوں کوئی تنخواہ کوئی چھٹی نہیں فقط باتیں ہی سننے کو ملتی ہیں اماں باوا کی۔" کاش میں بیٹے کے بجائے ان لوگوں کی بیٹی ہوتا کیسے عیش ہوتے میرے آئے دن شاپنگ کرتا، نئے نئے فیشن کے ڈھیروں ڈھیر ملبوسات بنواتا، آئس کریم، برگر، پزا، چاٹ، حلیم جو دل چاہے بازار سے منگوا کر کھاتا اور ڈٹ کر کھاتا۔ کالج، یونیورسٹی آنے جانے کی کوئی ٹینشن نہیں، دل چاہا تو پڑھ لیا ورنہ گھر پر بیٹھ کر عیش کرتا۔"
اپنے خیالات میں گم اسے علم ہی نہ ہوا کہ ناہید کب سے آخری سیڑھی پہ کھڑی اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔
"پہلے تو مجھے صرف شک تھا مگر آج یقین ہوگیا۔"
"نہیں۔ یہ کب آگئی!" وہ گڑبڑا گیا۔
"گھنٹوں کھڑے ہو کر خلا میں تکتے رہنا، منہ ہی منہ میں بڑبڑانا، کبھی مسکرانا، کبھی غرانا، تم کچھ ایب نارمل سے نہیں ہوتے جارہے؟" ناہید مشین میں سے کپڑے نکال کر ٹب میں ڈالتی جارہی تھی۔
"غیر معمولی باصلاحیت اور ذہین افراد کو یہ دنیا اسی طرح ٹریٹ کرتی ہے، پاگل، دیوانہ اور ایب نارمل کہہ کر حالانکہ اصل ایب نارمل دوسرے لوگ ہوتے ہیں ہم جیسے نہیں۔ زمین پہ رینگنے والے کیڑے مکوڑے میری ذہانت کے ماؤنٹ ایورسٹ تک نہیں پہنچ سکتے۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا، سیکنڈوں میں خود کو سنبھال کر پھر شروع ہوگیا۔
"یہ جو لفظ تم اکثر استعمال کرتے ہو اپنے بارے میں "ذہین" اس کے ہجے آتے ہیں؟" ناہید کا لہجہ سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔
"تم میری بے عزتی کررہی ہو۔" اس نے شکوک نگاہوں سے ناہید کو گھورا۔
"نہیں، بے عزتی تو ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہو۔" ناہید کا اطمینان قابل رشک تھا۔
"میری محبت کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"
"بے فکر رہو، میں کوئی جائز فائدہ بھی نہیں اٹھاؤں گی، فی الحال تو تم بڑے ابو کی دوائیاں لے آؤ۔ ورنہ ان کے شور شرابے کی آوازیں ہمارے پورشن تک آتی ہیں باقی محلہ تو سنتا ہی ہے۔"
"یہ لڑکا ہونا بھی بہت بڑی برائی ہے۔"

"ہاں! اگر تم جیسا ہو تو۔"
"جیسا بھی ہوں' اب تو تمہارا ہوں۔"
"کتنے عرصے کے لیے؟"
"پوری زندگی کے لیے۔"
"اتنا عرصہ کون جھیلے گا تمہیں' مجھ میں قوت برداشت ویسے ہی کم ہے۔"
"طارق!" اس کے منہ کھولنے سے پیشتر تائی اماں کی پاٹ دار آواز گونجی۔ "دوائی کے لیے پیسے لیے یا نہیں؟"
"جی' ابھی آرہا ہوں۔" وہ بوکھلا کر اندر کی طرف بھاگا۔
"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" ناہید نے چوٹ کی۔
"ڈرنا' مرنے سے بہتر ہے۔" وہ جاتے جاتے بھی جواب دے کر گیا۔

☼ ☼ ☼

حاضر جوابی اس گھرانے کا طرۂ امتیاز تھی۔ ہر بڑے چھوٹے میں یہ وصف موجود تھا ہاں لیکن ثمینہ شاید کچھ مختلف تھی' پتا نہیں تھی بھی یا صرف مختلف لگتی ہی تھی' وہ ناہید کی چھوٹی بہن تھی' زیادہ چھوٹی نہیں بس ڈیڑھ دو سال چھوٹی' دھیما مزاج' کم گو' گھریلو کام کی شوقین اور پھرتیلی' اس معاملے میں بھی وہ ناہید کی الٹ تھی۔

ناہید نے سارے کپڑے دھو کر پھیلا دیے تھے اب مشین دھو کر صحن کا فرش خشک کر رہی تھی۔
"تم کپڑے دھوتی ہو' انہیں نچوڑتی نہیں ہو۔" تائی امی اوپر سے ہو کر آئی تھیں اور جو کچھ دیکھ کر آئی تھیں وہ ان کا بلڈ پریشر ہائی کرنے کے لیے کافی تھا۔
"پوری چھت پر پانی پانی ہو رہا ہے' کوئی دو تین بالٹی پانی نکلا ہے کپڑوں میں سے' نچوڑ کر پھیلا دیتیں تو کیا حرج تھا؟" انہوں نے کچھ سچ اور کچھ مبالغے سے کام لیا۔
"گیلے کپڑے رسی پہ پھیلا دو تو جلد یا بدیر پانی نکل ہی جاتا ہے۔ اب دھونے میں بھی محنت کرو اور نچوڑنے میں بھی طاقت لگاؤ۔ اتنی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" ناہید نے حسب عادت اور حسب توقع ان کے اعتراض کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کھٹاک سے جواب دیا۔

اور وہ وائپر مقررہ جگہ پر رکھ کر اندر چلی گئی۔
تائی اماں حیران' حق دق اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں حالانکہ وہ تو سب سے ہی اسی طرح بات کرتی تھی مگر تائی ہر بار یوں حیران ہوتیں جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہیں۔
"یا اللہ' کیا کرے گی یہ لڑکی سسرال جا کر" انہوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائیں۔
یہ سوال بڑی پھپھو نے کیا تھا' اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں وہ بھی ناہید کے "متاثرین" میں شامل تھیں اور اکثریت کی طرح اس سے خار کھاتی تھیں۔
"سب کو نکیل ڈال کر رکھوں گی مشرقی عورت بن کر ظلم و زیادتی کسی کی نہیں برداشت کروں گی۔" ناہید نے تن فن کرتے ہوئے جواب سے نوازا تھا۔
تائی امی کو وہ جواب یاد آگیا تھا وہ ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے اندر کی جانب بڑھیں۔
"اب اندر کیا کرنے گئی ہے" برآمدے سے وہ اندر کمرے میں پہنچیں۔
ناہید فریج کھولے اندر کا معائنہ کر رہی تھی۔
"میں نے سنا تھا کہ آپ نے آلو بخارے کی چٹنی بنائی ہے۔" ناہید کا منہ بدستور فریج میں ہی گھسا ہوا تھا۔
"کون کرتا ہے میرے گھر کی جاسوسی؟" تائی امی مشتعل ہوئیں۔
"گھر کا بھیدی' لنکا ڈھائے۔" ناہید نے مختصر لفظوں میں مکمل بات کی۔
"آنے دو اس طارق کے بچے کو' بتاتی ہوں اسے۔" وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔
ویسے وہ اتنی کمزور اور بے بس تو نہ تھیں کہ کوئی بھی یوں دھڑلے سے ان کے گھر' کچن اور فریج میں گھس جائے' مگر بات دراصل یہ تھی کہ ناہید لاڈلی تھی اپنے تایا کی' وہ اپنی اس بھتیجی پہ جان چھڑکتے تھے' اگر وہ جھوٹے منہ بھی تایا سے فرمائش کر دیتی تو تائی کو وہ خاص الخاص چٹنی بنا کر دینا پڑتی کہ وہ چٹنی بھی زور آور اور تیز تھیں' تایا جی اپنی جگہ بڑے دبنگ تھے اور پھر جہاں تک انصاف کی بات ہے تو ناہید بھی اکثر ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے ہی آتی اوپر سے' یہ اور بات کہ تائی اس میں دو چار نقص نکالتیں پھر کھاتیں اور کھلاتیں' مگر اس وقت تو معاملہ اپنی طرف کا تھا۔
"یہ ناخلف اولاد؟" انہوں نے دل ہی دل میں دو چار گالیاں اپنے صاحبزادے کو دیں پھر ناہید سے مخاطب ہوئیں۔
"ہٹو۔ میں نکالوں۔" انہوں نے آگے کی کچھ چیزیں تھوڑی سرکا کر پیچھے سے بوتل برآمد کی اور اس میں سے ایک پیالی چٹنی نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔
اتنی مہنگی چٹنی' یوں بٹنے میں ہی چلی جاتی ہے ابھی بڑی چھوٹی نندیں آئیں گی' کھائیں گی بھی' باندھ کر بھی لے جائیں گی' مگر خیر وہ اعتراض کرنے والی کون۔ محنت ان کی تھی مگر لاگت شوہر کی اور وہ شاہ خرچ تھے۔ بیگم نے ایک کلو آلو بخارے کہے وہ دو ڈھائی کلو لے آئے تاکہ دوسرے لوگ بھی کھالیں۔
ناہید ان کا شکریہ ادا کر کے اوپر آگئی۔ اچھا خاصا کھلا پورشن تھا چار کمروں پر مشتمل۔ برآمدہ تھا' کچن' باتھ روم' اسٹور' سب کشادہ' لیکن پھر بھی کبھی چھوٹا لگنے لگتا جگہ تنگ پڑ جاتی کہ افراد ہی ماشاء اللہ اتنے تھے امی' ابا' تین بہنیں' چار بھائی' دادی' شادی شدہ بڑی آپا اپنے چار بچوں سمیت آجاتیں تو گھر کی رونق اور آبادی میں مزید اضافہ ہو جاتا اور یہ رونق اور آبادی کا اضافہ آئے دن کا معمول تھا کہ آپا کا گھر زیادہ دور نہ تھا پھر وہ سسرال سے الگ رہتی تھیں لہٰذا وہ اکثر یہیں پائی جاتی تھیں۔
ناہید نے چٹنی کی پیالی فوراً فریج میں رکھی' مگر دادی کی عینک لگی عقابی نظروں نے اسے دیکھ ہی لیا۔
"کیا لائی ہے؟"
"آلو بینگن کا سالن ہے۔"

"ساجدہ کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا پکانے کو، جب دیکھو آلو بینگن، بینگن کا بھرتا، بینگن کے کباب، بینگن کے پکوڑے اس کا دل ہی نہیں بھرتا اس سبزی سے۔ میرے بیٹے نے اس کا نام ساجدہ بینگن صحیح رکھا ہے۔" دادی کو بینگنوں سے سخت چڑ تھی اور تائی واقعی یہ سبزی کچھ زیادہ ہی پکاتی تھیں، مگر اس وقت تو.....

"کل پرسوں کا بچا ہوا سالن فریج میں رکھا تھا، میں لے آئی۔ چاولوں کے ساتھ کھالوں گی وہ تو ایک آدھ دن بعد پھینک دیتیں۔" ناہید نے لاپروائی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ مسالا وغیرہ، رنگ روپ بھی ہے یا بس نرے بینگن ہی ہیں۔"

"جب آپ کو بینگن پسند نہیں، کھانا نہیں تو بے کار کے سوال جواب کیوں کر رہی ہیں۔" ناہید جھنجلا کر کمرے میں گھس گئی۔

"توبہ ہے، اس لڑکی کی زبان؟" دادی بے بسی سے اس کی پشت دیکھ کر رہ گئیں۔

کم تو خیر وہ بھی نہیں تھیں۔ کسی زمانے میں، جب ان کا سکہ گھر میں چلتا تھا، بہوؤں کو، بیٹوں کو انہوں نے خوب اپنی مٹھی میں دبا کر رکھا، بڑے شاندار معرکے ہوا کرتے تھے۔ پوتے، پوتیوں کے ساتھ اب بھی کبھی ٹکراؤ ہو جاتا تھا، مگر اب تو ان کی راجدھانی محض اپنے ایک پلنگ اور ایک کرسی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسے جاننے والے اور کہنے والے کہتے کہ ناہید صورت اور سیرت دونوں اپنی دادی سے بے حد مشابہ تھی، گو کہ دادی اس بات سے انکار کرتی تھیں اور ناہید کچھ بن کر پوچھتی "کیا واقعی؟"

☼ ☼ ☼

ناہید کمرے میں گھسی جانے کیا تلاش کر رہی تھی، درازیں کھول کھول کر دیکھ لیں، تکیے الٹ پلٹ کیے، پھر ثمینہ کو آواز لگائی۔

"وہ کتاب کہاں ہے جو میں ساحر بھائی سے لائی تھی۔"

"کون سی؟ پائیلو کوئیلو کی؟"

"ہاں "الکیمسٹ" کی بات کر رہی ہوں، تم نے ختم کر لی یا نہیں؟"

"میں نے تو ختم کر لی تھی، وہ الماس لے گئی ہے ذرا۔"

"ذرا؟ اس کا کیا مطلب؟ پوری سالم کتاب ہی لے کر گئی ہوگی نا، قیمت معلوم ہے اس کی؟ اور الماس کی حرکتیں، حشر بگاڑ دیتی ہے وہ کتاب کا، میں نے پہلے بھی منع کیا تھا نا کہ میری لائی ہوئی کتابیں اسے مت دیا کرو، میرے پاس فالتو دولت نہیں ہے ڈنڈ بھرنے کے لیے، اب فوراً" منگوالو کتاب میں واپس کرنے جا رہی ہوں۔" ناہید زور زور سے چیخ رہی تھی۔

"کس سے منگواؤں، خود ہی جانا پڑے گا۔"

ثمینہ تن فن کرتی سیڑھیاں اترنے لگی اور پانچ منٹ بعد ہی کتاب لا کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

"امی! میں بڑی دادی کے پاس جا رہی ہوں۔" دادی کی بڑی بہن تھیں، بڑی دادی کہلاتی تھیں اور ان کا کنبہ پڑوس میں ہی آباد تھا۔

کتاب ہاتھ میں لیے وہ سیدھی ساحر کے کمرے میں جا پہنچی۔

"جناب ساحر صاحب! آداب۔"

"وعلیکم آداب!" وہ بیٹھے بیٹھے ہی ذرا جھک کر کورنش بجالائے۔

"یہ، آپ کی امانت۔" ناہید نے کتاب میز پر رکھی۔

"بڑی جلدی پڑھ لی۔"

"پرانی عادت ہے۔" ناہید نے کندھے اچکائے۔

"یہ جو مطالعہ ہوتا ہے نا، یہ کھانے کی طرح ہوتا ہے کھانے کو آہستہ آہستہ، آرام آرام سے خوب چبا چبا کر کھایا جانا چاہیے، تم لوگ جلدی جلدی نگلتے ہو۔"

"اتنا وقت کس کے پاس ہے، زندگی مختصر، حالات خراب، حال کشیدہ، مستقبل نامعلوم، جو لکھ پڑھ لو غنیمت" ناہید کی فلاسفی ذرا الگ ہی تھی اور ساحر اس سے ہمیشہ غیر متفق۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ حالات غیر یقینی ہیں اس لیے صبح کے ناشتے کے ساتھ ہی لنچ اور ڈنر بھی کر لیا جائے۔" ساحر کا انداز حسب عادت کچھ تیکھا ہو گیا۔

"میں لڑنے نہیں آئی آپ سے۔"

"خیر یہ کام تو تم دوسروں کے ساتھ بخوبی کر لیتی ہو۔"

"آپ کی طنزیہ باتوں سے بوریت ہوتی ہے مجھے۔" ناہید نے میز کی سب سے اوپر والی دراز کھولی۔

"بھلا میری مجال جو میں تم پر طنز کروں، ویسے بھی میں نے حقیقت بیان کی ہے، طنز نہیں کیا۔" ساحر نے صفائی پیش کی یہ اور بات کہ لبوں پہ مسکراہٹ بڑی شرارتی تھی۔

"وہ حقیقت جو انسان کو ناگوار گزرے اُسے ہی طنز کہتے ہیں۔" ناہید نے دراز کی تلاشی لیتے ہوئے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ایسے ناگوار کام کرتی کیوں ہو؟" ساحر نے اسے غور سے دیکھا۔

"شاید عادتاً" "یا شاید فطرتاً"۔" ناہید نے دراز میں سے ایک چاکلیٹ برآمد کر ہی لی، ریپر کھول کر منہ میں ڈالی اور لطف اندوز ہونے لگی۔

"اچھا چلو، یہ بتاؤ کتاب کیسی لگی؟"

"اچھی ہے بلکہ بہت اچھی۔" ناہید شروع ہو گئی، بیچ بیچ میں ساحر بھی لقمے دیتے رہے۔ پھر ہمیشہ کی طرح بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ ملکی، غیر ملکی ادب، ادیب، جانے کس کس کو کھنگال لیا۔ ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی پر گفتگو پہنچی۔ وہاں سے قرۃ العین اور انتظار حسین کے ناولز، ابوالفضل صدیقی کے افسانے، منٹو، کرشن بیدی، عصمت چغتائی، زیر بحث آئے اور پھر او ہنری ایذرا پاؤنڈ اور رابرٹ لوئیس اسٹیونس پر شروعات ہی ہوئی تھی کہ ناہید اک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کے ساتھ باتیں کرنے میں یہی تو ایک مصیبت ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ بہت ضروری کام تھا گھر پر، امی ڈنڈا ہاتھ میں لیے انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اچھا تم کام بھی کرتی ہو؟"

"اتنا بڑا ڈھیر دھویا ہے آج کپڑوں کا" اس نے جتایا۔

"اوہ!" ساحر نے ہونٹ سکوڑے۔ "مجھے دلی ہمدردی ہے تم سے۔"

"اچھا ایک بات سنو یہ بتاؤ تمہارا اتنا اچھا مطالعہ ہے، دوران گفتگو ذہنی سطح بھی کافی کشادہ اور بلند نظر آتی ہے پھر تم اپنی تحریروں میں چینج کیوں نہیں لاتیں؟ کب تک مخصوص قسم کے ہیرو، مخصوص قسم کی ہیروئن اور وہ فینٹیسی قسم کا ماحول، تم بور نہیں ہوتیں یہ سب لکھ لکھ کر؟" ساحر بہت صاف گوئی سے اس کی تحریروں پر تنقید کرتے تھے اور اس پر ناہید سے بھی چوڑی بحث ہوتی تھی، مگر اس وقت وہ جلدی میں تھی۔

"بہت سے پڑھنے والوں کو ایسی ہی تحریریں پسند ہیں۔ لوگ جو سراہتے ہیں، فرمائش کرتے ہیں، میں وہی لکھتی ہوں۔"

"لوگوں کے لیے لکھتی ہو یا اپنے لیے؟"

"میں تو صرف پیسوں کے لیے لکھتی ہوں، تھوڑی بہت شہرت اور لوگوں کی پسندیدگی، یہ اضافی بونس ہے اور رہی بات کتھارسس وغیرہ کی تو اندر کی بھڑاس نکالنے کے لیے میری زبان کافی ہے اس کے لیے میں اپنے قلم کو زحمت نہیں دیتی۔" ناہید سنجیدگی سے بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"یہ لڑکی بھی بس عجیب ہی ہے، اتنی صاف گوئی بھی اچھی نہیں، خصوصاً" لڑکیوں کے لیے۔" ساحر جو پہلے مسکرا رہے تھے کچھ سوچ کر سنجیدہ ہو گئے۔ اپنی اسٹک کے سہارے کمرے سے باہر آتے ہوئے ان کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں عدالت لگی ہوئی تھی۔ دادی کو اگلے

روز پتا چلا تھا کہ ناہید کے ہاتھ میں جو پیالی تھی اس میں آلو بینگن نہیں بلکہ آلو بخارے کی چٹنی تھی۔ تائی نے اپنی ساس کا حصہ بھیج دیا تھا۔ اب وہ ناہید کے لتے لے رہی تھیں۔

"اتنا جھوٹ، فریب وہ بھی دادی سے۔ تیرے باپ کی ماں ہوں میں۔ میں ہی رہ گئی تھی چال بازی دکھانے کو۔"

شدت جذبات میں وہ اتنے زور سے چیخیں کہ کھانسی آگئی اور ایسی آئی کہ وہ کھانس کھانس کر دوہری ہوگئیں۔ ناہید نے ان کو پانی پلایا، دیر تک کمر سہلائی اور کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ کچھ بولنے کے قابل ہوئیں تو ایک بار پھر وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"ذرا سی چیز کی کیا اوقات ہے، پیٹ میں گئی، مٹی ہوگئی، ارے میں کیا ساری کھا جاتی اگر سچ بول دیتی تو؟ پڑھ لکھ کر یہی سیکھا ہے۔ دھوکا دینا، مکاری دکھانا، کیسی صفائی سے جھوٹ بولا۔ میں بھلا کتنے روز کی مہمان ہوں جو میرے ساتھ یہ چھل بل کھیلا۔" دادی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی لغت میں سے الفاظ نکال رہی تھیں جن کے ذریعے پوتی کو شرمندہ کیا جاسکے۔ مگر ناہید ان لوگوں میں سے کہاں، وہ تو کچھ اور ہی شے تھی۔

"دادی! اب میں کچھ کہوں، آپ کو میری بات بری تو لگے گی مگر آپ ہی کی پوتی ہوں، کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے تھے مگر مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں اور جب گھر میں فریج آیا تب دونوں میں تالا لگا کر رکھتی تھیں آپ اپنی نگرانی میں ناشتا، کھانا پکواتی تھیں اور آپ کے سامنے ہی دستر خوان بچھتا تھا آپ کی راشن بندی میں آپ کی بہوئیں یا ان کے بچے کتنا پیٹ بھرتے تھے۔ کتنا نہیں، ہم بھی اسی ماحول میں پل کر بڑے ہوئے ہیں۔ ایک انڈا، ایک پیالہ دودھ، ایک پلیٹ چاول یا کسی بھی اچھی بری چیز کے لیے نہ ہم ایثار کرسکتے ہیں، نہ قربانی دے سکتے ہیں۔" ناہید بولتی جارہی تھی اور دادی کی آنکھیں حیرانی کے باعث حلقوں سے ابلنے کو تھیں۔

"ہوئی ماں، تیری میا نے کتنا زہر گھول رکھا ہے اپنی اولاد کے دماغوں میں، ارے کیا ظلم کے پہاڑ توڑے تم لوگوں پہ، کم آمدنی تھی۔ اتنا بڑا کنبہ، تین کی چھوٹی کوارٹر، گھر چلانا بھی تھا، بنانا بھی تھا، کفایت شعاری سے کام لیا تو گھر بنا، سب کھا چاٹ کر برابر کردیتے تو آج کوفٹ پاتھ پر بیٹھے ہوتے تم سب۔" دادی نے اپنے احسان گنوائے بھی، جتائے بھی۔

امی وہیں بیٹھی تھیں، سلائی مشین سنبھالے۔ بے چاری مرنجان مرنج سی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد ان پر نہیں گئی تھی۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں ناہید کو چپ ہوجانے کا اشارہ کیا۔

"گھر تو بن ہی جاتا، پانچ سال پہلے نہیں تو پانچ سال بعد ہی سہی۔ اس کے لیے فاقے کروانے ضروری تھے؟"

ناہید نے ماں کی آنکھوں کا اشارہ دیکھ بھی لیا اور سمجھ بھی لیا، مگر اف یہ زبان، قابو میں رہتی تو بات ہی کیا تھی۔

"کس کو کروائے ہیں فاقے، ارے کون بھوکا رہا میرے دور میں، میں نے کیا مکھن ملائی سے روٹی کھائی اور تم لوگوں کو سوکھا ٹکڑا پکڑا دیا؟ کوئی مجھے بتائے تو۔" دادی بلبلا رہی تھیں، غصے کے مارے منہ سے جھاگ نکلنے کو تھے۔

"تمہیں بھی مرض ہے بولنے کا۔ ابھی شور شرابا سن کر نیچے سے تائی آجائیں گی برابر سے بڑی دادی، بلاوجہ کا تماشا کھڑا ہوجائے گا۔" ثمینہ نے خود سے ڈیڑھ سال بڑی بہن کو گھورا۔

"سچ تو کسی سے برداشت ہی نہیں ہوتا۔" ناہید بڑبڑاتی ہوئی منظر سے غائب ہوگئی، جتنی دیر وہ وہاں رہتی اتنی دیر حالات مزید خراب ہونے کا امکان تھا۔ وہ غصے میں کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گئی، تھوڑا سا لکھا پھر کتنی ہی دیر صفحے کو گھورتی رہی، ذہن ماؤف ہورہا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھے۔ بے زار ہو کر اس نے قلم بھی ایک طرف پٹخ دیا اور سیدھی ساحر کے پاس جا پہنچی۔

"لوگ آخر اپنے بارے میں سچ سننا برداشت کیوں نہیں کرتے؟"

"اس لیے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے اور کڑواہٹ سب ہی کو ناگوار گزرتی ہے۔ بائی دا وے ہوا کیا ہے؟"

"لڑائی۔"

"ایسا کوئی ہے جس سے تمہاری لڑائی نہ ہوئی ہو؟" ساحر نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو ابھی تک غصے سے تمتما رہا تھا۔

"ہاں، آپ ہیں نا۔" ناہید نے ترنت جواب دیا۔

"بس اسی وجہ ہے کہ میں تمہیں "برداشت" کرلیتا ہوں اس لیے اب تک میرے ساتھ تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔" ساحر بہت آرام سے کہہ رہے تھے۔ ناہید کے چہرے کی تمتماہٹ جو کم ہورہی تھی اک دم ہی بڑھ گئی۔

"آپ کو میں نے ایسا کیا کہا جو برداشت کرنے کا طعنہ دے رہے ہیں؟" ناہید کا انداز تیکھا ہوگیا۔

"تمہیں شاید پتا نہیں چلتا مگر کئی بار تم میرے گھر والوں کے متعلق ایسے تبصرے کرجاتی ہو کہ کوئی اور ہوتا تو بڑا زبردست جھگڑا ہو۔"

"اچھا۔ وہ" ناہید سے فوری طور پہ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ سچ تھا کہ وہ اکثر چھوٹی دادی اور ان کی فیملی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتی تھی اور ساحر ہنس کر ٹال جاتے تھے۔

"وہ تو آپ بھی برا مانتے ہیں، لگتا تو نہیں ہے، اتنے دھیمے اور نرم مزاج ہیں، میں تو سمجھتی تھی کہ آپ میں "مائنڈ" کرنے والی حس موجود ہی نہیں۔" کچھ دیر بعد وہ بولی تھی۔

"جب مائنڈ ہے تو مائنڈ بھی کریں گے، بس بات صرف اتنی سی ہے کہ جذبہ کوئی بھی ہو آپے سے باہر نہیں ہوتے۔" ساحر مسکرائے۔

"جیسے کہ میں؟" ناہید نے تصدیق چاہی۔

"بالکل جیسے کہ تم۔"

"ویسے کم تو آپ بھی نہیں ہیں، مخمل میں لپیٹ کر ہی سہی، جوتا تو مار دیتے ہیں، شوگر کوٹڈ کونین کا ذخیرہ آپ کے پاس بھی ہے۔" ناہید نے انہیں گھور کے دیکھا۔

"تھوڑی سی تم لے لو، ضروری نہیں کہ ہر ایک پر ڈائریکٹ سنگ باری ہی کی جائے کبھی شوگر کوٹڈ کونین بھی استعمال کرلیا کرو۔" انہوں نے فراخ دلی سے پیش کش کرتے ہوئے اسے نصیحت بھی کی۔

"بعض لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں یا تو جوتا کھینچ کر مارا جائے یا پتھر۔" ناہید کا انداز بے لچک تھا۔

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی، اب میں نے ہی تو ٹھیکہ نہیں لیا ہوا نا تمہیں سدھارنے کا۔" ساحر کی بے نیازی اور لاپروائی کے پیچھے کسی قدر خفگی چھپی ہوئی تھی جو بظاہر محسوس نہیں ہوتی تھی مگر احساس رکھنے والا "دل" شاید سمجھ لے۔

"کیا آپ مجھ سے ناراض ہورہے ہیں؟" ناہید کو شک ہوا، احساس، پتا نہیں ہوا کہ نہیں۔

"تم تو خود اکثریت سے ناراض رہتی ہو، تمہیں کسی کی ناراضی کی کیا پروا۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔" ناہید جھٹ سے کہنے لگی۔ "میں اکثر یہ بات سوچتی ہوں پوری دنیا میں واحد، آپ ہی ہیں جو سب سے زیادہ مجھے جانتے اور سمجھتے ہیں۔"

"عزت افزائی کا شکریہ۔"

"دیکھا، آپ سے کچھ دیر باتیں کیں تو میرا سارا غصہ غائب ہوگیا اور موڈ بھی اک دم فریش۔" ناہید چہکی۔

"اس لیے کہ جو کچھ تم اپنے ساتھ لائی تھیں وہ سب یہاں آگیا ہے۔" ساحر نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"پھر وہی مخمل کا جوتا۔" ناہید خلاف توقع ہنس پڑی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اجازت ہے؟"

"اگر نہ کہوں گا تو نہیں جاؤ گی؟"

"جانا تو ہے مجھے۔ آپ کے کہنے سے رکوں گی تھوڑی۔" ناہید کی صاف گوئی پھر عود کر آئی۔

"پھر پوچھا کیوں؟"

"یونہی آپ کو عزت دے رہی تھی۔" وہ جواب

سنے بغیر چھپاک سے باہر نکل گئی۔

"عزت ...؟" ساحر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ انہیں یاد کیوں نہیں رہا' بھلا اس لڑکی سے کوئی جیت سکتا ہے؟

☆ ☆ ☆
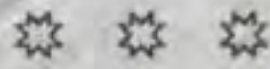
ابو کو چائے بنا کر دی' امی کو ان کی دوائی دی۔ وہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھیں' گھڑی کی سوئیوں پہ ایک عجلت بھری نگاہ ڈال کر وہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"ثمینہ! رات کا کھانا تم پکا لینا آج۔ مجھے اپنی کہانی مکمل کرنی ہے۔"

"تقریباً" روزانہ میں ہی پکاتی ہوں۔" ڈائجسٹ میں غرق ثمینہ نے نظر اٹھائے بغیر اسے جتایا۔

"کیوں' پرسوں روٹیاں میں نے نہیں پکائی تھیں۔" ناہید نے چمک کر کہا۔

"مہینے میں چار دن روٹیاں پکالیں تو کیا ہوا' باقی کے چھبیس دن تو میں ہی کام کرتی ہوں۔"

"تو میں بھی کوئی فارغ نہیں بیٹھی رہتی' نہ تمہاری طرح ٹی وی کے آگے ڈٹی رہتی ہوں' کاغذ قلم کی مزدوری کرتی ہوں' جو چار پیسے آتے ہیں وہ گھر میں ہی خرچ ہوتے ہیں تم سب پر۔" ناہید نے بغیر کسی لحاظ کے اسے سنادیں۔

"ہاں' تمہاری کمائی سے تو گھر چل رہا ہے' کنبہ چل رہا ہے' ابو صبح سے شام تک جو محنت کرتے ہیں وہ آمدنی جانے کہاں خرچ کرتے ہیں۔ امی کو سلائی کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ شاید اپنے کسی خفیہ اکاؤنٹ میں ڈال دیتی ہیں۔" ثمینہ بھڑک اٹھی۔ بہن نے طعنہ ہی ایسا دیا تھا۔ ڈائجسٹ ایک طرف رکھ' وہ ناہید کو سبق سکھانے کے درپے ہوگئی۔

"مجھے اپنی تحریر مکمل نہ کرنی ہوتی تو بتاتی۔" خلاف توقع ناہید نے میدان چھوڑ کر پسپائی اختیار کی۔

اس کا قلم تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ خیالات کی ایک رو تھی جو روانی سے بہتی چلی آرہی تھی۔ نیچے سے شور شرابے کی آوازیں آرہی تھیں بلکہ آوازیں کہاں' فقط ایک ہی آواز تھی' تائی اماں کی یقیناً طارق کی شامت آئی ہوگی' اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں' جو روز اور اماں دونوں سے سنتا تھا۔

"اف یہ لوگ۔" ناہید نے اپنے دکھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا اور ایک بار پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

تحریر اختتامی مراحل میں تھی' جب کوئی اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ ناہید نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر دیکھا' ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بدستور اپنے کام میں منہمک رہی۔ اس کی تحریر مکمل ہو ہی گئی۔ آنے والے کو دس منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

"کیا ہوا' آج کی مار پڑ گئی کیا؟" ناہید نے ایک اطمینان بھری سانس لے کر قلم ہاتھ سے رکھا۔

"تنگ آگیا ہوں میں اس روز کی کل کل سے۔" طارق کا چہرہ جانے غصے سے سرخ ہو رہا تھا یا خفت سے۔

"ظاہر ہے جب محلے والے روز کے اس تماشے سے تنگ آئے ہوئے ہیں تو تم تو پھر "متاثرہ فرد" ہو۔" ناہید نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"ابا کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے' اچھی بھلی گزر رہی تھی' شادی کا بھوت سوار ہوگیا ہے سر پر۔"

"اپنی؟" ناہید اچھل پڑی۔

"اپنی نہیں "میری" بے وقوف۔" طارق نے برا سا منہ بنا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اللہ رحم کرے' کس بے چاری کا برا وقت آیا ہے۔" ناہید زیر لب بڑبڑائی۔

"دونوں میاں بیوی ایکا کر کے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ کوئی اور بہتر نوکری تلاش کروں' جس میں تنخواہ زیادہ ہو تاکہ ان کا بہو لانے کا ارادہ پورا ہو سکے۔" طارق اپنی دھن میں مگن اسے بتا رہا تھا۔

"اب میں راتوں رات زیادہ تنخواہ والی نوکری کہاں سے تلاش کرلوں' موجودہ جاب ہی اتنی مشکلوں سے ملی ہے' ٹک کے کرتا رہوں گا تو تنخواہ بھی بڑھ ہی جائے

گی، ہے نا؟"

"ہوں صورت حال گمبھیر ہے۔" ناہید نے اپنی پیشانی کو مسلا۔

"یار! تو ایک بات سن میری۔" طارق نے اسے مخاطب کیا۔

"ہاں!" ناہید نے سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھائیں۔

"ایسا کرتے ہیں، ہم دونوں شادی کرلیتے ہیں۔ کچھ تو اپنا لکھنے پڑھنے سے کمالے گی، کچھ میں کمالوں گا، دونوں مل جل کر گزارا کرلیں گے۔" طارق کی تجویز پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"وہ جو تمہاری ایک سو ایک محبوبائیں ہیں، وہ کس دن کام آئیں گی؟"

"ساری کی ساری نکمی اور فضول، میں نے ہری جھنڈی دکھادی۔" طارق نے سچائی سے کام لیا۔

"اسی لیے جھٹ یہاں پہنچ گئے میرے پاس! میرے پاس بھی یہی جھنڈی ہے تمہیں دکھانے کے لیے۔" ناہید نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"میں مذاق نہیں کررہا، سیریس ہوں۔"

"اور میں تم سے زیادہ سیریس ہوں، سمجھے۔" ناہید نے شہادت کی انگلی اٹھائی۔

"تم مجھے لاابالی، نکما یا فضول قسم کا انسان سمجھتی ہو ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔ تم مجھے جو چاہو سمجھو میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کرو مگر یہ حقیقت ہے میں سچ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔" طارق بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"اف کیا وقت آگیا ہے، مجھ پر، تم جیسے باگڑ بلے سے یہ ڈائیلاگ سننے پڑ رہے ہیں۔" ناہید نے جیسے خود پر ترس کھایا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے تمہارا یہ ڈائیلاگ سن کر میں موم کی طرح پگھل جاؤں گی۔"

"کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی سے تو شادی کرے گی نا۔" طارق بحث پر اتر آیا۔ "تو مجھ سے کرلے کیا حرج ہے؟"

"اوہوں، نہ میں تمہاری عزت کرسکتی ہوں، نہ محبت۔ دن میں بیس بار تو ہمارا آپس میں ٹاکرا ہوتا ہے، شادی کیسے ہوسکتی ہے؟" ناہید نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہاری کہانیوں میں تو شادی ہوجاتی ہے، برسوں تک آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، پھر اچانک ایک دن انکشاف ہوتا ہے کہ سارے جھگڑے فساد کے پیچھے محبت چھپی ہوئی ہے۔" طارق کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔

"کہانیوں میں سب کچھ حقیقت نہیں ہوتا۔ کچھ خواب ہوتے ہیں، کچھ خیال، کچھ تصورات، کچھ خواہشات اگر خالی خولی زندگی کے حقائق بیان کرنا شروع کردیں تو کوئی بھی قبول نہ کرے۔ اصل زندگی میں اور افسانوں کی دنیا میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔" ناہید نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کہانیوں میں وہی سب ہوتا ہے، جو زندگی میں ہوتا ہے بلکہ کبھی تو کہانیوں میں بھی اتنے موڑ اور تبدیلیاں نہیں ہوتیں، جتنی اصل زندگی میں ہوتی ہیں۔" طارق نے اس سے اختلاف کیا۔

"تم بلاوجہ کی بحث کررہے ہو۔ بہت سے معاملات ہوتے ہیں جو دیکھنے پڑتے ہیں بالفرض یہ شادی ہو بھی گئی تو تائی کے ساتھ میری نہیں بنے گی روز کے فضیحتے ہوں گے، پہلے ان کے ساتھ پھر تمہارے ساتھ۔"

"ساس بہو کے جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ جھونپڑی سے لے کر شاہی محل تک، ہر جگہ ہیں۔"

"اف!" ناہید نے سر پکڑ لیا۔ "تمہاری یہی عادت مجھے زہر لگتی ہے، اپنی بات منوانے کے لیے بلاوجہ کی بحث، تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہاری باتوں سے قائل ہوکر "ہاں" کہہ دوں گی؟" ناہید نے تحمل کا چولا اتار پھینکا اور اپنے فطری رنگ میں آکر بے حد اکھڑ پن سے بولی۔

طارق کچھ دیر لب بھینچے اسے گھورتا رہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ویسے یہ بات لکھ کر رکھ لے کہ میرے علاوہ دنیا میں کوئی اور شخص نہیں ہے جس سے تیری "بن" سکے۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ "جل ککڑا کہیں کا۔"

☼ ☼ ☼

بابا ابا کی گھن گرج گھر کے درودیوار کیا پورا محلہ سن رہا تھا۔ موضوع وہی تھا صاحبزادے کی شادی۔ اب تو محلے کے لوگوں نے بھی آتے جاتے صاحبزادے سے پوچھنا شروع کردیا تھا۔

"اور بھئی رشتہ طے ہوا کہیں؟" نتیجتاً صاحبزادے گھر اور باہر دونوں جگہ بھنائے ہوئے پھر رہے تھے پھر تایا کی ایک اور فرمائش سن کر طارق تو خاموش ہوگیا اور تائی کی بڑبڑاہٹ شروع۔

"بھتیجی ہے لاڈلی ہے اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ چیونٹیوں بھرا کباب اپنے دسترخوان پہ سجالیا جائے۔" مگر وہ بھی بس اپنے بچوں کے سامنے ہی بڑبڑاتی رہیں۔ شوہر کے آگے تو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

"ابا کو بتادیجیے گا کہ ناہید انکار کردے گی کوئی فائدہ نہیں چچا سے بات کرنے کا۔" طارق نے ماں کو آگاہ کردیا تھا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ منع کردے گی تو نے کچھ کہا تھا اس سے؟" تائی نے مشکوک نظروں سے بیٹے کو گھورا۔

"آپ بال کی کھال مت نکالیں، جو کہا ہے وہ ابا تک پہنچادیں بس۔" طارق جھنجلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔

ابا تک بات پہنچ گئی، وہ کچھ دیر تک بیوی کی بات پر غور کرتے رہے پھر فیصلہ کن انداز میں بیوی سے گویا ہوئے۔

"میں نور الٰہی سے بات کرتا ہوں۔"

"آپ کیا بات کریں گے؟"

"دونوں لڑکیوں میں سے کوئی بھی دے دیں، ناہید کو یا ثمینہ کو۔"

"بٹ رہی ہیں، کوئی بھی دے دیں، ہمیں گھسیں گے بھائی بھاوج کے گھر۔ دنیا میں لڑکیاں ختم ہوگئی ہیں۔" بیوی بڑبڑائیں مگر ظاہر ہے کہ ان کی بڑبڑاہٹ انہی تک محدود رہنا تھی۔

تایا نے اپنے بھائی بھاوج سے اور اماں سے بات کی۔

"اماں، باوا موجود ہیں فیصلہ کرنے والے، میں بھلا کس گنتی ہوں۔" دادی نے کچھ بے زاری کا اظہار کیا۔

"دو نواسیاں بھی تھیں طارق کے جوڑ کی، ان میں سے کسی کی ہوجاتی تو۔" انہوں نے سوچا۔

تایا کو جو کہنا تھا وہ کہہ دیا، بھائی بھاوج نے کہا کہ وہ آپس میں مشاورت کرکے جواب دیں گے۔

ناہید نے سنا تو دنگ رہ گئی۔

"ثمینہ کی کردیں۔" اس نے بے نیازی سے ماں سے کہا۔

"بڑی تو تم ہو، پہلے تمہاری ہونی چاہیے۔" وہ ہچکچائیں۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ ہنوز اسی لاپروا انداز میں گویا ہوئی۔

"لوگ کیا کہیں گے بڑی سے پہلے چھوٹی کا رشتہ طے کردیا۔" امی نے بے چارگی سے اپنی اس اکھڑ مزاج بیٹی کو دیکھا۔

"جو کوئی اس طرح کی بات آپ سے کرے، اس سے کہہ دیجیے گا کہ چھوٹی کا رشتہ آیا ہم نے کردیا۔ اب بڑی کا تم لادو۔" ناہید نے بہت آرام سے حل بتایا۔

امی جل کر رہ گئیں۔

"تمہارے ابو سے کیا کہوں؟"

"کہہ دیجیے گا کہ میں نے انکار کردیا ہے۔"

"طارق بہت اچھا لڑکا ہے۔"

"ہاں، ہاں، میں کب کہہ رہی ہوں کہ برا لڑکا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ بے شک اسے اپنا داماد بنالیں اب وہ بڑا داماد ہو یا چھوٹا تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

امی مایوس ہوکر اٹھ گئیں، ان تلوں میں تیل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

امی ابو نے ثمینہ اور طارق کے رشتے کے لیے ہامی بھرلی تھی۔ دونوں گھرانوں میں منگنی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ناہید نے ان ہی مصروف دنوں میں ایک دن طارق کو جا پکڑا۔

"مجھ سے بدلہ لینے کے لیے میری بہن سے شادی کر رہے ہو؟"

"انکار تم نے کیا ہے۔ بدلہ لینا ہوگا تو تم سے لوں گا اس بے چاری سے کس بات کا بدلہ لوں گا۔" طارق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بائی داوے یہ کس قسم کی محبت ہے کہ جس سے چاہت کا دعوا کرو اس کی چھوٹی بہن سے شادی کرلو۔" وہ طنز کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ فیصلہ میرے ابا کا ہے میرا نہیں' ان کے آگے کوئی کچھ بول سکتا ہے؟" طارق چڑچڑے پن سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس رشتے میں تمہاری مرضی شامل نہیں؟"

"اب مجھے ایسا افلاطونی عشق بھی نہیں ہے کہ تمہارے فراق میں صحراؤں کی خاک چھاننے بیٹھ جاؤں یا بن باس لیے جنگلوں میں نکل جاؤں' اب جب رشتہ ہو ہی رہا ہے تو میری مرضی شامل ہوتے کتنی دیر لگے گی۔" طارق نے یکایک پینترا بدلا۔

"اوہ' ناک ابھی بھی اونچی ہی ہے۔" ناہید نے لب سکوڑے۔

"کیوں نہ ہو' کسی عام انسان کی ناک نہیں ہے' ویسے تم سچ سچ بتاؤ اس رشتے سے جیلس تو نہیں ہو رہیں؟" طارق نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"جیلس ہوتی ہے میری جوتی' میں نے تو خود اس رشتے سے منع کیا ہے' اب تمہاری شادی میری بہن سے ہو یا میری کسی دشمن سے' مجھے کیا۔" وہ تپ گئی۔

"جب کوئی مطلب نہیں ہے تو اس تفتیش کا کیا مطلب؟" طارق نے بغور اسے دیکھا۔

"کیا ہم پہلے باتیں نہیں کرتے تھے؟"

"پہلے کی بات اور تھی۔" طارق لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

لکھتے لکھتے وہ اچانک ہی اکتا سی گئی۔ قلم ہاتھ سے رکھ کر کچھ دیر جانے کیا سوچتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"امی! میں بڑی دادی کے ہاں جارہی ہوں۔" دوپٹہ درست کرتے وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

"اس کے بڑے چکر لگتے ہیں پڑوس میں۔" دادی نے جاتی ہوئی پوتی کو دیکھ کر سوچا۔ "پتا نہیں ہماری بیٹیوں کا رشتہ کہیں ہوا کہ نہیں' کئی روز سے تو وہ آئی بھی نہیں۔" وہ اپنی بیٹیوں اور نواسیوں کے متعلق سوچنے لگیں جب سے ثمینہ اور طارق کی منگنی ہوئی تھی انہیں اپنی نواسیوں کی فکر لگ گئی تھی۔

ساحر اپنے کمرے میں بیٹھے حسب معمول مطالعے میں مگن تھے۔

"آؤ بھئی۔ کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟" ساحر نے بشاشت سے کہتے ہوئے کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔

"ثمینہ کی انگیجمنٹ تھی نا بس اسی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے ہم سب۔" ناہید اس کی رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر جائزہ لینے لگی۔

"ہاں بھئی۔ مٹھائی کھائی تھی ہم نے' بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔"

"جس کی منگنی ہوئی ہے' اسے جاکر مبارک باد دیں۔ مجھے تب دیجیے گا جب میری ہو۔" ناہید نے کتاب کے ورق پلٹتے ہوئے کھٹاک سے جواب دیا۔

"سوچا تو تھا جانے کا' مبارک باد بھی دے آتا ہم سے ملاقات بھی ہو جاتی مگر بس۔" ساحر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"زیادہ دن تو نہیں ہوئے مجھے' ایک ہفتہ ہی نہیں آئی شاید۔" ناہید نے بغور انہیں دیکھا۔

"عادت پڑ گئی ہے' ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی ہو نا' کمی محسوس ہو رہی تھی تمہاری۔"

"تو گھر آجاتے۔" ناہید کمرے میں رکھی بہت سی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی' یہ کمرہ دراصل ساحر کی کوچنگ سینٹر تھا جہاں وہ میٹرک سے گریجویشن لیول تک کے اسٹوڈنٹس کو پڑھاتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ آمدنی تھا اور اس میں ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو جاتی تھی۔

انہوں نے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا تھا۔ اور مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ باذوق' ذہین اور بامروت ساحر احمد کی زندگی میں ایک نیا موڑ تب آیا جب آج سے تین سال پہلے ایک حادثے میں ان کی دائیں ٹانگ کی ہڈی کچھ اس طرح چور ہوئی کہ آئندہ کے لیے وہ اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ بہت برا حادثہ تھا' طویل علاج کے بعد وہ وہیل چیئر چھوڑ کر اسٹک کے سہارے پر آگئے' پہلے سال وہ بہت اداس اور فرسٹریشن کا شکار رہے مگر پھر سب نے دلجوئی کی' کچھ انہوں نے خود اپنے آپ کو سمجھایا' بہرحال آہستہ آہستہ وہ کسی حد تک واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس چھڑی کے سہارے سے اپنے قدموں پر چل پھر سکتے ہو' کسی دوسرے انسان کے محتاج نہیں ہم کون سنبھالتا تمہیں اور کب تک؟"

باپ نے سمجھایا' پھر انہوں نے ہی گھر میں کوچنگ سینٹر کھولنے کی صلاح دی۔ اپنی محدود بچت پہلے ہی بیٹے کے علاج پر لگا چکے تھے پھر بھی کچھ جوڑ توڑ کر کے گھر کے آدھے حصے کو ایک بڑے ہال نما کمرے کی شکل دی' ضروری سازو سامان ڈلوایا اس سے متصل ساحر کا کمرہ تھا۔ ہر ممکن آسائش اور سہولت سے مزین گو کہ وہ اپنا بیشتر وقت اسی ہال نما کمرے میں ہی گزارتے تھے جہاں شیلف میں سجی کتابیں ان کا قیمتی سرمایہ بھی تھیں اور ساتھی بھی۔

ناہید کو بھی شروع سے ہی کتابوں سے شغف تھا پھر جب سے اس نے کہانیاں' افسانے ناول وغیرہ لکھنے شروع کیے' مطالعہ اس کی ضرورت بھی بن گیا گو کہ ساحر جیسا وسیع مطالعہ نہیں تھا اس کا مگر پھر بھی ٹھیک ٹھاک مطالعہ اور اچھا ذوق دونوں میں مشترک تھا' ادب کے علاوہ بھی دنیا جہاں کے موضوعات پر دونوں باتیں کرنے پر آتے تو کرتے ہی چلے جاتے۔ ناہید اپنے بچپن سے اس گھر میں آنے کی عادی تھی۔ شعور آیا کتابوں کا شوق ہوا تو ساحر کی چھوٹی سی لائبریری سے بڑی مدد ملی اور اب تک مل رہی تھی۔ ساحر باقاعدگی سے اس کا لکھا ہوا پڑھتے تھے اور تبصرہ بھی کرتے تھے مشورے بھی دیتے یہ اور بات کہ ناہید ان تبصروں' مشوروں کو ایک کان سے سنتی' دوسرے کان سے نکال دیتی۔

"اب تک تو یہ کتاب آپ کو حفظ ہو چکی ہوگی۔" ناہید "آبِ گم" کے صفحے بدستور پلٹ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا بات ہے ایک مشتاق احمد یوسفی اور دوسرے مختار مسعود' میں ان کا لکھا ایک ایک لفظ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں' بار بار پڑھتا ہوں' مگر دل نہیں بھرتا' اکتاہٹ نہیں ہوتی جتنی بار پڑھو معانی و مطالب کا ایک نیا در وا ہوتا چلا جاتا ہے' غالب کی شاعری کی طرح۔" ساحر ہمیشہ کی طرح پرجوش انداز میں شروع ہو گئے۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی مصنف اور اس کی تصنیف سے انسان کو اتنا لگاؤ' اتنی انسیت ہو جائے کہ وہ محبت کا دعوا کرنے لگے۔" ناہید نے سوال اٹھایا۔

"بالکل ہو سکتا ہے' کیوں نہیں ہو سکتا' لوگ فنکاروں' ہنرمندوں اور کھلاڑیوں وغیرہ سے لگاؤ رکھتے ہیں' محبت کرتے ہیں تو لفظوں کی بنت کاری کرنے والوں' قلم کا جادو چلانے والوں کا سحر کیونکر طاری نہیں ہو سکتا۔"

"جن شعبوں کی آپ نے مثالیں دی ہیں' یہاں سب چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں جو شخص آج کامیاب ہے' مقبول ہے اپنے مقام سے نیچے ہوا اور لوگوں کے ذہنوں سے دور گیا پھر یہ محبت تو نہ ہوئی۔ انسیت بھی نہیں۔" ناہید نے اختلاف کیا۔

"چلو ان کو چھوڑو مگر الفاظ کا جادو تو کبھی پرانا نہیں ہوتا' نہ اس کے لکھنے والے ذہنوں سے اترتے ہیں' کتنے ہی نقش ہیں جو آج بھی اتنے ہی پائیدار ہیں جتنے آج سے پچاس' سو یا ڈیڑھ سو سال پہلے تھے۔"

"ہم لوگ جذباتی قوم ہیں' آپ بھی اسی قوم کا حصہ

ہیں، جلدی ہی ہر کسی کو سر آنکھوں پر بھی بٹھا لیتے ہیں اور فوراً" ہی اتار بھی دیتے ہیں۔ دل کے پیچھے چلتے ہیں عقل سے کام نہیں لیتے۔" ناہید جھنجلائی۔

"دل کے پیچھے چلنے میں کیا خرابی ہے؟ ہمارے اقبال بھی تو دل کو عقل پہ ترجیح دیتے ہیں۔" ساحر مسکرائے۔

"عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پہ اعمال کی بنیاد رکھ۔"

"یہ تو محبت کے سب سے اعلا درجے کا معاملہ ہے' وقتی اور سستی جذباتی وابستگی کا اس سے کیا مقابلہ۔" ناہید آہستہ سے بولی۔

"ہوں' یہ سچ ہے کہ ہمارے پیارے علامہ جس دل اور عشق کی بات کرتے ہیں وہ ہر کھوٹ اور آلائش سے پاک نہایت افضل درجے کا ہے' مگر یہ جذباتی وابستگی سستی اور وقتی نہیں ہوتی اسے تو آپ تسلیم کریں۔"

"کیا بات ہے کچھ الجھی الجھی سی لگ رہی ہو؟" ساحر نے ناہید کی خاموشی پر اسے غور سے دیکھا۔

"طارق نے مجھے پروپوز کیا تھا۔" وہ اچانک ہی بولی۔

"اچھا!" ساحر چونکے۔ "پھر؟"

"میں نے منع کردیا۔"

"کیوں؟"

"میں نے اس سے کہا کہ نہ میں تم سے محبت کرسکتی ہوں نہ تمہاری عزت' ہماری گاڑی زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔" ناہید بتانے لگی۔

"عزت اور محبت صرف انسانوں سے مشروط نہیں ہوتی' رشتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جب کوئی رشتہ قائم ہوتا ہے تو اس کے حوالے سے عزت اور محبت بھی خودبخود دل میں پیدا ہوجاتی ہے۔" ساحر نے کچھ سوچ کر کہا۔

"پتا نہیں' مجھے تو جو محسوس ہوتا تھا میں نے اس سے وہی کہہ دیا۔" ناہید نے کندھے اچکائے۔

"اور بات سنو' تمہاری پچھلے ماہ کی تحریر میں مرکزی خیال بہت اچھا تھا' مگر اس کے کیریکٹرز؟ پھر وہی بے حد حسین لڑکی' بہت ہینڈسم' اسمارٹ لڑکا' کیا عام لوگوں کو محبت نہیں ہوسکتی کسی سے؟"

"ہوتی ہوگی' مگر مجھے اسی طرح کے کیریکٹرز کو لکھنا اچھا لگتا ہے' روایتی ہیرو' ہیروئن' بہت پیاری' بھولی بھالی' کمسن' خوش ادا لڑکی اور ٹوٹ کر چاہنے والا شہزادوں جیسا ہینڈسم سا لڑکا' مجھے نہیں پتا اٹھکیوں کی قسم کی ہیروئن اور نہایت بردبار' سنجیدہ مزاج ہیرو۔" ناہید نے منہ بنایا۔

"بھئی۔ ہمیں تو پسند ہیں۔"

"ایک رائٹر جو کچھ لکھتا ہے' وہ اپنی مرضی کے مطابق لکھتا ہے۔ کسی کے مشوروں کے مطابق نہیں۔"

"بعض مشورے اپنی مرضی تھوپنے کے لیے نہیں بلکہ بہتری اور اصلاح کے لیے ہوتے ہیں' ان پر تو غور کرلینا چاہیے۔" انہوں نے جتایا۔

"ٹھیک ہے۔ کبھی وقت ملا تو غور کرلیں گے۔" ناہید نے ہاتھ ہلایا۔

"کہتا ہے انسان کی تحریر میں اس کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے' اس کا اپنا آپ کہیں نہ کہیں جھلکتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔" ناہید نے ان کی بات سے مبہم اتفاق کیا۔

"تمہاری تحریروں سے لگتا ہے کسی بہت حساس' خواب پرست لڑکی نے یہ کہانیاں لکھی ہیں۔" ساحر نے اس کے بارے میں تجزیہ کیا۔

"غلط لگتا ہے' میں ایسی نہیں ہوں۔" ناہید نے ان کی بات کی فوراً" نفی کی۔

"یہی سوچ کر تو حیران ہوتا ہوں' تمہاری تحریروں میں تمہارا اپنا آپ نظر کیوں نہیں آتا؟"

ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ لکھنے والا اپنی تحریر سے مختلف ہوتا ہے' ضروری نہیں کہ اس کے لکھے ہوئے میں' اس کا اپنا آپ بھی کہیں نظر آئے' انسان تھوڑا بہت عیاں ہوسکتا ہے۔ سو فیصد نہیں۔" ناہید نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"جس بات پہ اڑ جاتی ہو بس وہی حرف آخر۔" ساحر جانے کیوں ہنس پڑے۔

"اور آپ اتنی آسانی سے سرنڈر کیوں کردیتے ہیں؟"

"سرنڈر نہیں کرتا' بس دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہوئے چپ ہوجاتا ہوں اور جو میری رائے ہوتی ہے اس پر قائم رہتا ہوں۔"

"دوسرے کو قائل تو نہ کرسکے نا۔" ناہید نے جتایا۔

"بہت سوں کو قائل کرچکا ہوں سوائے ایک بی بی کے وہ جب بولنے پر آتی ہیں تو فقط اپنی ہی کہتی ہیں اگلے کی سنتی ہی نہیں۔" ساحر شگفتہ لہجے میں بولے۔

"آگے کا ڈائیلاگ بھی تو کہیے' سنتی ہیں تو سمجھتی نہیں' سمجھ بھی جاتی ہیں تو قائل نہیں ہوتیں اور قائل ہوجائیں تو اقرار نہیں کرتیں۔" ناہید نے چمک کر ساحر کی بات دہرائی۔

"تمہیں میری باتیں یاد رہتی ہیں؟" وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"آپ کے بارے میں اتنی بار سن چکی ہوں اب تو حفظ ہوگیا ہے۔" وہ ہنسی۔

"آپ کے اسٹوڈنٹس آنے والے ہیں۔" ناہید نے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ "میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

ناہید کے رشتے کے لیے سرتوڑ کوششیں جاری تھیں' مگر اب تک کہیں بات نہ بنی تھی۔ سرتوڑ کوششوں کی ضرورت اس لیے پڑی کہ تایا طارق کی شادی جلد کرنے کے لیے زور دے رہے تھے اپنے بھائی بھاوج کو انہوں نے اپنے انداز میں الٹی میٹم دے دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں لمبے چوڑے خرچوں کی۔ بس شہرت کے پیالے یہ نکاح کردیں۔

سو ابو کا خیال تھا کہ ناہید کا بھی کہیں رشتہ ہوجاتا تو دونوں کی ساتھ کردیتے۔ ابو پیسوں کے جوڑ توڑ میں مصروف تھے' بے چارے کیا کرتے۔ سفید پوش گھرانہ' کمر توڑ مہنگائی اور فضول اور لایعنی رسم و رواج' سب ہی مل کر کمر توڑنے کو تیار تھے۔

"دو شادیوں میں کیا کم خرچا ہوتا ہے' دونوں کو برابر کا ساز و سامان چاہیے ایک ذرا کھانے کے خرچے میں کچھ فرق پڑتا ہے' پھر بھی دو باراتوں کا انتظام' اتنے مہمان' کرتے تیرے چھوٹے اور نکمے' اکیلے تو کیا کیا کرے گا' بس ایک کو رخصت کرکے فارغ ہو۔" دادی نے بیٹے کو صلاح دی۔ ادھر ناہید بھی ایک ساتھ شادی کے حق میں نہیں تھی۔

"ہم تو ایک دوسرے کی شادی انجوائے کرہی نہیں سکتے۔ دونوں کی شادی الگ الگ ہونی چاہیے۔" ناہید نے زور دیا۔

ثمینہ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں' وہ دن جو بہت دور لگ رہے تھے یوں قریب آگئے جیسے کبھی دور تھے ہی نہیں پھر وہ مبارک اور پررونق ساعت بھی آئی جب ثمینہ پیا سنگ رخصت ہوگئی گو کہ رخصتی کا یہ سفر کچھ زیادہ لمبا نہیں تھا' اوپر کے پورشن سے نیچے کے پورشن میں ہی آنا تھا' مگر پھر بھی سب گھر والوں کی آنکھیں نم اور دل اداس تھے۔

☼ ☼ ☼

شادی کے ابتدائی دن تھے' وہ طارق کی سنگت میں خوش تھی' دن بھر میں ایک چکر اوپر کا ضرور لگاتی اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی دمک اس کی خوشی کے غماز تھے۔

لیکن خوشیوں بھرے لمحات بالآخر ختم ہوئے تو عملی زندگی میں قدم رکھنا ہی پڑا۔

اس دن بھی ایئرکنڈیشن کی پرلطف ٹھنڈ میں وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی جب کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور سے جھنجوڑا۔

"کیا مصیبت ہے؟" ثمینہ بھنا اٹھی۔

"تمہیں الارم کی آواز نہیں آتی میں نہا دھو کر تیار بھی ہوگیا اور تمہاری اب تک آنکھ ہی نہیں کھلی۔"

طارق اس پر جھکا غرا رہا تھا۔
"کیا کروں آنکھیں کھول کر؟"
"ٹائم دیکھو آنکھیں کھول کر' ناشتا بناؤ فٹافٹ' میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" پوری رات بچلی کی آنکھ مچولی میں گزر جاتی ہے' اب ذرا جا کر کہیں نیند آئی ہے تو تمہارا باجا بجنے لگا ہے۔" ثمینہ کو یوں اٹھائے جانے پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔
"اس آنکھ مچولی میں میری بھی نیند خراب ہوئی ہے' تم تو دن میں پھر بھی اپنی نیند پوری کر لیتی ہو' ہم تو سارا دن کام پر ہوتے ہیں سونے کا تو کیا پانچ منٹ آرام کا بھی وقت نہیں ملتا۔ کبھی یہ احساس کیا شوہر کا۔" طارق نے اسے جتایا۔
"سونے دو بھئی' بڑی اچھی نیند آ رہی ہے۔" ثمینہ نے پھر آنکھیں موندیں۔
"تم کوئی ننھی بچی نہیں ہو جو تمہیں ہر بار سمجھانا پڑے' اب صبح کا ناشتا تمہاری ذمہ داری ہے تو بلاوجہ ڈرامے کیوں کرتی ہو' ٹائم سے اٹھ کر اپنا کام کیا کرو۔"
طارق کا لہجہ درشت تھا' شادی کے نئے نئے دنوں کا خمار آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا' عملی زندگی کے حقائق سامنے آ رہے تھے' پھر طارق تھا بھی غصے کا تیز۔ اس میں ویسے بھی برداشت کی کمی تھی' مگر برداشت تو ثمینہ کو بھی نہیں تھی' اس بات کا طارق کو اب اندازہ ہو رہا تھا۔
"صبح کا ناشتا ہی کیوں' دوپہر کا کھانا' رات کا کھانا' جھاڑو' برتن' صفائی' کپڑے دھونا سب ہی کچھ میری ذمہ داری بنا دیا ہے۔ لوگوں کو گھر کے کاموں کے لیے ماسیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بہو لے آتے ہیں بغیر تنخواہ بغیر چھٹی کی ملازمہ' چوبیس گھنٹے کی مفت سروس۔"
ثمینہ پچھلے دو ہفتوں سے بھری ہوئی تھی' آج پھٹ پڑی۔ بے نقط طارق کو سنا دیں۔ وہ جیسے شاک کے عالم میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر یکایک اس کے چہرے کے نقوش تن گئے' رگیں پھولنے لگیں' غصے سے سرخ چہرہ لیے وہ جس طرح پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکلا تھا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ کس قدر [illegible] میں تھا۔
"ہونہہ' میں ہی رہ گئی ہوں سب کے نخرے اٹھانے کے لیے۔" ثمینہ نے ایک اونہہ کر کے کروٹ بدلی اور پھر سے آنکھیں موند لیں' کتنی اچھی نیند آ رہی تھی۔
معاملہ تایا' تائی تک پہنچ گیا تھا۔ طارق نے ماں باپ کو جتایا تھا کہ ان کی پسند کردہ بہو کیا خیالات رکھتی ہے۔
تایا تو غصے کے تیز تھے پھر بھی انہوں نے تحمل سے کام لیا۔ بہو کو بھتیجی سمجھ کر بڑی نرمی اور پیار سے ازدواجی اور سسرالی زندگی کی اونچ نیچ سمجھائی' تحمل اور برداشت کا درس دیا ان کا ایک گھنٹے کا لیکچر ثمینہ نے بڑے صبر اور سکون سے سنا اور خاموش ہی رہی۔
تائی امی نے ساس کا کردار نبھایا' وہ فوراً اپنے دیور اور دیورانی تک اپنی شکایات پہنچا کر آئیں۔ "مہو دیر سے سو کر اٹھتی ہے' گھر کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتی۔ بس زبردستی جیسے بھگتاتی ہے' آگے سے مجھے جواب بھی دے دیتی ہے' کبھی ساس کو' کبھی شوہر کو۔" دونوں میاں بیوی نے تحمل سے ان کی شکایات سنیں اور خندہ پیشانی سے وعدہ کیا ثمینہ کو سمجھانے کا۔ انہوں نے یہ وعدہ پورا بھی کیا اور دو گھنٹے کا لیکچر بیٹی کو دیا۔ بیٹی نے جواب میں کچھ کہا تو نہیں' مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ ساری باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بڑے دنوں میں آئیں؟"
"بس یونہی' گھر میں ذرا ٹینشن چل رہی تھی' دل ہی نہیں چاہا کہیں جانے کو۔" کاٹن کے سادہ سوٹ میں ملبوس ناہید کچھ تھکی تھکی سی بھی لگ رہی تھی اور پریشان بھی۔
"خیریت تو ہے نا؟" ساحر نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔
"ہاں' اب تو خیریت ہی ہے۔" ناہید کا جواب مبہم تھا۔
"کیا مطلب؟"
"بس چھوڑیں مطلب وطلب کو' میرا معاملہ تھوڑی ہے' جس کا معاملہ ہے وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔" وہ تیزی سے بولی۔
"جب تمہارا معاملہ نہیں ہے تو تم کیوں پریشان ہو؟"
"ویسے ہی' دماغ خراب ہے نا میرا۔" وہ جھنجلائی۔
"تمہیں علم ہو گیا اس بات کا؟" ساحر نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔
"ثمینہ اور طارق دونوں نے پریشان کر کے رکھ دیا ہے سب کو۔" ناہید نے ان کے مذاق کا خاطر خواہ نوٹس نہ لیتے ہوئے بالآخر اصل بات اگل ہی دی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی بھی اہم معاملہ ساحر سے ڈسکس نہ کرتی۔
"ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
"بچوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ وہ بھی فضول باتوں پر' تائی امی شکایتیں لے لے کر اوپر آتی رہتی ہیں امی ابو کے پاس۔"
"ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں' آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے تو جھگڑے بھی کم ہو جائیں گے' انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو بہت زیادہ مداخلت سے بھی معاملات بگڑ جاتے ہیں۔" ساحر نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"ایک ہی گھر میں بچپن سے رہ رہے ہیں' اور اب شادی کے بعد یوں لڑ رہے ہیں جیسے پہلی بار ایک دوسرے سے ملے ہیں' میری تو سمجھ سے باہر ہے تو بھئی۔" ناہید کا منہ بنا ہوا تھا۔
"کزنز کی حیثیت سے ایک ہی گھر میں رہنا اور بات ہے اور میاں بیوی کے رشتے سے رہنا اور بات' رشتہ کوئی سا بھی ہو' کزنز کا' دوستی کا یا محبت کا ان رشتوں میں بہت سی باتیں انسان برداشت بھی کر لیتا ہے' نظر انداز بھی' میاں بیوی کا رشتہ بالکل الگ نوعیت کا ہوتا ہے' برداشت کرنا' نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا' پھر جب دونوں فریق ہی ایک جیسے مل جائیں تو گاڑی آگے چلنا مشکل ہو جاتی ہے' مگر تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔" ساحر نے رسان سے سمجھایا۔
"نہ بھی ہوں' میری بلا سے' مجھے کیا۔" ناہید کی فطری تنک مزاجی عود کر آئی۔
"اچھا خیر چھوڑو تم نے پڑھا' تمہارے پچھلے ناول پہ اس بار بہت تنقید آئی ہے۔"
"جی' آپ کے تو دل کی مراد پوری ہو گئی' جو کام آپ اکثر کرتے رہتے ہیں' وہ قارئین نے کر دیا۔"
"کچھ غلط بھی نہیں کہا پڑھنے والوں نے' تمہارے کردار بھی تو کتنے غیر معمولی ہیں' کوئی صرف اچھائیوں کا پیکر ہے' کوئی فقط برائیوں کا مجموعہ' تمہارے بعض کردار تو سیدھے آسمان سے اترے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔" ساحر کا تجزیہ بے لاگ تھا۔
"زندگی بہت تلخ ہے' فلموں' ڈراموں اور کہانیوں کی دنیا میں ہم جاتے ہیں تو تھوڑی سی فینٹیسی تھوڑی سی آسودگی چاہتے ہیں' میں چاہتی ہوں کہ میرا قاری میری تحریر پڑھ کر اٹھے تو اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں کوئی خواب ہو' نہ کہ دل پہ ایک بوجھ۔" ناہید نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔
"مگر اب تو تمہارے قارئین بھی تمہاری اس "تھیوری" پہ بہت تنقید کرنے لگے ہیں۔ کبھی کبھار "فینٹیسی" کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔" انہوں نے چڑایا۔
"تنقید کرنے میں کیا ہے؟ دنیا کا سب سے آسان کام' ایسے لوگوں سے اگر کہیں نا کہ کاغذ' قلم پکڑ کر کوئی کہانی لکھیں' چھوٹی سی ہی سہی تو سب کے سب بغلیں جھانکنے لگیں۔" ناہید کا ضبط بس اب جواب دینے لگا تھا۔
"ارے ہاں چھوٹی کہانیوں سے یاد آیا میرے پاس او ہنری کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے' میری اسٹوڈنٹ

دے گئی تھی، اپنے ابا کی لائبریری سے نکال کرلائی ہے تمہارے لیے سنبھال کر رکھی ہے لے جانا۔"

"آپ کے اسٹوڈنٹس بھی آپ کے ہم ذوق ہیں۔"

"سارے نہیں، فقط دو چار ہیں ہم ذوق بھی، ہم مزاج بھی۔"

"اجنبیوں کے ہجوم میں، ایک دو شناسا چہرے بھی دل کو تقویت پہنچاتے ہیں۔" ناہید نے فلسفہ بیان کیا۔

"بھئی ہمیں تو اجنبیوں سے کوئی خاص پرخاش نہیں ہے، ایک مسکراہٹ ادھر سے یا ادھر سے، پھر ساری اجنبیت دور۔"

"کبھی کبھی بہت قریب کے لوگ بھی اجنبی سے، بہت دور سے لگتے ہیں نا۔"

"لگنے" میں اور "ہونے" میں فرق ہوتا ہے۔ بس ساری بات فیلنگز کی ہے، ویسے کبھی کبھی انسان کو خود اپنا آپ بھی اجنبی لگتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولے۔

"لائیں او ہنری کی کتاب دے دیں مجھے، میں اب چلتی ہوں۔"

ناہید اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی، پتا نہیں کیوں بیٹھے بیٹھے یا کچھ کرتے کرتے اک دم ہی اس کا دل اچاٹ ہوجاتا، ابھی بھی یہی ہوا۔

☆ ☆ ☆

کل تین مہمان آئے تھے۔ لڑکے کی والدہ، بڑی بہن اور سب سے بڑی بہن۔ بہرحال تینوں کو ہی ایک ساتھ مہمان خصوصی کا پروٹوکول دیا جارہا تھا۔ ان کے سامنے میز پر اشیائے خورد و نوش سجی ہوئی تھیں۔ ناہید کی لاکھ مخالف اور ناراضی کے باوجود بھی امی نے میز بھرنے کا انتظام کرلیا تھا، دہی بھلے، فروٹ چاٹ، کباب، سموسے، گلاب جامن، نمکو۔

آنے والی خواتین نے امی کا دل نہیں توڑا تھا، وہ ان کے اہتمام و انتظام سے خوب انصاف کررہی تھیں اور ساتھ ساتھ ناہید سے انٹرویو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جو اتنا طویل ہورہا تھا کہ بے زاری، ناہید کے چہرے سے ہی نہیں، لہجے سے چھلکنے لگی تھی۔

"سنا ہے آپ کہانیاں بھی لکھتی ہیں؟" انٹرویو کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔

"جی۔"

"کیسے لکھ لیتی ہیں؟"

"قلم سے۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے، بھئی بڑا دماغ چاہیے۔" بڑی بہن ایک لمحے کو رکیں۔ "کہانیوں میں تو عشق و محبت کی باتیں بھی ہوتی ہیں، ہے نا؟"

انہوں نے تصدیق چاہی۔ ناہید چپ رہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چائے کا کپ اٹھا کر ان کے سر پر دے مارے۔

"اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کے عشقیہ ڈائیلاگ لکھنے میں بڑی محنت ہوتی ہوگی؟"

"اپنی طرف سے گھڑنے کی کیا ضرورت ہے، میرے پاس بہت تجربہ ہے۔ ایک سو ایک محبتیں کرچکی ہوں اب تک۔" ناہید کے ضبط نے جواب دے دیا تھا اور اب وہ خود آپے سے باہر تھی۔

سب حق دق اسے دیکھ رہے تھے، لڑکے کی والدہ نے دانتوں میں انگلی دبالی۔

"آ... ہائے... اتنی بدزبان۔"

"میں بدزبان ہی نہیں، بدلحاظ بھی ہوں، اپنی خیریت چاہیے تو فوراً سے پیشتر یہاں سے روانہ ہوجائیں آپ لوگ۔" ناہید تن فن کرتی اندر چلی گئی۔ امی کا وہ حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دادی کی پیشانی بھی عرق آلود۔ مہمان خواتین میں سے ایک نے ہاتھ میں پکڑا آدھا سموسہ واپس پلیٹ میں رکھا۔ دوسری نے چائے کا کپ واپس میز پر رکھا اور تینوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ غیر متوقع طور پر وہ بغیر کسی غصے اور تبصرے کے تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔

"یہ کیا بے ہودگی تھی، مہمانوں سے بھی بات کرنے کی تمیز کھودی۔ پڑھ لکھ کر بھاڑ جھونکا اور کیا کیا۔" دادی نے مہمانوں کی رخصتی کے فوراً بعد پوتی کو آڑے ہاتھ لیا۔ "رشتے کے لیے آئی تھیں۔ ایسے

مہمانوں سے تو اور بھی سنبھل کر بات کرنی پڑتی ہے۔"

"اتنی دیر تک سنبھل کر ہی بات کر رہی تھی میں، ان کے سوالات سنے تھے آپ نے؟ کون سے کالج سے پڑھا ہے، ویمن یا کو ایجوکیشن، دو سال یونیورسٹی میں پڑھا، وہاں تو لڑکے بھی ہوتے ہیں یونیورسٹی کا ماحول تو بہت خراب ہوتا ہے اور پھر کہانیاں لکھنا؟ عشق و محبت کی باتیں ہوتی ہیں اس میں، آئندہ کسی کو بلانے سے پہلے تھوڑی چھان بین کروالیا کریں کہ وہ لوگ ذہنی طور پر بیمار تو نہیں ہیں۔" ناہید کی زبان کے آگے کون ٹھہر سکتا تھا۔ دادی کانوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

کتنی دیر سے وہ اپنی بلیو شرٹ تلاش کررہا تھا، مگر ہنوز ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ ایک تو سارے کپڑے بغیر استری کے الٹے سیدھے، گول مول حالت میں الماری میں پڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کے صبر اور برداشت کی حد ختم ہوگئی۔

"ثمینہ... ثمینہ!" وہ دھاڑا۔

"کیا آفت آگئی؟" وہ کچن میں روٹی پکا رہی تھی، طارق کی دھاڑ سن کر جھلائی ہوئی آئی۔

"میری بلیو شرٹ کہاں ہے؟"

"اسی میں ہوگی۔"

"نہیں ہے، اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں، مجھے تو ملی نہیں، اب تم دیکھ لو، کپڑے ہی ماشاء اللہ ایسے رکھے ہوئے ہیں کہ دو گھنٹے ڈھونڈنے پر بھی مطلوبہ چیز نہ ملے اور تم سارا دن کرتی کیا رہتی ہو، استری تو تم سے ہوتی نہیں، کم از کم تہہ کرکے ہی رکھ دیا کرو کپڑوں کو، تاکہ نکالنے میں تو آسانی ہو، استری تو خیر مجھے خود ہی کرنی ہے۔" طارق طنزیہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

"فارغ نہیں بیٹھی رہتی سارا دن تمہاری امی کی طرح، اکیلی سارے کام کرتی ہوں۔ انسان ہوں، تھک جاتی ہوں جب فرصت ملے گی الماری ٹھیک کردوں گی۔" ثمینہ ناخن پر سے آٹا چھڑاتے ہوئے بولی۔

"میرے کاموں کے لیے تو کبھی ٹائم ملے گا ہی نہیں تمہیں۔"

طارق نے پھر طنز سے کہا۔ وہ فطرتاً "نفاست پسند" تھا، بے ترتیبی اور بدسلیقگی سے اسے چڑ تھی اور شادی کے بعد اس کا بیڈ روم اور الماری ہر وقت بکھرے ہی رہتے۔ ثمینہ نہ جانے سارا دن گھر کے کون سے کاموں میں مصروف رہتی تھی کہ اپنے اور شوہر کے ذاتی کام پس منظر میں چلے جاتے۔ طارق کی جان جل کر رہ جاتی تھی۔

"کیوں، تمہارے کام میں نہیں کرتی تو اور کون کرتا ہے؟ بڑے احسان فراموش ہو۔ سارا دن میں اپنی جان کھپاتی رہتی ہوں، ذرا سی کوئی کمی رہ جائے تو طعنے دینے لگتے ہو، آخر ہونا اپنے ماں، باپ کی اولاد، جیسی ان کی زبانیں، ویسی تمہاری ہے۔" ثمینہ تڑخ کر بولی۔

"ہم سب کی زبانیں ملا کر بھی تم سے کم ہی ہیں تم تو اپنی بہن سے بھی چار ہاتھ آگے ہو، شادی سے پہلے تو بڑی بھیگی بلی بنی رہتی تھیں، بے زبان بے چاری۔" طارق نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔

"کسی کی خوشامد نہیں کی تھی میں نے، شادی کے لیے۔" ثمینہ نے الماری کے کھلے خانے سے اس کی نیلی شرٹ برآمد کی۔ "یہ رہی تمہاری شرٹ۔"

"بٹن لگا دیا تھا اس کا؟" طارق کی یادداشت ثمینہ کے مقابلے میں تیز تھی۔

"نہیں۔ رکھ دو، ابھی روٹی پکا کر لگادوں گی۔"

"بتایا بھی تھا ضروری کام سے جانا ہے، ویسے ہی اتنا لیٹ ہوچکا ہوں۔" طارق شرٹ اٹھا کر دروازے کی طرف لپکا۔

"اب کیا ایک بٹن لگوانے درزی کے پاس جارہے ہو؟"

"درزی کے پاس کیوں، تمہاری بہن سے لگواؤں گا۔ ذمہ دار تو وہی ہے۔ نہ وہ انکار کرتی نہ یہ عذاب میرے گلے پڑتا۔" طارق تو غصے میں بولتا ہوا باہر نکل گیا اور ثمینہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ وہیں کھڑی کی

کھڑی رہ گئی۔

"نہ وہ انکار کرتی' نہ یہ عذاب میرے گلے پڑتا۔" بار بار یہی بازگشت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بڑی پھپھو نے اپنے لائق سپوت کے لیے ناہید کا ہاتھ مانگا تھا۔ بڑی غیر متوقع خبر تھی۔ سب لوگ تو حیران تھے ہی' خود ناہید بھی پہلے حیران پھر پریشان ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بڑی پھپھو نے اس کی ستر گز لمبی زبان پر ہمیشہ اعتراض کیا تھا۔

یہ بھی طے تھا کہ اس سارے معاملے میں ان کے فرزند ارجمند کا بھی کوئی عمل دخل نہیں تھا کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے رشتہ بھیجا ہو۔ یہ تو سراسر پھپھو کا اپنا فیصلہ تھا۔

"جیسی بھی ہے' بھتیجی ہے' میرا خون ہے' اپنوں کو ہم نہیں پوچھیں گے تو اور کون پوچھے گا۔" انھوں نے بھائی بھاوج کے سامنے بہانگ دہل تبصرہ کیا۔

ناہید کی سوئی تو "جیسی بھی ہے" پر اٹک رہی تھی' بڑی مشکل سے اس نے خود کو مداخلت سے باز رکھا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سے ضرور پوچھے کہ "جیسی بھی ہے" سے کیا مراد ہے؟

بہر حال وہ رشتہ ڈال کر چلی گئیں کہ بھائی بھاوج نے رسمی طور پر ایک ہفتے کا ٹائم تو مانگا تھا جواب کے لیے۔

"تجھے کیا سوجھی حمزہ کے لیے ناہید کو لینے کی۔ گز بھر کی لمبی زبان ہے۔ اپنی بھانجیاں نظر نہیں آئیں تجھے۔"

"عمو کی بیٹیاں کون سی نیک پروین ہیں۔ ہیں تو میری بھانجیاں۔۔۔ مگر سچ کہوں تو ان کی زبانیں اور مزاج کون سے کم ہیں۔ ناہید کو مانگا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی مانگا ہے۔" پھوپھی کا لہجہ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

"کیا سوچا' کیا سمجھا' ہمیں بھی تو کچھ پتا چلے۔ آخر تو اس فتنی کے پیچھے کیوں دیوانی ہو رہی ہے۔" دادی نے طنزیہ انداز اپنایا۔

"دیوانی کی بات نہیں اماں۔۔۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ دو بہوئیں لا چکی ہوں۔ زبان دراز تو وہ بھی ہیں۔ اوپر سے ان کے نخرے اور خرچے' ساتھ رہیں تو جنجال' الگ کر دوں تو بھی مصیبت' احمد کے لیے میں نے سوچ رکھا تھا کہ کوئی ملازمت پیشہ لڑکی دیکھوں گی۔ اب ناہید تو پھر بھی لاکھ درجے بہتر ہے۔ گھر بیٹھے کمائی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اپنی کمائی کسی پہ خرچ کرے نہ کرے اپنے اوپر اور اپنی اولاد پر تو کر ہی لے گی۔"

پھپھو بڑی دور کی کوڑی لائی تھیں۔ دادی منہ کھولے حیرت سے بیٹی کو تک رہی تھیں۔

"اوہ تو یہ بات تھی؟" اسٹور میں موجود ناہید کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ چمکی۔ وہ پھپھو کی آمد کے کچھ دیر بعد یہاں آئی تھی۔ تاکہ دادی اور پھپھو کی باتیں سن سکے۔

"ویسے دماغ تو آپ کا بھی خوب چلتا ہے پھپھو!" اس نے دل ہی دل میں انھیں داد دی اور رات میں بات کی۔ انھیں پوری بات بتا کر اس نے اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔

"یہ کون سی ایسی خاص بات ہے۔ انھیں خود تو کوئی لالچ نہیں ہے نا تمہاری کمائی کا۔ رہی بات شوہر اور اولاد پہ خرچ کرنے کی تو اس میں کیا حرج ہے؟" امی نے بڑی سادگی اور آرام سے اس کے انکار کو رد کیا۔

"آپ کے لیے خاص بات نہیں ہو گی۔ مگر میرے لیے تو ہے۔" "پہلے طارق کو منع کر دیا۔ اب اس میں بھی کیڑے نکل آئے۔ شادی نہیں کرنی ہے کیا؟"

"کرنی ہے' شادی کرنی ہے' سودے بازی نہیں۔" ناہید کے لہجے میں قطعیت تھی۔ جو اس بات کی غماز تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر اٹل ہے۔

☼ ☼ ☼

ثمینہ اپنی قمیص کاٹ رہی تھی۔ ناہید بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ امی بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

"تم نے پھپھو کو کیوں منع کر دیا۔ اچھے بھلے تو ہیں حمزہ بھائی۔" ثمینہ نے انجان بن کر ناہید کو کریدا۔

"تمہیں نہیں معلوم' میں نے کیوں منع کیا تھا۔ امی نے ساری رام کہانی سنائی تو تھی تمہیں۔" ناہید نے جیبھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"سنائی تو تھی کہانی' مگر سمجھ میں نہیں آئی۔ معمولی سی بات کو جواز بنا کر جھٹ سے منع کر دینا۔ مجھے تو حیرت ہو رہی تھی۔" ناہید نے کندھے اچکائے۔ لہجہ میں طنز کی پھوار تھی جو ناہید کو فوراً" ہی محسوس ہو گئی۔

"وہ معمولی بات نہیں تھی۔ کم از کم میرے لیے۔" ناہید نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"اور طارق کو انکار کرنے کا کیا جواز تھا تمہارے پاس؟" ثمینہ کی نظریں ہی نہیں' لہجہ بھی چبھتا ہوا تھا۔

ناہید کا سبزی بناتا ہاتھ اک دم ہی تھما تھا۔ امی نے بھی دونوں کو باری باری بے بسی سے دیکھا۔

"ہمارا ایک ساتھ گزارا نہیں ہوتا۔ لڑائی جھگڑے ہوتے۔" ناہید نے اگلے ہی پل خود کو سنبھال کر اپنے فطری اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"لڑائی جھگڑے تو اب بھی ہوتے ہیں۔"

"تمہارا شوہر ہے۔ تمہاری لائف ہے۔ تمہیں خود ہی ہینڈل کرنا چاہیے۔" ناہید نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"نہ شوہر میرا ہے۔ نہ لائف میری ہے۔ ہم تو کسی اور کی زندگی جی رہے ہیں اور دوسروں کے غلط فیصلوں کا تاوان بھر رہے ہیں۔" ثمینہ زہر آلود لہجے میں پھنکار رہی تھی۔ امی کا چہرہ فق تھا اس کی باتیں سن کر۔ ناہید نے خلاف توقع خاموشی سے لب بھینچ لیے۔ مگر اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

کتنے دن گزر گئے تھے وہ ساحر کے پاس نہیں جا سکی تھی۔ کبھی موڈ نہیں ہوا' کبھی فرصت نہیں ملی۔

"کہاں ہو؟" ساحر کا میسج ملا۔

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔" ناہید نے جواب لکھا۔

"ہاں تو میں بھی ہوں' پھر کیا خیال ہے؟"

"بے خبری بھی ایک نعمت ہے۔ بہت زیادہ جاننا بھی بعض اوقات مشکلات کا سبب بن جاتا ہے۔"

"خوب صورت لڑکیاں فلسفہ بگھارتے وقت بالکل ایسی لگتی ہیں جیسے آم کے درخت پر کریلے لٹک رہے ہوں۔"

"کیا واقعی؟ آپ نے مجھے خوب صورت کہا؟"

"میں نے تمہارے فلسفے کو کریلا کہا ہے۔"

"بس۔۔۔ اب تو میری بولتی بند ہو گئی ہے۔ کل آؤں گی' پھر بات کریں گے۔"

ناہید نے جوابی پیغام لکھ کر موبائل آف کر دیا۔

☼ ☼ ☼

بات کوئی اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ بس دونوں فریقین کی لمبی زبانوں نے معاملے کو بڑا کر دیا تھا۔

تائی امی نے بڑے شوق سے بیسن کی روٹی پکوائی تھی۔ بہو نے مارے باندھے روٹی تو پکا دی۔ مگر چٹنی گرائنڈر میں پیس کر ان کے آگے کھانا رکھ دیا۔

گرائنڈر کی پسی پتلی پانی سی چٹنی' لال مرچ کے بیج' زیرے اور لہسن کے چھوٹے چھوٹے سے ٹکڑے' چٹنی کے پانی میں غوطہ لگا رہے تھے۔ پھر اس میں بگھار بھی نہ تھا۔

"یہ چٹنی ہے؟" وہ دیکھتے ہی چراغ پا ہو گئیں۔ اس عمر میں بھی چٹنی' کوفتے اور کباب کا قیمہ سل پر پیستی تھیں۔ شوہر اور بیٹے' سب کے نخروں کی وجہ سے اور بہو صاحبہ کو تو کسی کا کوئی لحاظ نہ تھا۔

ساس نے دو' چار باتیں سنا دیں۔ سگھڑاپے' سلیقے اور پھرتی سے کام کرنے پہ۔ بہو نے آگے بڑھ بڑھ کے وہ جواب دیے کہ الامان و الحفیظ بڑے زوروں کا معرکہ ہوا۔ ثمینہ لڑ لڑا کر اوپر میکے چلی گئی۔ شام میں تائی امی نے شوہر اور بیٹے کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔

باپ سے پہلے بیٹے کا پارہ چڑھ گیا۔

"آپ نے ہی کہا تھا کہ وہ اپنی بہن سے الگ ہے۔ مختلف ہے۔ سیدھی سادھی 'باادب' تمیزدار' دیکھ لیں اب تمیزدار اور سیدھی سادھی بہو کو۔"

"ارے تو مجھے کیا پتا تھا ایسی چھپی رستم نکلے گی۔ یہ تو ناہید سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔ ذرا' ذرا سے کام سے دم نکلتا ہے۔ غصہ ناک پہ اور جواب زبان کی نوک پہ دھرا رہتا ہے۔ پل بھر میں مزاج آسمان پہ پہنچ جاتا ہے۔ اب دیکھو ذرا' سیڑھیاں دھڑ دھڑ کرتی اوپر چلی گئی۔ یہ کوئی طور طریقے ہیں بہوؤں کے۔"

تائی کی سانس پھول گئی بولتے بولتے۔

"جاتی ہے تو جائے۔ کوئی نہیں جائے گا یہاں سے' اسے منانے اور خوشامدیں کرنے۔" طارق بھڑک اٹھا۔

"اب شادی ہو گئی ہے تمہاری' جوش سے نہیں ہوش سے کام لو' نہ تمہارے اندر سنجیدگی و بردباری آئی نہ تمہاری بیوی کے اندر۔"

باپ نے آزردگی سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ غصہ ور ضرور تھے۔ مگر وضع دار انسان تھے۔ ثمینہ کی وجہ سے اپنے بھائی' بھاوج کو' اپنے سامنے شرمندہ پاتے تو خود بھی شرمندگی کا شکار ہو جاتے۔ ان کا اپنا بیٹا بھی کون سا کم تھا۔ غصہ اس کی ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ طنز کرنے اور طعنے دینے سے وہ بھی نہیں چوکتا تھا۔ ان دونوں کے آئے دن کے لڑائی جھگڑوں میں وہ بھی بہرحال کسی نہ کسی حد تک قصوروار تھا۔ مگر بس چونکہ معاشرے کا عمومی رویہ یہی ہے کہ مردوں سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے اور عورت کو ہی صبر' برداشت اور تحمل کے اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔ اس لیے طارق کو سمجھانے کے بجائے ہر کوئی ثمینہ کو ہی سمجھاتا رہتا تھا۔ ادھر امی بھی ثمینہ کو ہی سمجھا رہی تھیں۔

"تائی بھی ہیں۔ ساس بھی ہیں۔ بڑی ہیں تم سے۔ اتنے سارے رشتے ہیں۔ کچھ سخت کہہ دیں تو درگزر کر دیا کرو۔"

"بس میں ہی درگزر کرتی رہوں۔ کبھی تائی کی زبان کو' کبھی شوہر کی زبان کو' کبھی تایا ابو کو۔ میں کچھ بول دوں تو قیامت آجاتی ہے۔" ثمینہ بھڑک اٹھی۔

"سسرال۔۔۔ سسرال ہوتی ہے۔ چاہے سگی خالہ کا گھر ہی کیوں نہ ہو۔ برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ گھر تب ہی بنتے ہیں۔" امی آہستہ سے بولیں۔

"مجھے نہیں بنانا گھر ور' جب گھر والا ہی میرا نہیں تو گھر بنا کر کیا کروں گی۔" ثمینہ بے دھڑک بولی۔

"اری تو پھر بتا تو سہی' چاہتی کیا ہے؟" دادی نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"سکون اور صرف سکون' جو یہاں بھی ملنا مشکل ہے۔" ثمینہ نے بڑبڑاتے ہوئے منہ تک چادر تان لی۔

☼ ☼ ☼

شام میں تایا اوپر آکر اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ نیچے لے آئے۔ وہ آ تو گئی مگر پھولے ہوئے منہ کے ساتھ۔ طارق کا رویہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ تائی کا موڈ البتہ کچھ بہتر تھا۔ تایا نے سمجھایا تھا یا دھمکایا تھا۔ بہرحال وہ نارمل ہو کر ملیں اس سے۔

وہ کمرے میں آئی تو طارق ٹی وی کھولے بیٹھا تھا۔ چہرے پہ نولفٹ کا بورڈ سجا ہوا تھا۔ نہ اس نے بات چیت میں پہل کی' نہ ثمینہ نے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ ٹی وی دیکھتا رہا۔ ثمینہ موبائل پہ گیم لگا کر بیٹھ گئی۔ جب کھیل کھیل کر دل بھر گیا اور سر میں درد ہونے لگا۔ اس نے موبائل آف کیا اور کروٹ لے کر سو گئی۔ طارق کب سویا' اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔

☼ ☼ ☼

ناہید کے لیے رشتے کی تلاش کا کام ہنوز جاری تھا۔ دو' چار بار مہمان آئے بھی۔ مگر بات نہیں بنی۔ کبھی آنے والے منع کر دیتے' کبھی ناہید انکار کر دیتی۔ پھر اس نے ایک رشتے کو منع کیا جو سب کی نظر میں اچھا بھلا تھا۔ تو امی بھی چین بہ جبیں ہو گئیں۔ دادی نے خوب خبر لی۔ ابو ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے۔ مگر ثمینہ کڑے تیور لیے اس کے پاس آئی۔

"تم ہر رشتے سے انکار کیوں کر دیتی ہو؟"

"جو میرے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اسے منع ہی کروں گی۔ زبردستی کسی کو خود پہ کیوں مسلط کروں۔" ناہید نے بڑے اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

"کون پورا اترتا ہے تمہارے معیار پہ؟ طارق؟" ناہید کٹیلے لہجے میں بولی۔

"وہ اگر میرے معیار پہ پورا اترتا تو آج تمہاری جگہ میں ہوتی اس گھر میں' تمہارے دماغ میں جو بھی خناس بھرا ہے اسے نکال کر پھینکو۔"

ناہید پہلے بھی ایک' دو بار ثمینہ کے منہ سے طارق کے حوالے سے طعنہ سن چکی تھی اور آج اس کے ضبط کی حد ختم ہو گئی۔

"اسی بات کا تو افسوس ہے تمہیں اور وہ تمہارے ہی غم کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ اپنے بیچ میں میری بھینٹ کیوں چڑھا دی تم دونوں نے۔" ثمینہ تیز آواز میں بول رہی تھی۔

"نہ مجھے کسی بات کا افسوس ہے اور نہ ہی طارق کسی غم کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ تمہارے آئے دن کے نصیحتوں سے تنگ آکر میں نے بات کی تھی اس سے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر معاملے میں تمہارا لاپروا رویہ اور تمہاری بدتمیزی اسے غصہ دلاتی ہے۔ پھر تم میرے حوالے سے بھی اسے طعنے دیتی ہو۔ طنز کرتی ہو' شک کرتی ہو اور تمہاری تسلی کے لیے بتا دوں کہ طارق سے شادی کا میرا کوئی ارادہ نہ پہلے تھا' نہ ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔"

ناہید غصے سے سرخ چہرہ لیے اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"جھوٹی' مکار' دونوں کے دونوں مل کر میرے ساتھ ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔" ثمینہ نے بے حد تنفر سے اسے گھورا۔ اس کے دل میں شک کا پودا بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

امی' ابو کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ساحر کا پروپوزل ناہید کے لیے آیا تھا۔ دیکھا بھالا لڑکا۔ دیکھے بھالے لوگ۔ پھر سب کی دانست میں یہ دونوں ایک دوسرے سے کافی یا نوس بھی تھے۔ امی تو فوراً" ہی ہاں کہنے کے موڈ میں تھیں۔ مگر ابو نے پھر بھی رسمی طور پر ناہید سے پوچھنے کے لیے دو' تین روز کی مہلت مانگ لی۔ مگر بیٹی نے دو' تین روز کیا۔ دو' تین گھنٹے بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اگلے منٹ ہی ماں کو کورا جواب دے دیا۔

"ساحر کو انکار؟" وہ بے یقینی سے بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

"کیوں؛ ان میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو انہیں انکار نہیں کر سکتی؟" ناہید نے تیوریاں چڑھائیں۔

"سب تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ۔۔۔" امی نے بات ادھوری چھوڑی۔

"سمجھتے ہیں تو سمجھیں' میری بلا سے۔" ناہید کا پارہ ہائی ہونے لگا۔

"مگر تمہاری تو بڑی اچھی۔۔۔ کیا کہتے ہیں وہ۔۔۔" وہ ایک سے کو رکیں۔ "بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے ساحر سے۔" انہیں یقین ہی نہ آرہا تھا۔

"دوستی یا انڈر اسٹینڈنگ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان سے شادی کر لوں۔ وہ میرے ہم ذوق ہیں۔ اچھا بولتے ہیں۔ ان کے ساتھ گفتگو میں مزہ آتا ہے۔ میرے ذہن کی' ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔

ایک کمرے میں بیٹھ کر زندگی گزارنے والے شخص سے دو' چار گھنٹے باتیں ہو سکتی ہیں۔ مگر اپنی پوری زندگی ایسے فرد کے ساتھ گزارنا میرے لیے تو ناممکن ہے۔ میں ایک نارمل شخص کے ساتھ نارمل لائف جینا چاہتی ہوں۔ ساحر بھائی میرے اس معیار پہ پورا نہیں اترتے۔" ناہید نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر کچھ دیر کے لیے آسکو تو آجاؤ' تم سے بات کرنی ہے۔"

اسے ساحر کا میسج ملا تھا۔ موبائل آف کر کے وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔

"میں بڑی دادی کے ہاں جارہی ہوں۔ ابھی آجاؤں گی تھوڑی دیر میں۔" بالآخر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

امی ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ پڑوس میں بھی کچھ ایسا ہی ردعمل تھا اسے دیکھ کر۔ وہ کسی کی بھی نظروں اور سرگوشیوں کی پروا کیے بغیر سیدھی ساحر کے کمرے میں آگئی۔

"میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔" اسے دیکھ کر ساحر کے لبوں پہ مسکراہٹ تو آئی۔ مگر بہت پھیکی' بے جان سی۔

"خیریت تو ہے۔ آپ نے کیسے یاد کیا؟" ناہید کرسی پہ ٹک گئی۔

"تم نے انکار کیوں کیا؟" انہوں نے بغیر کسی تمہید کے سوال کردیا۔

"مجھے حق تھا انکار یا اقرار کرنے کا۔" ناہید کا لہجہ ہموار اور پرسکون تھا۔

"میں صرف اس فیصلے کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں نے وہی فیصلہ کیا جو مجھے مناسب لگا۔"

"مجھے لگا کہ شاید ہم دونوں ایک ساتھ ایک اچھی لائف گزار سکتے ہیں۔" ساحر آہستہ سے بولے۔

"ہمارے کچھ محسوسات' ہماری غلط فہمی یا خوش فہمی ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ جیسا آپ محسوس کرتے ہوں یا سوچتے ہوں دوسرا بھی وہی سوچے۔" ناہید محتاط ہو کر بول رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگا' میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یا کسی خوش فہمی کے زیر اثر؟" ایک ہلکی سی تلخی ان کے لہجے میں در آئی۔

"میرا جواب دینا ضروری ہے؟ ہوسکتا ہے آپ کو برا لگے؟"

"میرے اچھا یا برا لگنے کی پروا مت کرو۔ تم بے دھڑک ہو کر اپنے دل کی بات کہو۔"

"مجھے لگا کہ آپ کی حالت کے پیش نظر کوئی اور لڑکی آپ کو قبول کرنے میں ہچکچائے' اس لیے آپ نے میرا انتخاب کیا۔"

ناہید نے حسب عادت بے دھڑک اپنے دل کی بات کہہ دی۔ پتا نہیں اسے اپنے سفاک لفظوں کا ادراک تھا کہ نہیں۔ مگر ساحر یک ٹک اسے دیکھتے رہ گئے۔ ناہید کی جس صاف گوئی کو وہ اب تک سراہتے آئے تھے۔ آج اسی سے ایسے گھائل ہوئے کہ ان کی روح تک سسک اٹھی۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے بس یہی پوچھنا تھا۔"

ساحر نے رخ بدل لیا۔ اپنا آپ اتنا بے مایہ اور ارزاں پہلے کبھی نہ لگا تھا انہیں۔

ناہید کچھ دیر لب بھینچے ان کی پشت کو گھورتی رہی۔ پھر وہاں سے چل دی۔

"اف!" ساحر نے اپنی کنپٹی دبائی۔ ناہید کے لیے اس کے دل میں بڑے اچھے جذبے تھے۔ اس نے سب کو بے مول کردیا تھا۔ ان جذبوں کو بھی اور خود ساحر کو بھی۔ ان کا خیال تھا کہ ناہید انہیں جانتی ہے۔ سمجھتی ہے۔ مگر... مگر یہ سب محض گمان ہی تھا۔

"اور شاید اس نے سچ ہی کہا۔ میں کیوں بھول گیا کہ میں ایک ادھورا انسان ہوں۔ اپنے دل کو ہی دھیان میں رکھتے ہوئے اپنے وجود سے بے خبر ہو گیا۔" ساحر کا حساس دل رنجیدگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناہید کڑھی چاول لے کر نیچے آئی تھی۔ ثمینہ ... رہی تھی۔ تائی نہا رہی تھیں۔ وہ کچن میں برتن رکھ کر واپس جانے لگی جب طارق سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"کیا لائی ہو؟" اس نے آگے بڑھ کر برتن چیک کیے۔

"شکر... آج تو پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں گا۔ یار ذرا ایک کپ چائے تو بنادو' مہربانی ہو گی۔ صبح بغیر ناشتے کے نکلا تھا۔ رات کا کھانا بھی بس ایویں کھایا تھا۔ بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔" وہ روانی سے بولتا ہوا انصاف کرنے لگا۔

"کہاں گئی ہے ... اپنی بیگم سے بنواؤ چائے۔ اسے کس لیے بھیجا ہے؟" ناہید نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

"بیگم ... بیگم اس قابل ہوتیں تو رونا کس بات کا تھا۔ وہ بے چاری پورا دن میرے گھر والوں کی خدمتیں کر کر کے اتنی نڈھال ہو جاتی ہے کہ میرے ناشتے لگانے یا کوئی اور ذمہ داری اٹھانے کا وقت ہی نہیں ملتا بے چاری کو۔"

طارق کا نیم استہزائیہ لہجہ اپنے اندر تھوڑی سی رنجیدگی بھی لیے ہوئے تھا۔ ناہید چونک گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ حالات اس نہج پر بھی پہنچ سکتے ہیں۔

"تم اپنی بھی کوتاہیاں' چیک کرو' تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔" ناہید نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔

"تالی بے شک دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ دونوں ہاتھ کسی ایک فرد کے بھی ہوسکتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ مجھ میں اگر کوئی خامی یا کوتاہی ہے تو وہ مجھے بتائے تو کہ میری کیا بات' کیا انداز برا لگتا ہے' بس ہر وقت منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہے۔"

"تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ اسے تم سے کیا شکایت ہے یا کیا تکلیف ہے؟" ناہید نے چائے کی پتی اور چینی کیتلی میں ڈالی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ میں اسی جاننے نہ جاننے کے چکروں میں ہی ضائع ہو جاؤں گا۔" طارق کے لہجہ میں بے زاری تھی۔

"شادی کرنا آسان ہوتا ہے۔ زندگی بھر کسی کو نبھانا مشکل بہت کچھ ناپسندیدہ اور ناگوار لگتا ہے۔ مگر اگنور کرنا پڑتا ہے۔" ناہید نے بزرگانہ انداز میں نصیحت کی۔

"یہ جو نصیحتیں تم مجھے کررہی ہو نا' خود رتی برابر بھی ان پر عمل نہ کرو۔" طارق نے صاف گوئی کی انتہا کرتے ہوئے اسے آئینہ دکھایا۔

"مگر تمہیں ان پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ کیونکہ تم شادی شدہ ہو اور میریڈ لائف میں قدم قدم پر سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔" ناہید نے رسان سے بولتے ہوئے چائے دم پہ رکھی۔

"یہ باتیں تم اپنی بہن کو کیوں نہیں سمجھاتی ہو۔"

"اس لیے کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میری بہن کے مقابلے میں تم میری بات سمجھ سکتے ہو اور شاید مان بھی سکتے ہو۔" ناہید کا لہجہ سادہ سا تھا۔

"ویسے مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے تم دونوں بہنیں بالکل ہی ایک جیسی ہو' مزاج دار' بدتمیز' لڑاکا' میں سمجھتا تھا کہ ثمینہ تم سے بہت مختلف ہے۔" طارق نے پلیٹ صاف کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"تمہاری غلطی ہے۔ تم نے ایسا کیوں سمجھا۔ جب وہ میری بہن ہے تو ظاہر ہے میری طرح ہی ہو گی۔ تھوڑا بہت انیس بیس کا فرق ہوسکتا ہے۔ مگر یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک زمین' ایک آسمان۔" ناہید نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"نہیں' ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو سگی بہنیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ایک ہیروئن' ایک ویمپ۔"

"ہوتی ہوں گی' مگر ہم دونوں قریب قریب ایک جیسی ہی ہیں۔" ناہید نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔

"مجھے اس کا ذرا بھی اندازہ ہوتا تو اپنی مرضی کی کھائی میں چھلانگ لگاتا۔ کم از کم مرتے وقت افسوس تو نہیں ہوتا۔"

"تو اب کس بات کا افسوس ہے تمہیں؟" بولتے بولتے ناہید کی نظر کچن کے دروازے پہ پڑی۔ وہاں ثمینہ کھڑی تھی۔

"تم کب آئیں؟" ثمینہ کا لہجہ شک اور تفتیش دونوں لیے ہوئے تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے آئی تھی۔ اب جارہی ہوں۔ یہ کڑھی چاول لائی تھی۔ تم لوگوں کے لیے۔" ناہید نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"جس کے لیے لائی تھیں' اس نے تو خیر کھا ہی لیے۔" ثمینہ نے طنز کا وار کیا۔

"میں۔۔۔ تم سب کے لیے لائی تھی۔ اچھے خاصے ہیں، تم اور تائی بھی کھالو گی۔" ناہید خلاف توقع ملائمت سے بولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"چائے کس نے بنائی ہے؟" ثمینہ کی تفتیش کا رخ شوہر کی طرف مڑ گیا۔

"تم تو سو رہی تھیں۔ تمہاری بہن سے ہی بنوائی ہے۔" اس کے تفتیشی انداز پہ طارق کا لب و لہجہ بھی طنزیہ ہو گیا۔

"تمہاری بہن کیا ہوتا ہے۔ صرف میری بہن ہے وہ۔ تمہاری کیا کچھ اور لگتی ہے۔" ثمینہ کا انداز مزید تیکھا ہوا۔

"میری کزن ہے اور دوست بس۔"

"لڑکے، لڑکی میں دوستی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس رشتے کی آڑ میں لوگ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔" ثمینہ زہرخند ہوئی۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جسے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کسی آڑ کی ضرورت پڑے۔ مجھے جو کرنا ہوگا کھلے عام کروں گا۔ سب کے سامنے۔" طارق نے ترنت جواب دیا۔

"ہاں تم مرد ہو، کرسکتے ہو سب کچھ، سرعام، سب کے سامنے، مگر عورت کو تو اپنی نام نہاد عزت کا پردہ رکھنا ہوتا ہے دنیا کے سامنے۔"

"اس فالتو بکواس کا مقصد کیا ہے؟"

"سچائی فالتو بکواس ہی لگتی ہے بعض لوگوں کو اور میری بکواس کا مطلب تو تم خوب اچھی طرح سمجھتے ہو اور مقصد یہ ہے کہ میں اتنی بے خبر اور انجان نہیں ہوں جتنا کہ تم لوگ سمجھ رہے ہو۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی گھٹیا ذہنیت رکھتی ہو تو کبھی اس رشتے کے لیے ہامی نہیں بھرتا۔" طارق چائے کا کپ سلیب پر پٹختے ہوئے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ چھت پر کپڑے پھیلانے گئی تھی، جب طارق کو وہاں کھڑا دیکھ کر چونک گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو اس وقت؟" ناہید نے کڑے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"کیوں؟" ناہید اس پر دوبارہ نظر ڈالے بغیر کپڑے پھیلانے لگی۔

"تم اپنی بہن کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔" طارق نے بغیر کوئی تمہید باندھے اس سے سوال کیا۔

"سمجھنے کی ضرورت تو تمہیں بھی ہے۔" ناہید نے اسے جتایا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں کچھ سمجھتا نہیں ہوں یا جان بوجھ کر اپنی لائف ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ میں جتنی کوشش کرتا ہوں اس کے قریب ہونے کی، اس شادی کو نبھانے کی، وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دیتی ہے جس سے میری ساری کوشش، سارے جتن ملیامیٹ ہوجاتے ہیں۔ سچ کہوں، میں عاجز آگیا ہوں سب سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔" طارق بہت تھکا ہوا، بے بس اور اداس لگ رہا تھا۔

"تمہارا قصور ہے سارا، تم سے کس نے کہا تھا کہ میرا نام لے کر اسے کچھ جتاؤ۔ مجھے بیچ میں لائے بغیر بھی تم اپنے غصے کا اظہار کرسکتے تھے اب اس کے دل میں ہم دونوں کے لیے شک بیٹھ گیا ہے، تمہیں ہی محبت اور تحمل سے کام لے کر اس شک کو دور کرنا ہے۔" ناہید کپڑے پھیلاتے ہوئے اسے اب نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

"میں نے تو یونہی صرف ایک بار غصے میں ایک بات کی تھی وہ اس بات کو پکڑ کر بیٹھ گئی اور اب تک اس چنگاری کو ہوا دے دے کر شعلہ بنا دیا ہے اس نے۔"

"اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں ذرا ہوش کے ناخن لو، ایسا نہ ہو کہ اس کی لپیٹ میں تمہارا گھر اور زندگی دونوں آجائے۔"

"تمہیں اب بھی میرا خیال ہے؟ احساس ہے؟" طارق یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے نرم اور پر اثر لہجے میں وہ کبھی بولتی تھی۔

"کیوں نہیں ہوگا مجھے تمہارا خیال، کوئی دشمنی تھوڑی ہے تم سے۔ آخر تم میری۔۔۔" ناہید کا فقرہ منہ میں رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ "آخر تم میری بہن کے شوہر ہو۔"

ثمینہ جانے کب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ اپنی شعلہ بار نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی جس میں نفرت بھی تھی اور ذلت و حقارت بھی۔

"ہاں ہاں بات پوری کرو اپنی، تمہیں اب بھی اس کا خیال ہے یہ تمہاری پہلی اور آخری محبت جو ہے۔" وہ زہرخند لہجے میں گویا ہوئی۔

"یہ کھیل کب سے تم دونوں کھیل رہے ہو۔ سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ تم تو ڈائن سے بھی بدتر نکلیں۔ اپنی سگی بہن کو ہی نہیں چھوڑا۔ تم لوگ چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتے ہو۔ محبت کی باتیں کرتے ہو، تمہیں شرم نہیں آئی تم لوگوں کو، میرے ساتھ اور کتنے لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو تم دونوں، بندوں سے شرم نہیں آتی تو کیا خدا سے بھی بے شرم ہوگئے، اللہ سے تو تھوڑی حیا کرلیتے۔" وہ پاگلوں کی طرح زور زور سے چیخ رہی تھی۔

طارق اور ناہید اس اچانک افتاد پر یکدم جیسے پتھر کے بت بن گئے تھے۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو تم، دماغ ٹھیک ہے تمہارا، کچھ ہوش بھی ہے یہ کیا بکواس کیے جارہی ہو؟"

ناہید کے پتھر وجود میں ہی حرکت ہوئی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ ثمینہ کے منہ پہ مارے۔ خفت اور شرم کے مارے اس کا برا حال تھا۔ گھر سے گھر ملے ہوئے تھے اور چھتوں سے چھتیں، شام کا وقت تھا ویسے ہی اکثر لوگ اپنی اپنی چھتوں پہ موجود تھے ارد گرد کی منڈیروں سے لوگوں کے سر طلوع ہونا شروع ہوگئے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوگیا؟"

طارق ابھی تک بت بنا کھڑا تھا اور ثمینہ کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل چیختے چلی جارہی تھی۔

"ارے میں لٹ گئی، برباد ہوگئی، میری سگی بہن نے مجھے لوٹ لیا، میرے شوہر نے مجھے دو کوڑی کا کردیا، دونوں نے مل کر میرا جنازہ تیار کردیا، مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔"

"چپ ہوتی ہے یا لگاؤں ایک۔" طارق اس کے قریب کھڑا ہوا۔

"چل، نیچے چل۔" اس نے ثمینہ کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔

"کیوں؟ میں نیچے چلی جاؤں اور یہاں تم دونوں کو اکیلا چھوڑ دوں رنگ رلیاں منانے کے لیے۔"

"ارے کیا ہوا؟ یہ شور شرابا کون کر رہا ہے اوپر۔" امی اور دادی ہانپتی کانپتی اوپر آرہی تھیں۔ نیچے سے تائی بھی زور زور سے آواز لگا رہی تھیں۔ ثمینہ کے چیخنے کی آواز نیچے تک پہنچ رہی تھی۔

"بکواس بند کر اور نیچے چل۔" طارق نے اس کا بازو دبوچا اور سیڑھیوں کی طرف دھکیلنے لگا۔

"دور ہٹو، ہاتھ مت لگاؤ مجھے، ناپاک غلیظ انسان۔" ثمینہ نے پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا، طارق اس اچانک جھٹکے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا توازن بگڑا اور وہ لڑھک کر دو سیڑھی نیچے جاگرا۔

"کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" ناہید غیر ارادی طور پر آگے بڑھی، ذلت اور بے بسی کے احساس نے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھردی تھیں۔

"تیری یہ مجال، یہ ہمت، تو نے۔۔۔" طارق تیر کی طرح اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"ساری دنیا کو بتاؤں گی تم دونوں کے کرتوت۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر نفرت سے تھوکا۔

ناہید کو خبر بھی نہیں تھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوچکا تھا۔ وہ شاید کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ طارق کے دل کو یکایک کچھ ہوا۔ ایک لمحے کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے ادھر ثمینہ کی زبان مسلسل انگارے اگل رہی تھی جیسے ان انگاروں اور شعلوں میں آج ناہید اور طارق دونوں کو بھسم کر ڈالے

گی۔
"آخری بار پوچھ رہا ہوں تو یہ تماشا بند کرے گی یا نہیں؟" طارق نے غیر متوقع طور پر خود پر قابو پا کر بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔
"میں نہیں، تم دونوں کر رہے ہو، تم بند کرو یہ تماشا۔" ثمینہ زہر خند ہوئی۔
"چل تو پھر میں ہی یہ تماشا ختم کر دیتا ہوں آج۔" طارق نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولتے ہوئے آگے وہ الفاظ بولے جنہیں سن کر عرش بھی کانپ جاتا ہے، پل بھر میں اس کی بیوی اس کے لیے پرائی ہو گئی تھی۔
قریب قریب اوپر پہنچتی دادی اور امی نے طارق کے منہ سے طلاق کے الفاظ سنے تو وہیں تیورا کر سیڑھیوں پر ہی گر پڑیں۔
طارق سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیزی سے نیچے اتر گیا۔ ناہید سیڑھی کی دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور جس پر اصل افتاد ٹوٹی تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا، نہ دکھ، نہ خوشی، نہ کچھ چھن جانے کی اذیت، نہ من چاہی آزادی ملنے کا اطمینان، کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے چہرے پہ۔

☼ ☼ ☼

طوفان آیا اور آ کر گزر گیا، مگر اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی داستانیں چھوڑ گیا۔
کیا ہوا؟ کیا ہوا تھا؟ ایسا کیا ہو گیا کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی؟ اپنے پرائے سب کے لبوں پہ ایک ہی سوال تھا۔ پھر لوگ خود ہی سوالات کے جوابات اخذ کرنے لگتے۔
"شک؟ شک ہوا تھا بیوی کو؟"
"کس پر؟ سگی بہن پر... ہا... ہائے..." لوگوں نے انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔
ناہید کے ماں باپ نے دوسرا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اب ایک ہی گھر میں رہنا یوں بھی مناسب نہ تھا پھر آئے گئے کے سوالوں اور تفتیش سے بھی جان چھوٹ گئی۔ دادی بھی بیٹے بہو کے ساتھ نئے گھر میں آ گئی تھیں۔ زیادہ وقت چپ چاپ بیٹھی رہتیں، گھر بھر میں اب بولتا ہی کون تھا، سب کے سب جیسے روبوٹ سے ہوئے تھے، روٹین کے کام، نپی تلی بات، زندگی تو عجیب ڈگر پر چل نکلی تھی۔
ناہید خاموشی سے سر جھکائے، کاغذ سیاہ کرتی رہتی اور گھر کے روزمرہ کے کام، ثمینہ زیادہ تر ایک کمرے میں اپنا ٹھکانا بنائے رہتی، بھوک لگتی تو کھانا کھا لیتی، اپنے برتن دھو کر رکھ دیتی، کبھی کبھار دادی کو یا ابو کو چائے بنا کر دے دی، اپنے کپڑے دھو لیے، چھوٹے بھائیوں کے چھوٹے موٹے کام کر لیے یا پھر کتابوں میں سر دیے کر بیٹھ جاتی، گھر میں ابھی تک اس سے کسی نے کوئی سوال جواب نہیں کیے تھے۔ طارق نے انہیں پہلے ہی الف سے لے کر یے تک ساری داستان سنا دی تھی۔ دونوں شریف طبع اور بھلے مانس انسان اپنا دکھ اپنے دل میں ہی دبائے سر جھکا کر رہ گئے۔ کیا کہتے؟ کس سے کہتے؟
دوپہر کا وقت تھا، ثمینہ کمرے میں سو رہی تھی، ناہید نے دادی کو کھانا دیا۔
"کبھی دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کر، ہر وقت قلم چلاتی رہتی ہے۔" دادی نے بڑے دنوں بعد اپنے مخصوص انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔
"جی!" وہ ایک گہری سانس لے کر ان کے پاس تک گئی۔
"تیری بہن نے بڑا تماشا کیا۔ اپنی بھی زندگی تباہ کی اور ساتھ ساتھ گھر والوں کی بھی۔ تیرے ماں باپ تو دونوں گائے ہیں۔ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے، کوئی اور ہوتا تو لڑکی کی ناک چٹیا کاٹ کر ہاتھ پہ دھر دیتا۔" کئی مہینوں کی خاموشی کے بعد دادی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔
"شاید یہی نصیب میں لکھا تھا۔"
"ہاں، چھلنی میں پانی ڈالو اور تقدیر کو ٹٹولو، اپنے ہی کیے کا پھل ہے جو اس کے آگے آیا ہے، اجڑ کے بیٹھ

گئی گھر میں، اب کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی یہاں کنواریوں کے رشتوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں، طلاق یافتہ کو کون پوچھے گا۔"
"سب کی ہو جاتی ہیں دادی، دیر سویرے ہی سہی ایک، دو کیا لوگوں کی تین تین شادیاں بھی ہو جاتی ہیں، نجلی تایا کی بیٹی کی تیسری شادی نہیں ہوئی پچھلے سال۔" ناہید نے انہیں تسلی دینے کو ایک مثال بھی دے دی۔
"شریفوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے بٹی، ایک چھوڑ دوسرے کو پکڑ، دوسرے کو چھوڑ تیسرے کو پکڑ، شادی بیاہ نہ ہوا کھیل تماشہ ہو گیا۔" دادی نے اسے لتاڑا۔
"اب تو زندگیاں ہی کھیل تماشا بن گئی ہیں دادی، تو شادی بیاہ کیا چیز ہے۔" ناہید اٹھ کھڑی ہوئی۔
"پانی لے آؤں آپ کے لیے؟"
"ہاں مٹکے سے لانا مجھ سے نہیں پیا جاتا یہ فریج کا ٹھنڈا پانی۔"

☼ ☼ ☼

ناہید نے ٹھیک ہی کہا تھا دوسری شادی بھی ہو ہی جاتی ہے، یہ کوئی دنیا سے انوکھا نرالا یا ناممکن کام تو نہیں۔ ناہید کے رشتے کے لیے کوششیں جاری تھیں، ادھر ثمینہ کے لیے ایک رشتہ آ گیا اور رشتہ لانے والے کون؟ تایا ابو جو اس سارے واقعے میں اپنے بیٹے کو بھی برابر کا قصوروار سمجھتے تھے۔ بیٹے کے غصے، انا پسندی اور تنگ مزاجی سے خوب واقف تھے۔ بھتیجی سے زیادہ محبت انہیں اپنے بھائی سے تھی، جو بے قصور ہوتے ہوئے بھی اتنے بڑے کرب سے گزر رہا تھا۔ عمران ان کے عزیز دوست کا بیٹا تھا۔ جدہ میں رہائش اور ملازمت تھی، تین بچے چھوڑ کر بیوی فوت ہو گئی تھی۔ تایا ابو کچھ یوں بھی اس رشتے پہ زور دے رہے تھے کہ بیٹے کے ہاتھوں پہنچنے والی تکلیف اور بگاڑ کا ازالہ کرنا چاہتے تھے اور ابو امی نے یہ رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بیٹی سب سے دور الگ تھلگ تھی۔ شادی ہو کر دور جائے گی تو شاید سب کے قریب ہو جائے۔
ثمینہ کے پاس اب کوئی راستہ نہیں تھا طلاق یافتہ کا لیبل تو لگ ہی چکا تھا اس نے ہامی بھر لی ناہید نے بھی سکون کا سانس لیا دو ماہ بعد وہ رخصت ہو کر اپنی نند کے گھر گئی اور چھ ماہ بعد شوہر کے پاس جدہ چلی گئی۔ ڈیڑھ سال میں زندگی نے لوگوں نے کتنے رنگ بدلے تھے۔
پتہ نہیں یہ ڈیڑھ سال ہماری زندگی میں کیوں آیا؟ ناہید کبھی کبھی سوچتی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو؟" آج تقریباً دو سال بعد اس نے طارق کی آواز سنی تھی۔
"ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟"
"ٹھیک ہوں۔"
"تایا ابو اور امی؟"
"ہاں وہ بھی ٹھیک ہیں، پچھلے دنوں ابو کے معدے میں تکلیف ہو گئی تھی، اب تو اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔"
"ہاں پتا چلا تھا مجھے، ابو امی انہیں دیکھنے گئے تو تھے۔"
"تم کیوں نہیں آئیں؟"
"یونہی، فون پہ ان سے خیریت معلوم کر لی تھی۔"
"جب سے یہاں سے گئی ہو ایک بار بھی پلٹ کر نہیں آئیں۔" طارق نے شکوہ کیا۔
"ضروری تو نہیں ہے پلٹنا۔"
"کیا تم بھی مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہو؟"
"اب کیا فائدہ اس قسم کی باتوں کا؟"
"مجھے فائدے، نقصان سے کوئی مطلب نہیں، میں بس تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھے قصوروار سمجھتی ہو یا نہیں۔" طارق کا وہی مخصوص ہٹ دھرم لہجہ لوٹ آیا۔
"میری رائے میں کسی حد تک قصور تمہارا بھی تھا۔" ناہید نے دو ٹوک جواب دیا۔
"کیا قصور تھا میرا؟" طارق نے ایک گہری سانس

لی۔

"اسے شک ہوا تھا، تم نے اس کے شک کو دور کرنے کے بجائے اپنی حرکتوں اور باتوں سے اور بڑھاوا دیا۔ تمہارے اس غیر سنجیدہ رویے نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔"

"تم جانتی ہو، میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ میں اپنی بیوی سے چھپ کر نہ تو کسی سے فلرٹ کر رہا تھا، نہ ہی عشق لڑا رہا تھا پھر میں کس بات کی وضاحت کرتا اس کے سامنے، کس معاملے کی صفائی پیش کرتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ چونکہ تم اپنے معاملے میں فیئر تھے، سچے تھے اس لیے بڑی آسانی سے اس کا شک دور کر سکتے تھے، سچ کو اپنی وضاحت کے لیے زیادہ ثبوتوں کی اور دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود ہی اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔"

"جب آنکھوں پہ شک کی پٹی بندھ جائے تو نہ سچ نظر آتا ہے نہ سچائی۔" طارق کا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہو گیا۔

"اب چھوڑو یہ بے کار کے سوال جواب، اس کی شادی ہو گئی ہے، تمہاری بھی ہو جائے گی۔ ماضی کو دہرا کر کیا ملے گا۔" ناہید نے بات ختم کرنی چاہی۔

"ٹھیک کہتی ہو، ماضی کو دہرا کر کیا ملے گا۔" طارق نے ہولے سے کہا۔

"اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ لو۔" ناہید نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہارا رشتہ طے ہونے جا رہا ہے؟"

"ہاں!"

"ابھی فائنل جواب تو نہیں دیا نا؟" طارق کو مکمل معلومات تھیں۔

"کل دیں گے۔"

"اگر میں تمہیں پرپوز کروں تو؟"

"جو جواب پہلے دیا تھا، وہی اب بھی ہو گا۔" ناہید نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"لوگوں سے ڈرتی ہو کہ ثمینہ کے الزامات سچ ہو جائیں گے؟"

"میں لوگوں سے نہیں ڈرتی، میرا دل صاف ہے اور ہاتھ بھی۔"

"پھر انکار کی وجہ؟"

"ضروری نہیں تمہارے ہر سوال کا جواب میرے پاس ہو۔ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی، میرا اتنا کہنا کافی نہیں؟"

"تم نے پہلے کی طرح آج بھی مجھے بہت مایوس کر دیا۔" طارق کا لہجہ شکستہ تھا اور دل اس سے بھی زیادہ۔

"تمہیں کوئی اچھی بیوی مل جائے گی تو تمہاری ساری اداسی اور مایوسی دور ہو جائے گی۔ ضروری نہیں زندگی ہماری مرضی اور خواہش کے مطابق گزرے، جو ہمارے پاس ہے، ہماری دسترس میں ہے، وہی ہمارا نصیب، ہماری خوشی ہے، باقی سب خواب و خیال ہے اور زندگی خواب خیال کے سہارے نہیں گزرتی۔ اچھا اللہ حافظ۔" ناہید نے اپنی بات مکمل کر کے یکدم ہی اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

"لفظوں کی کھلاڑی ہو نا، لفظوں سے ہی مات دیتی ہو بندے کو۔" دوسری طرف طارق کے لبوں پہ ایک مضمحل، بے بس سی مسکراہٹ آگئی۔

☼ ☼ ☼

نیا گھر، نئے لوگ، زندگی کا ایک نیا رخ، شروعات ہو چکی تھی، ہفتہ دس دن کی نئی نویلی دلہن سے وہ اب تین ہفتے پرانی دلہن ہو چکی تھی۔ کھیر پکوائی کی رسم کل ہی ہوئی تھی، آج اسے گھر کے کاموں کا چارج دے دیا گیا تھا خیر گھر میں افراد ہی کتنے تھے جو کام ہوتا۔ ساس، سسر حیات نہیں تھے، ظہیر اور سجیلہ دو ہی بہن بھائی تھے، سجیلہ کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی، اچھی، خوش مزاج لڑکی تھی، گھر میں بڑی خالہ رکی ہوئی تھیں ایک ڈیڑھ مہینے سے۔ اب انہوں نے بھی بوریا بستر باندھ لیا تھا۔

"لو بھئی بہو بیگم، اب گھر اور گھر والا تمہارے حوالے۔" انہوں نے چلتے وقت ناہید کے سر پہ ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ سجیلہ پہلے ہی جا چکی تھی، باقی رشتے دار جو رکے ہوئے تھے ولیمے کے بعد ہی چلے گئے تھے۔ گھر یکدم خالی خالی سا ہو گیا بہت سے لوگ ناہید کی قسمت پہ رشک بھی کر رہے تھے۔

"بڑی اچھی قسمت ہے بھئی، نہ سسرال کا جنجال، نہ سرالیوں کا بکھیڑا، ایک میں ایک میرا بیٹا باقی سب روانہ۔" یہ دادی کا تبصرہ تھا۔

"چلو اچھا ہے، تمہیں لکھنے کے لیے وقت مل جائے گا۔" امی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں خوشی کا اظہار کیا، سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔

دو مہینے بعد دھیرے دھیرے نئی نئی شادی کا خمار کم ہونے لگا تو ایک دوسرے کے مزاج اور عادات کے بارے میں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔

ظہیر کے بارے میں ایک بات شروع میں ہی بہت اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ وہ بہت نفاست پسند تھا، معمولی سی شکن، معمولی سا دھبہ، گرد کا ایک ذرہ بھی اس کی طبع نازک پر گراں گزرتا تھا۔

"افوہ!" ناہید قدرت کی اس ستم ظریفی پہ کراہ اٹھی۔

وہ تو بس مارے باندھے صفائی ستھرائی کر لیتی اور چیزوں کو ٹھکانے سے رکھ دیتی۔ اس طریقے اور سلیقے کا اس میں فقدان تھا جو ظہیر کو مطلوب تھا۔ وہ خاصی حد تک لاپروا، غیر منظم اور بے ترتیب تھی اور ظہیر اس کے بالکل برعکس۔

"ناہید بی بی، وہ تو تمہاری خاطر خود کو بدلنے سے رہا، تمہیں ہی اپنی خراب عادتیں بدلنا پڑیں گی۔" ناہید نے خود کو وارننگ دی۔

اس دن بھی ظہیر آفس سے آیا تو گھوم پھر کر گھر کا، چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔

"تم نے ڈسٹنگ نہیں کی آج؟"

"کی تو تھی۔" ناہید نے کچھ حیرت اور خفگی سے شوہر نامدار کی جانب دیکھا جو نئی سنوری بیوی کی طرف توجہ دینے کے بجائے ساز و سامان کی طرف متوجہ تھا۔

"کب کی تھی؟"

"صبح کی تھی۔" ناہید نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"ایک ہی ٹائم صفائی کر کے فارغ ہو جاتی ہو؟"

"تو کیا تینوں ٹائم صفائیاں کرتی رہوں، صبح، دوپہر، شام۔" ناہید کی فطری تنک مزاجی عود آئی۔

"کیا حرج ہے۔" ظہیر نے شانے اچکائے۔

"دیکھو نا، گھر تو تمہارا ہے، تم صاف ستھرا رکھو گی اسے تو گھر آنے والے تمہاری ہی تعریف کریں گے، ورنہ تم جانتی ہو لوگوں کی زبانیں۔"

"میری بلا سے، کوئی تعریف کرے یا تنقید، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"مگر مجھے تو پڑتا ہے۔" ظہیر نے غور سے اسے دیکھا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے تعریف کر دی۔

"شکریہ، گھر سے ہٹ کر آپ کی نظریں مجھ پر تو آئیں۔" ناہید نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"کیا کروں، پرانی عادت ہے، میں گھر آتے ہی سب سے پہلے گھر کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہر شے اپنی جگہ ٹھکانے سے، صاف ستھری ہو، سجیلہ تھی نا گھر میں، وہ پورا گھر آئینے کی طرح چمکائے رکھتی تھی، کیا کمرے، کیا کچن، باتھ روم، اسٹور، برآمدہ ہر کونا کھدرا، صاف ستھرا۔ میرے مزاج اور عادت سے واقف تھی، اس لیے کہیں کوئی کمی نہیں چھوڑتی تھی۔" ظہیر بہن کی تعریف میں رطب اللسان ہوا۔

"کہنے کو تو آپ شوہر ہیں، مگر ساس کی کمی بھی پوری کر رہے ہیں۔" ظہیر کی باتوں پہ جانے کیوں ناہید کی جان جل کے رہ گئی۔

"ساس کی کمی؟ میں نے بھلا ایسا کیا کہا ہے، تمہیں گھر صاف ستھرا رکھنے کو تو کہا ہے بس۔" ظہیر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ناہید بھی منہ پھلا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

"ہونہہ، سارا دن ماسی بن کر گھر میں جتے رہو۔" وہ دیر تک غصے میں کھولتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے بھئی، شادی کر کے ہمیں بھول ہی گئیں، تین چار مہینے ہو گئے شادی کو تم نے کوئی ناول لکھا ہی نہیں اب تک، بس چھوٹی موٹی کہانیوں پہ ٹرخا رہی ہو۔" اس کی سہیلی نورین بڑے شگفتہ انداز میں اس سے مخاطب تھی۔

"ایک ناول شروع کیا ہوا ہے۔ بس مکمل ہونے والا ہے پھر بھیج دوں گی۔" ناہید نے اسے جواب دیا۔

"بس جلدی سے مکمل کر کے بھجوا دو، ہم بھی تو دیکھیں، شادی نے تمہارے قلم کو دو چار چاند لگائے یا نہیں۔"

"بات سنیں محترمہ! ہمارے ہاں شادی کے بعد اکثر خواتین قلم کاروں کے قلم کو گھن ہی لگتا ہے، چاند نہیں۔" ناہید نے ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ایسا بھی ہوتا ہے، مگر تم تو خوش نصیب ہو، تمہارے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں، شوہر صاحب آفس روانہ، پیچھے تم اکیلی، سارا دن فارغ ہی رہتی ہو گی۔"

"فارغ؟" ناہید نے آہ بھری۔ آدھے سے زیادہ دن تو گھر اور سازو سامان کو صاف کرنے، دھونے اور چمکانے میں لگ جاتا تھا یہ اور بات کہ ظہیر کی تسلی پھر بھی نہیں ہوتی تھی۔ نورین کو اب بھلا وہ کیا داستانیں سناتی ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے موبائل آف کر دیا۔

"کس کا فون تھا؟" ظہیر سامنے ہی بیٹھا تھا۔

"سہیلی کا تھا۔"

"کون سی سہیلی؟" اس کی جرح جاری تھی۔

"اب آپ کو کیا بتاؤں، کون سی سہیلی، آپ میری سہیلیوں کو جانتے ہیں کیا؟" ناہید کبھی کبھار اس کے پے در پے سوالات سے بے زار ہو جاتی تھی۔

"اب شادی ہو گئی ہے، پہلے کے دوستانے آہستہ آہستہ کم کرو۔" ظہیر کی پھر ایک نصیحت، ناہید بری طرح سلگ گئی۔

"شادی نہ ہوئی، کالے پانی کی سزا ہو گئی، ساری عادتیں چھوڑ دو، رشتے داروں کو چھوڑ دو، سہیلیوں کو چھوڑ دو، اپنے شوق، مشاغل، دلچسپیاں سب کچھ چھوڑ دو۔" ناہید بے طرح شروع ہو گئی۔

"تمہیں اتنی جلدی، اتنا غصہ کیسے آجاتا ہے۔" ظہیر بڑے اطمینان سے بولتا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے بات ہی ایسی کی ہے، غصہ نہیں آئے گا تو اور کیا آئے گا۔"

"سائیکلو جسٹس کہتے ہیں کہ بعض اوقات انسان اپنی کوئی چوری چھپانے اور دوسرے پہ حاوی ہونے کے لیے خود کو بہت غصیلا ظاہر کرتا ہے، مگر در حقیقت اس کا غصہ مصنوعی ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اتنی نادان اور نا سمجھ تو نہیں ہو کہ میری واضح باتوں کا بھی مطلب پوچھو۔" ظہیر ایک تلخ سی مسکراہٹ لیے وہاں سے اٹھ گیا اور ناہید اس کی بات پر غور ہی کرتی رہ گئی۔

اور ظہیر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، وہ اتنی نا سمجھ تو نہیں تھی غور کیا تو جانے کیا کیا کچھ اس پر عیاں ہونے لگا۔

جب سے شادی ہوئی تھی وہ ایک رات بھی اپنے گھر نہیں رک سکی تھی، ظہیر اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور ساتھ ہی واپس لے آتا۔ شروع کے دنوں میں تو یہ بات بڑی رومانٹک سی لگتی تھی جب وہ اپنی آنکھوں میں وارفتگی لیے اسے روکتا تھا۔

"میں کیسے رہوں گا تمہارے بغیر۔"

"پہلے کیسے رہتے تھے؟" ناہید کی مسکان میں شرم بھی ہوتی اور ادا بھی۔

"پہلے کی بات اور تھی، اب تو تم سے دور رہنے کو دل نہیں مانتا۔"

"ایک، دو دن کی تو بات ہے۔"

"تم ایک دو دن کی بات کرتی ہو؟ یہاں ایک دو گھنٹے کی دوری بھی سال برابر لگتی ہے، اچھا دیکھو میں تمہیں روزانہ گھر والوں سے ملانے لے جاؤں گا، پر اس

وہ پیار محبت سے بہلا پھسلا کر کسی نہ کسی طرح اسے میکے نہ رکنے پر آمادہ کر ہی لیتا۔ بعد میں یہ رومانس مجبوری میں ڈھل گیا۔

"مجھے ناشتا کون بنا کر دے گا؟ بازار کے کھانوں سے میرے معدے میں تکلیف ہو جاتی ہے۔"

"پہلے بھی تو بناتے تھے۔"

"وہ تو مجبوری تھی، تم نہیں تھیں نا، اب تمہارے ہاتھوں کے ذائقے کی عادت پڑ گئی ہے۔ صبح صبح تمہارے پیارے پیارے ہاتھوں سے بیڈ ٹی نہ پیوں تو صبح ہی نہیں ہوتی۔" مجبوری میں رومانس کا تڑکا بھی لگ جاتا۔

ناہید کئی بار خفا بھی ہوئی مگر ظہیر نے اسے منا لیا۔ ظہیر اسے میکے رکنے کیوں نہیں دیتا تھا، ساتھ لے جاتا، ساتھ واپس لے آتا کیا تھی وجہ محبت یا مجبوری یا کچھ اور... ناہید کا ذہن اب دوسری نہج پر سوچ رہا تھا۔

وہ کہیں فون کرتی یا اس کے فون آتے تو سوال جواب کا ایک سلسلہ، وہ جواب دیتے دیتے تنگ آجاتی، مگر ظہیر سوال کرتے کرتے نہ تھکتا تھا۔

ظہیر اکثر اس کا موبائل لے کر بیٹھ جاتا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ حیران ہوتی۔

"چیک کر رہا ہوں، میرے علاوہ اور کون میری پیاری بیوی کو پیار بھرے میسجز بھیجتا ہے۔" ظہیر سنجیدگی سے بولتا اور وہ ہنس پڑتی تھی۔

گھر کشادہ تھا، مگر اس میں ایسی کوئی کھڑکی، روزن، دریچہ نہیں تھا جس سے باہر کا آسمان دیکھ سکتی، ہاں البتہ دھوپ، ہوا، روشنی کے لیے بلندی پر چھت کے قریب روشن دان بنے ہوئے تھے۔ بڑی سی چھت تھی، سیڑھیوں کے اختتام پر گرل کا دروازہ لگا ہوا تھا جو مقفل رہتا تھا۔

"آس پاس کے گھروں کے ساتھ چھت ملی ہوئی ہے، کسی کا کوئی بھروسا نہیں پھر کوئی چور، ڈاکو بھی کسی کی چھت سے ہماری چھت پر آسکتے ہیں، نیچے آسکتے ہیں، اس لیے یہ دروازہ عموماً "لاکڈ" رہتا ہے۔" ظہیر نے اسے بتایا تھا۔ ہاں رات میں ہوا کھلانے کے لیے وہ ناہید کو اپنے ساتھ چھت پہ لے جاتا اور ساتھ نیچے لے آتا۔

شادی کے اولین دنوں میں ہی ظہیر روزانہ لے تاکید کر کے جاتا۔

"گیٹ اندر سے لاک کر لینا، پوچھے بغیر، تصدیق کیے بغیر ہرگز گیٹ نہیں کھولنا، حالات بہت خراب ہیں، محلے میں دن دہاڑے کئی ڈکیتیاں پڑ چکی ہیں۔"

ظہیر کے جانے کے بعد گیٹ دن بھر لاک ہی رہتا، شام میں اس کی آمد پر ہی کھلتا تھا۔ مہمان کم ہی آتے تھے۔ سجیلہ بھی آتی تو عموماً "چھٹی کے دن۔"

ابھی تک ناہید کو علم بھی نہیں تھا کہ اس علاقے میں بازار کہاں کہاں ہے مہینے بھر کا سودا سلف ظہیر لے آتا تھا۔ ہفتے بھر کا گوشت، سبزیاں فریج میں موجود رہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ناہید سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ کئی مہینوں بعد اس کا نیا ناول شائع ہوا تھا۔

"ہاں بھئی یہ ہے جو آپ کئی ہفتوں سے لکھ رہی تھیں؟" ظہیر نے ڈائجسٹ اٹھایا۔

"ہاں، خدا خدا کر کے مکمل ہو ہی گیا۔" ناہید فخریہ مسکرائی۔

اگلی رات ظہیر اس کے ناول پر تبصرہ کر رہا تھا۔

"تم نے بڑی گہرائی میں جا کر لکھا ہے خصوصاً" محبت کے بارے میں۔" اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ناہید نے ٹھٹھک گئی۔

"محبت بڑا خوب صورت احساس ہے، ہے نا؟" وہ یکایک مسکرایا۔

ناہید پلک جھپکے بنا اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جو پل پل رنگ بدلنے میں ماہر تھا۔

"بتاؤ نا؟" ناہید کی خاموشی پہ ظہیر نے اصرار کیا۔

"کہتے تو یہی ہیں لوگ۔" ناہید نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تم کیا کہتی ہو؟"

"میں اپنی رائے محفوظ رکھتی ہوں۔" ناہید کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"مگر تمہارا لکھا ہوا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ محبت کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے۔"

"اچھا، پھر؟"

"پھر یہ کہ اتنے خوب صورت احساس کو اتنی گہرائی اور شدتوں کے ساتھ بیان کرنا آسان نہیں، اس میں خالی مشاہدہ کام نہیں آتا، تجربہ بھی چاہیے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کھل کر کہیں۔" ناہید کی سنجیدگی میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"بس یہی کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے جس سے بھی محبت کی، بڑی شدت کے ساتھ اور دل کی گہرائیوں سے کی۔" ظہیر کا لہجہ بہت پرسکون اور ہموار تھا، مگر ناہید کے سر پہ جیسے کوئی بم پھٹا تھا۔ اس کے وجود کے پرخچے اڑ رہے تھے۔

"میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔" ناہید نے اس کی بات کو جھٹلایا۔

"شادی کے بعد بھی نہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شادی کے بعد اپنے شوہر سے بھی محبت نہیں کی؟" ظہیر لفظوں کی مار ہی نہیں مارتا تھا بلکہ لفظوں سے گھیرتا بھی تھا۔

"محبت اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نہیں ہوتی۔" ناہید نے جتایا۔

"ہم نے تو سنا ہے کہ کبھی ایک پل ہی کافی ہوتا ہے۔"

"ہاں کبھی ایک پل بھی کافی ہو جاتا ہے اور کبھی صدیاں بھی لگ جاتی ہیں۔"

"ویسے تم میرا سوال گول کر گئیں۔"

"کون سا سوال؟"

"محبت کے بارے میں کچھ پوچھا تھا میں نے، تمہاری محبت کے بارے میں؟" ظہیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"میں اس سوال کا جواب دے چکی ہوں۔" ناہید نے اپنے شدید ترین غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"ویسے کتنی عجیب سی زندگی ہو جاتی ہے نا، انسان کا دل کہیں اور، وجود کہیں اور۔" ظہیر اس کی وضاحت سے بے نیاز اپنی ہی ہانک رہا تھا۔

"میرا دل وہیں ہے جہاں میرا وجود ہے اور اب آپ ایک لفظ بھی مزید نہیں بولیں گے۔" ناہید نے بے حد سختی اور غصے سے کہا تھا۔

"اور اگر میں خاموش نہ ہوا تو؟" ظہیر اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"جھگڑا ہو جائے گا ہم دونوں کے درمیان، میں نے اپنے مزاج اور عادت کے برخلاف بہت برداشت کر لیا آپ کی باتوں کو۔"

"اوہو ہو...!" وہ ہنسا۔ "مجھ سے جھگڑا کرو گی، کس بات پہ؟ اس بات پہ کہ شادی سے پہلے تم نے کسی سے محبت کی تھی؟ تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" ظہیر کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"اف ف..." ناہید کا جی چاہا اپنے بال نوچ لے یا پھر سامنے بیٹھے اس شخص کا منہ۔

رات کو ظہیر تو بڑے آرام سے سو گیا تھا، رات کی خاموشی اور تنہائی میں ناہید جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ اس کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں، اس روح فرسا انکشاف کے بعد کہ اس کا شریک سفر ایک انتہائی شکی مزاج انسان ہے۔

"تمہیں کیا پتا، جب بے قصور ہوتے ہوئے بھی ہمارے کردار پر شک کیا جائے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" ناہید کو اس وقت بار بار طارق کا خیال اور اس کی باتیں یاد آرہی تھیں جو وہ ثمینہ کے حوالے سے کرتا تھا۔

"ایک بد مزاج اور بد شکل انسان کے ساتھ گزارا ہو سکتا ہے، مگر شکی مزاج کے ساتھ گزارا۔ اللہ توبہ۔ مجھے تو یہ احساس ہی مار ڈالتا ہے کہ میری لائف پارٹنر میرے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے اور مجھے کتنا برا اور غلط سمجھتی ہے۔"

طارق اسے بتاتا تھا، اس سے کہتا تھا اور وہ کتنے

آرام سے اسے مشورے دے دیتی تھی۔ اس کے احساسات کو سمجھے اور جانے بغیر کبھی کبھی اسے ہی موردِ الزام ٹھہرادیتی تھی۔

"سچ کو اپنی وضاحت کے لیے دلیلوں اور ثبوتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سچائی خود ہی اپنے آپ کو منوالیتی ہے۔" ناہید کے لیے اس وقت یہ سب کہنا آسان تھا اور طارق نے کہا تھا کہ جب آنکھوں پہ شک کی پٹی بندھی ہو تو نہ سچ نظر آتا ہے نہ سچائی۔

"کتنا صحیح کہا تھا اس نے میں ہی غلط تھی شاید۔" ناہید نے اپنے کُرلاتے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔

"کتنا آسان ہوتا ہے یہ کہنا کہ سچ خود کو منوالیتا ہے اور کیا میری سچائی خود کو منوا سکتی ہے' کیا میرا شوہر میرے سچ پہ یقین کرلے گا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"کبھی نہیں کرے گا۔" اپنے شوہر کو جس حد تک وہ جان سکی تھی' سمجھ سکی تھی۔ اس کے دماغ نے یہی جواب دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے کئی روز تک ظہیر بالکل نارمل تھا اس نے دوبارہ ناہید سے اس موضوع پر نہ کوئی بات کی نہ سوال جواب' یہاں تک کہ اس کا والہانہ انداز دیکھ کر ناہید کو محسوس ہونے لگا کہ اس دن جو کچھ بھی ہوا وہ سب ایک خواب تھا' مگر خواب' تعبیر کی صورت میں مجسم ہو کر کبھی نہ کبھی انسان کے سامنے آہی جاتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ناہید کو اپنے موبائل پہ ایک انجان نمبر سے میسجز موصول ہورہے تھے۔ پیغامات کیا تھے' بس اس کی بے تحاشا تعریفیں اور دوستی کے تقاضے' ناہید نے کوئی خاص توجہ نہیں دی' گھر کے کام اور لکھنے کی مصروفیت ہی بہت تھی اور نہ بھی ہوتی تو اس طرح رانگ نمبرز پہ باتیں کرنا یا دوستیاں کرنا اس کا مزاج نہ تھا۔

دن بھر اسی انجان نمبر سے میسجز آتے اور وہ ڈیلیٹ کرکے اپنے کام میں مصروف ہوجاتی۔

اس بار گھر گئی ملنے کے لیے تو امی' ابو اور دادی سب نے بھی اس سے بہت اصرار کیا رکنے کے لیے۔

"دنیا جہان کی لڑکیاں میکے میں رکتی ہیں' تمہاری شادی انوکھی ہوئی ہے' بس ذرا دیر کو شکل دکھانے آجاتی ہے۔" دادی نے تقریباً ڈانٹ ہی دیا۔

"شادی تو انوکھی نہیں البتہ شوہر صاحب ضرور انوکھے ہیں۔" ناہید نے کھٹاک سے دادی کو جواب دیا۔

"چھوٹی تو ملک سے باہر ہے' یہی سوچ کر صبر کرلیتے ہیں' تمہارا گھر تو تھوڑے فاصلے پر ہے پھر بھی تمہیں ڈھنگ سے دیکھنے اور بات کرنے کو ترس گئے۔" امی نے بھی لگے ہاتھوں شکوہ کرڈالا۔

"گھڑی دو گھڑی کو غیروں کی طرح مہمان بن کر آتی ہو اور چلی جاتی ہو اب ایسا بھی کیا کہ کبھی کبھار رک بھی نہیں سکتیں۔"

"ظہیر سے پوچھ لیں' مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے رکنے میں۔" ناہید نے کندھے اچکائے۔

"اچھا۔ میں بات کرتی ہوں اس لڑکے سے' ارے کیا دنیا سے نرالی شادی ہوئی ہے جب بھی کہو اکیلے پن کا بہانہ کردیتا ہے کہ گھر کو کون دیکھے گا' کام کون کرے گا' ارے ہم نے بیوی بنا کر رخصت کیا ہے یا کوئی نوکرانی پلے باندھی ہے۔"

دادی آج بڑے جوش میں تھیں' لگ رہا تھا کہ ظہیر کی خبر لے ہی ڈالیں گی اور یہی ہوا۔ ظہیر سے انہوں نے جانے کیا اور کس طرح بات کی کہ وہ بادل نخواستہ آج کی رات ناہید کو گھر چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔

"ٹھیک ہے دادی جان! آپ اتنا اصرار کررہی ہیں تو آج ناہید رک جائے گی' کل لینے آؤں گا پھر۔" اس نے دادی سے کہا۔

"جگ جگ جیو بیٹا' خوش رہو' دودھو نہاؤ پوتوں پھلو۔" دادی نہال ہوگئیں۔

ناہید رک تو گئی' مگر رات گئے موبائل پر پیغامات کا جو تانتا بندھا اس کا لیٹنا حرام ہوگیا' ایک کے بعد ایک گھڑی گھڑی میسیج آرہے تھے۔

"آپ پلیز' مجھ سے بات کریں' میں آپ کو بلاوجہ تنگ نہیں کروں گا' میرا یقین کریں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں' میں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے۔"

"آج تو آپ اپنے گھر پر ہیں' شوہر کی پہرے داری نہیں ہے پھر آپ مجھے جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

"الو کا پٹھا!" ناہید نے بڑبڑا کر فون اٹھایا۔ سائلنٹ پر لگایا اور پھر پٹخ دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن شام میں حسبِ وعدہ ظہیر آگیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر دونوں روانہ ہوئے۔

"اب تو تمہارا شکوہ دور ہوگیا؟" ظہیر نے جتلاتے ہوئے سوال کیا۔

"کون سا شکوہ؟"

"یہی کہ میں تمہیں میکے میں رکنے نہیں دیتا۔"

"وہ تو اب بھی برقرار ہے۔ ایک سال میں ایک دن رات' اب اگلی بار رکنے کے لیے مزید ایک سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"عقل مند مرد اپنی بیویوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں رکھتے۔" ظہیر مسکرایا۔

"ایسی باتیں اور حرکتیں وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنی بیوی پر اعتبار نہ ہو۔" اس بار ناہید نے اسے جتلاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ آج کل انسان کو اپنے اوپر اعتبار نہیں ہے' دوسرے پر کیا کرے گا۔" ظہیر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ خود کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں؟" ناہید نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ دنیا کا ہر ایک انسان کسی نہ کسی حد تک ناقابلِ اعتبار ہے۔" ظہیر نے کاندھے اچکائے۔

"آپ کی سوچ کافی نیگیٹو ہے۔" ناہید نے برملا اظہار کیا۔

"تمہیں اب معلوم ہوا' تقریباً" ایک سال بعد۔"

ظہیر یوں مسکرایا جیسے اس کے تبصرے سے محظوظ ہوا ہو۔

"مجھے اندازہ ہوا تھا' مگر میں اس اندازے کو یقین میں نہیں بدلنا چاہتی تھی۔ اس لیے نظر انداز کرتی رہی۔ میرے لیے یہ کافی تکلیف دہ بات ہے۔"

"میں تمہاری توقعات کے برعکس نکلا' تمہیں مایوسی ہوئی' شادی کے بعد؟" ظہیر یکایک سنجیدہ ہوگیا۔

"میں نے ایسی کوئی توقعات وابستہ نہیں کی تھیں آپ سے جو مجھے مایوسی ہو۔ بس ایک بات سے تکلیف ضرور ہوئی۔" ناہید نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"کس بات سے؟"

"آپ شکی مزاج ہیں۔"

"شک ہی کرتا ہوں نا' کسی کو قتل تو نہیں کرتا۔" ظہیر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"بے جا شک کرنا' کسی کو قتل کرنے سے بھی زیادہ برا اور اذیت ناک ہے۔" ناہید کو جانے کیا کچھ یاد آگیا۔

"تم کہانیاں لکھتی ہو' اس لیے ڈائیلاگز اچھے بول لیتی ہو۔"

"یہ میرا ڈائیلاگ نہیں ہے۔" ناہید نے تیزی سے جواب دیا اور پھر فوراً ہی لب بھینچ لیے۔

"پھر؟ کس کا ڈائیلاگ ہے یہ؟" ظہیر کے چہرے پہ ناقابلِ فہم تاثرات آگئے۔

"کسی کا نہیں۔" ناہید نے بے زاری سے بولتے ہوئے منہ دوسری طرف کرلیا۔

"اس کا ہے' تمہاری ناکام محبت کا؟"

"کیا بکواس ہے۔" ناہید اک دم ہی برہم ہوگئی۔

"بکواس تو تم کرتی ہو' اپنی محبت کے ڈائیلاگز میرے سامنے دہراتی ہو' بڑی بہادر ہو ذرا ادھر منہ کرکے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔" ظہیر نے اس کا بازو دبوچا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"اف۔ ف۔ اللہ!" ناہید اس اچانک حرکت کے لیے تیار نہ تھی' کراہ اٹھی۔

"نظریں وہ لوگ چُراتے ہیں جن کے دل میں چور ہو' میرے دل میں کوئی چور نہیں ہمیں آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہوں' آپ ایک بیمار ذہنیت کے انسان ہیں اور بس۔" ناہید نے تیزی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اپنے بارے میں سچ برداشت کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ انسان فوراً" دوسرے کو الزام دے دیتا ہے۔" ظہیر حیرت انگیز طور پر پر سکون ہو گیا تھا۔ کچھ عجیب ہی رنگ تھے اس کی فطرت اور مزاج کے پل میں تولہ پل میں ماشہ۔

"اپنے بارے میں سچ برداشت کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کہ جھوٹ برداشت کرنا۔" ناہید کمرے سے سیدھی نکلتی چلی گئی اور ڈرائنگ روم میں آکر خاموشی سے لیٹ گئی۔ وہ اگر کچھ دیر اور اپنے کمرے میں رہتی تو ظہیر کے ساتھ لڑائی یقینی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ شوشے چھوڑتا رہتا اور ناہید منہ توڑ جواب دیے بغیر نہ رہتی۔ اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس وہ بڑی حد تک برداشت اور سمجھوتے کی راہ پر گامزن تھی' مگر کب تک' شوہر کے شک کی سولی پہ وہ زیادہ دیر نہیں لٹک سکتی تھی۔

"شک بہت خراب چیز ہے ناہید! کوئی صبر' برداشت والا انسان نہ ہو تو وہ ضد میں آکر وہ سب کرنے پر تل جاتا ہے۔ جس کا اس پر شک کیا جا رہا ہو حالانکہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہو وہ ایسا کام کرے گا' پتا ہے کیا' تمہاری بہن کی طنزیہ باتیں اور طعنے کبھی اتنا مشتعل کرتے ہیں مجھے کہ میرا دل چاہتا ہے میں تم سے نہ سہی کسی اور سے ہی' مگر ایک عدد افیئر لڑانا شروع کر دوں۔"

ایک روز طارق نے ناہید کے آگے اپنا دکھڑا روتے ہوئے کہا تھا اور وہ ہنس پڑی تھی۔

"اسے اعتبار دو کہ تم صرف اس کے ہو' وہ خود بخود تمہاری ہو جائے گی' سارے طنز اور طعنے شک و شبہات ختم ہو جائیں گے۔" ناہید نے بہت آرام سے مسئلے کا حل بتایا تھا۔

"ساحل پہ کھڑے ہو کر موجوں کا نظارہ بہت اچھا لگتا ہے' موجوں کے تھپیڑے کھانے والوں کا کیا احساس' خدانخواستہ تم اگر میری جگہ ہوتیں تو ایسی بات کرنے والے کا منہ توڑ دیتیں۔" طارق کا جواب اسے آج بھی یاد تھا۔

"کتنا صحیح جانتا تھا وہ مجھ کو۔" ناہید نے سوچا۔ اس کا سچ مچ یہی دل تو چاہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح ظہیر بالکل نارمل تھا' معمول کے مطابق اٹھا' تیار ہوا' ناشتا کر کے باہر نکل گیا۔ وہاں سے آیا تو حسب معمول ناہید سے اسی طرح باتیں کیں جس طرح کرتا تھا۔

ناہید عجیب اُدھیڑبن میں تھی۔

کیا زندگی اس طرح گزرے گی' اسی آنکھ مچولی کے ساتھ۔

پیسے کی کمی کے ساتھ گزارا ہو سکتا ہے۔

محبت کی کمی کے ساتھ نباہ ہو سکتا ہے۔

کوئی خامی' کوئی کمی نظر انداز ہو سکتی ہے۔

مگر "شک" کے ساتھ گزارا کرنا' نباہ کرنا' ہر پل ہر آن کی اذیت ہے' کوئی کب تک برداشت کرے اور وہ بھی ناہید جیسی برداشت سے کوسوں دور' پھر بھی اپنی طبیعت اور مزاج کے برخلاف' زندگی کے اس امتحان سے نبرد آزما تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کا سیل فون خراب ہو گیا تھا۔ ظہیر سے کہا تھا' نیا موبائل خریدنے کے لیے' ہوں ہاں کرتا رہا' کبھی پیسوں کی کمی' کبھی وقت کی قلت' کبھی حالات خراب' ایک مہینہ گزر گیا تھا' ناہید جھنجلا اٹھی۔

"میں خود بازار سے لے آؤں گی۔"

"جانتی ہو حالات کیسے ہیں پھر بھی "کیلے" گھومنے کا شوق چرایا ہوا ہے۔" ظہیر نے "کیلے" پر زور دیا۔

"گھومنے نہیں جا رہی' ضرورت ہے۔ اس لیے جا رہی ہوں۔" ناہید نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"ضرورت تو میرے موبائل سے بھی پوری ہو سکتی ہے' تمہارا اپنا میرا کون سا لمبا چوڑا بزنس چل رہا ہے' ہم اسے استعمال کر لیا کرو۔"

"دن میں تو آپ آفس میں ہوتے ہیں' میرا کوئی فون آئے یا مجھے کرنا ہو تو کیا کروں؟"

"میرے آفس سے آنے کے بعد کر لیا کرو' ایسے کون سے ضروری فون آنے جانے ہیں جو میری غیر موجودگی میں ہی ہوں گے۔" ظہیر کمینے پن سے مسکرایا اور ناہید کا خون کھول اٹھا۔

"یہ چھچھوری باتیں کہنا ضروری ہیں؟"

"پتا نہیں کیوں تمہیں میری سچی باتیں کبھی بُری لگتی ہیں' کبھی چھچھوری۔" ظہیر کا انداز استہزائیہ تھا۔

"اگر آپ کو مجھ پر اور میرے کردار پر اتنا ہی شک ہے تو اپنے ساتھ رکھا ہوا کیوں ہے' کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔" ناہید ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہو گئی وہ ضبط کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔

"اچھا! کہاں جاؤ گی آزاد ہو کر؟ اُس کے پاس؟" اس نے ناہید کو پیچھے سے پکارا۔

"اف ف۔۔۔!" ناہید اتنی کمزور نہیں تھی پھر بھی رنج اور بے بسی کے مارے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

وقت ظالم نہیں ہوتا نا مہربان نہیں ہوتا یہ تو لوگ ہوتے ہیں جو گزرتے وقت کو تکلیف دہ بنا دیتے ہیں' ناہید بھی ذہنی اذیت جھیل رہی تھی۔ دن اور رات گزر رہے تھے' مگر ایک ایک پل تکلیف سے بھرپور۔

"کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیسے سروائیو کروں؟" یہ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی تھیں۔ ظہیر کوئی الف سے لے کر ے تک بالکل ہی برا نہیں تھا' بس ہر ہفتے دو ہفتے بعد کسی نہ کسی بات پر بحث کر میں تیلی ڈال کر چھوڑ دیتا اور ناہید کے سلگنے کا تماشا دیکھتا۔

اس کی ذہنی حالت اور ٹینشن اب اس کی تحریروں سے بھی چھلکنے لگی تھی' ایک تو قلم اٹھانے کو ہی اب دل نہیں چاہتا تھا' پھر بھی خود کو مصروف رکھنے اور خیالات کے جنگل میں بھٹکنے سے بچانے کی خاطر وہ لکھ بھی لیتی تو پڑھنے والوں کی شکایات کا تانتا بندھ جاتا۔

"ناہید نورالٰہی کی کہانیاں کچھ عجیب سی ہوتی جا رہی ہیں' بے حد اداس' قنوطی۔ وہ ناہید کہاں ہے جو خوابوں اور زندگی سے بھرپور کہانیاں لکھتی تھی؟ خوابوں اور زندگی سے بھرپور کہانیاں؟ ناہید پڑھ کر بے بسی سے مسکرا دی۔

وہ خواب مر گئے' وہ زندگی خواب ہوئی' زندگی ہمیشہ پریوں کی کہانی تھوڑی ہوتی ہے' اس میں درد کا رنگ بھی ہوتا ہے' لکھنے والا' اس درد کو کہاں لے جائے اپنے دل میں تھوڑی رکھتا ہے' قلم کے ذریعے کاغذ پہ منتقل کر دیتا ہے' وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ چائے لے کر کمرے میں آ رہی تھی' جب ظہیر کی آواز بلکہ لفظوں نے اس نے بڑھتے قدم روک دیے۔ وہ اپنے دوست سے بات کر رہا تھا۔

"عورت سے زیادہ ناقابل اعتبار مخلوق اس دنیا میں کوئی نہیں ہے' میرا یقین نہیں بلکہ ایمان ہے اس بات پر' وہ تیرا ہی قول ہے نا کہ عورت یا تو بری ہوتی ہے یا پھر بہت زیادہ بری' ہم تو آپ کی فلاسفی کے معتقد ہیں پیرو مرشد۔"

ظہیر نے ایک قہقہہ لگایا' پھر دوسری طرف سے بات سن کر دوبارہ بولنے لگا۔

"بالکل ٹھیک' عورت کو گھرداری میں' بچوں میں اتنا مصروف اور مگن رکھو کہ ادھر ادھر کے فالتو خیالات سے دماغ خراب نہ ہو۔ نہ کسی کو گھر بلاؤ' نہ کسی کے گھر جاؤ' یہ جو دوستیاں اور تعلقات ہیں نا یہ بھی عورت کو خراب کرتے ہیں' ویسے میں اپنی بیوی کو رانگ کالز کر کے آزما چکا ہوں' کوئی رسپانس نہیں دیا' خیر کیا پتا میرے ہی ڈر کے مارے بات نہ کی ہو۔"

ناہید چپ چاپ کھڑی اس کے اقوال زریں سن رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہی گرم گرم چائے کا کپ اس کے سر پر انڈیل دے تاکہ عورت کے

بارے میں اس کی رائے اور پختہ ہو جائے۔

"کاش میں ایسا کر سکتی۔" ظہیر کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ کبھی کبھار گھر جاتی تو دادی اور امی ابو اس کا چہرہ کھوجتے رہتے۔

"تو خوش تو ہے نا؟" دادی اسے بغور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھتیں۔

"ہاں۔"

"خرچے پانی کے معاملے میں تنگ تو نہیں کرتا شوہر؟"

"نہیں۔"

"میکے کیوں نہیں رکنے دیتا۔" وہ پے در پے سوالات کیے جاتیں۔

"گھر میں تالا پڑا ہوا ہو تو چوروں ڈاکوؤں کے آنے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔" وہ ظہیر کا رٹا رٹایا بیان انہیں بھی سنا دیتی۔

"اللہ جانے کس انوکھے مزاج کا ہے تیرا میاں۔" دادی پھر بھی مطمئن نہیں ہوتیں۔

✲ ✲ ✲

اس دن اس کی عزیز دوست افشین کا فون آ گیا۔ ظہیر نے ہمیشہ کی طرح اسپیکر آن کر کے اسے موبائل دیا۔

"کہاں ہو؟ کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے تمہاری خاطر۔ اتنی مشکل سے رابطہ ہوا ہے کیا بتاؤں۔" افشین اپنے مخصوص، بے تکلفانہ انداز میں شروع ہو گئی۔

"نہیں ہوں اسی دنیا میں۔" ناہید مضمحل انداز میں مسکرا دی۔ (اف وہ دوست، دوستیاں، باتیں، سب کچھ صدیوں پرانی کہانیاں لگتا تھا۔)

"اس دنیا میں تو خیر نہیں، تم کسی اور ہی دنیا میں ہو۔ اپنی سوشل لائف تو بالکل ہی ختم کر ڈالی تم نے۔ نہ کسی سے رابطہ، نہ فون، نہ میل ملاقات، کیا بات ہے۔ میاں تو کھڑوس نہیں ہے تمہارا؟

"بس کچھ گھر کی مصروفیت ہے۔ کچھ لکھنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ یوں ہی صبح سے شام، شام سے رات ہو رہی ہے۔" ناہید نے اس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے مختصراً کہا۔

"گھر کی مصروفیت؟" وہ چیخی۔ "تمہاری کون سی لمبی چوڑی سسرال ہے۔ ایک تمہارا میاں، ایک تم، دو افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے اور لکھنے کی بات تو تم چھوڑ ہی دو۔ سچ اتنا بکواس لکھ رہی ہو نا، پڑھ کر ہی غصہ آنے لگتا ہے۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔" افشین بغیر کسی لحاظ، مروت کے بول رہی تھی۔

"پھر کیا کروں؟ لکھنا چھوڑ دوں؟"

"نہیں خیر... یہ مشورہ تو میں نہیں دوں گی، مگر تم یہ بتاؤ، وہ پہلے والی ناہید نور الٰہی کہاں ہے؟"

"کھو گئی کہیں۔" ناہید دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔

"اچھا بات سنو۔ میں اس وقت نکل رہی ہوں شاپنگ کے لیے۔ امی اور باجی تیار کھڑی ہیں، میرا ویٹ کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا، چلتے چلتے تمہیں ٹرائی کر لوں، اتفاق سے نمبر آج مل ہی گیا۔ پھر فون کروں گی، ٹھیک ہے۔" افشین نے تیز تیز بولتے ہوئے خدا حافظ کہا اور سیل آف کر دیا۔

"خدا حافظ۔" ناہید نے دھیرے سے کہا

"بڑی خطرناک دوستیں ہیں تمہاری۔" ظہیر نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ناہید کو کچھ اسی قسم کے تبصرے کی توقع تھی۔ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"اتنی خوف ناک باتیں؟ کوئی اپنے گھر میں خوش ہے۔ انہیں کیا ضرورت ہے آوارہ گردی پہ اکسانے کی۔ ایسی عورتیں دوسروں کو ورغلا کر ان کا گھر برباد کرتی ہیں۔" ظہیر شروع ہو گیا۔

"گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت آوارہ نہیں ہوتی ظہیر صاحب، آوارگی انسان کے اپنے دماغ اور کردار میں ہوتی ہے۔ جس کے لیے باہر نکلنا ضروری نہیں۔ گھر بیٹھے لوگ بھی آوارہ ہو سکتے ہیں۔" ناہید تلخی سے

کہتی باہر نکل گئی۔

زندگی جیسے ایک جال بن گئی تھی۔ وہ جتنے ہاتھ پاؤں مارتی' اسی میں الجھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس بار وہ گھر گئی تو باتوں کے دوران اچانک امی کو کچھ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر فریج کے پاس گئیں۔ واپس آئیں تو ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔

"معیزن کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ تمہاری مٹھائی بھجوائی تھی بھائی صاحب نے۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ ورنہ میں اور تمہارے ابو آج آتے تمہاری طرف۔"

"آپ فون کردیتیں امی! ہم گھر پر رک جاتے۔ اسی بہانے آپ لوگ ہمارے گھر آجاتے۔ مہینوں ہوجاتے ہیں گھر سے کسی کو آئے ہوئے۔" ناہید نے شکوہ کیا۔

"ایک ہی بات ہے بیٹا۔ تم آگئیں ہمارے دل کو تسلی ہوگئی۔" امی نے نرمی سے کہا۔ وہ پھر اٹھ کر کمرے میں گئیں۔

"ثمینہ کا خط آیا ہے تمہارے لیے۔" انہوں نے ایک لفافہ ناہید کی طرف بڑھایا۔

"ثمینہ کا خط میرے لیے؟" ناہید بے یقینی سے ماں کو دیکھتے ہوئے اتنی حیران ہوئی کہ ہاتھ بڑھا کر لفافہ لینا بھی بھول گئی۔

"حیرت ہے انٹرنیٹ اور موبائل کے دور میں خطوط؟ ایسی کیا خاص بات ہے جو موبائل پہ نہیں ہوسکتی۔ نیٹ پہ نہیں ہوسکتی؟" ظہیر نے مداخلت کرتے ہوئے امی کے ہاتھ سے لفافہ اچک لیا۔

ظہیر نے خط پڑھ لیا تھا۔ اسے پڑھنا ہی تھا۔ ناہید کے ہاتھ میں لفافہ دیتے وقت اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ظاہری تاثرات سے پاک' دل میں کیا تھا' خدا جانے' مگر اس وقت تو ناہید اس کے چہرے سے کچھ بھی کھوجنے میں ناکام رہی۔ ناہید کو لفافہ دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناہید کچھ دیر ہاتھ میں پکڑے لفافے کو دیکھتی رہی۔

وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ نہ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے' نہ دل کی دھڑکن غیر معمولی تھی۔ بس اندر ـــــ دور تک حیرانی ہی حیرانی تھی اور اسی حیرانی کے عالم میں اس نے لفافہ کھول کر خط نکال لیا۔

ناہید ـــــ

بغیر کسی القاب و آداب کے مخاطب کررہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے' تمہیں برا نہیں لگے گا۔ ہمارے درمیان بہنوں والے مثالی تعلقات کبھی نہیں رہے۔ بس رسمی سے' مگر کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ میری شادی ہونے تک' پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ میں آج بھی سوچنے بیٹھتی ہوں تو وہ سب اب سمجھ میں آتا ہے' جو اس وقت نہیں آیا۔ میری باتیں شاید بے ربط سی ہورہی ہیں۔ ٹھہرو' میں ابتدا سے سب کچھ بیان کرتی ہوں۔

اس وقت ـــ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی' میں الھڑ تھی' نوعمر تھی' ہر لڑکی کی طرح میری آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے۔ دل میں کچھ ارمان' سپنے' خواہشیں' کسی کو چاہنے کی' خود کو چاہے جانے کی' وہ معصوم سی آرزوئیں جو کچی عمروں کا خاصا ہیں۔ پھر طارق کا رشتہ آیا۔ ایک ہی گھر میں رہنے والا فرسٹ کزن' پتا نہیں کیوں مجھے یوں لگا جیسے میں اس کی مرضی اور خواہش بن کر اس کی زندگی میں شامل ہونے جارہی ہوں یا پھر دل میں چھپی خواہشوں اور خوابوں نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے پر آمادہ کیا۔

شادی ہوگئی' طارق کا رویہ نارمل تھا' نہ بہت زیادہ اچھا' نہ برا' بلکہ سچ کہوں تو کسی حد تک اچھا ہی تھا' مگر میں جو والہانہ پن اور گرمجوشی کی توقع کیے بیٹھی تھی' وہ پوری نہیں ہوئی' میں متمنی تھی' اس کے لبوں سے اظہار محبت سننے کی ـــ اقرار سننے کی' مجھے پانے کو کتنا بے تاب تھا' کتنا بے چین تھا مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کو' میرے سارے ارمان' سارے خواب' اک اک کرکے مرجھاتے جارہے تھے۔ میں طارق کی طرف سے مایوسی کا شکار تھی۔

حالانکہ اب سوچتی ہوں تو بے وقوفی لگتی ہے کہ وہ شوہر کی حیثیت سے اپنے تمام فرائض بخوبی ادا کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی معاملے میں مجھ پر جبر نہیں کیا یا زیادتی نہیں کی تھی۔ مجھے کبھی ذہنی یا جسمانی تکلیف نہیں دی۔ مگر پھر بھی مجھے دل ہی دل میں اس سے شکایات ہوچلی تھیں۔

اب خیال آتا ہے کہ اگر اس نے مجھ سے اظہار الفت نہیں کیا تھا تو نفرت یا بے زاری کا رویہ بھی نہیں اپنایا تھا۔ اپنے طور پر وہ خوش کرنے کے جتن ہی کرتا تھا۔ مگر اف یہ خواب' یہ کم بخت دل اور یہ بے لگام خواہشیں' یہی تو ہیں جو ہمیں اور ہماری زندگی کو تباہی کے دہانے پہ لاکھڑا کرتی ہیں۔ مجھے جب یہ احساس ہونے لگا کہ میں فقط اس کی بیوی ہوں' محبوبہ نہیں تو میرے خواب ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگے اور ان کے ساتھ ساتھ میں بھی ٹوٹ رہی تھی۔ چاہے جانے کی خواہش سانپ کی طرح پھن پھیلائے میرے اندر مجھے ڈس رہی تھی۔ میں نیلوں نیل ہورہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے سب کچھ برا لگنے لگا تھا۔ وہ گھر' وہ لوگ' اپنا شوہر' میں بات بے بات ہر ایک سے الجھ پڑتی۔ حتیٰ کہ طارق سے بھی۔ جان بوجھ کے اس کو چڑانے کے لیے' غصہ دلانے کے لیے اس کی مرضی کے خلاف کام کرتی' وہ مجھ پہ مشتعل ہوتا' کبھی سمجھاتا' مگر دھیرے دھیرے ہمارے درمیان کشیدگی بڑھ رہی تھی۔

پھر ایک روز شدید غصے کے عالم میں (تمہیں معلوم ہے نا' وہ غصے کا کتنا تیز ہے۔ تمہاری اور میری طرح۔) اس نے انکشاف کیا کہ وہ تم میں دلچسپی رکھتا تھا اور تمہارے انکار کے بعد میں اس کے گھر اور زندگی میں شامل ہوئی۔ اس کی مرضی سے نہیں' بلکہ اس کے والدین کی مرضی سے' مجھے اعتراف ہے کہ اپنے والدین کی مرضی اور فیصلے کو اس نے بڑی سچائی اور خلوص کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی' مگر اس وقت میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ اس روح فرسا انکشاف نے جیسے میرے بدن سے میری روح کھینچ لی تھی۔ میری جان نکال لی تھی۔ مجھ پہ ایسی بجلی گری کہ میں جل کر خاک ہوگئی۔ میں نے اس پر اپنا غم و غصہ نکالنا شروع کردیا۔ شک کرنا شروع کردیا۔

میرا غم و غصہ اس بات پر تھا کہ اس کی طلب' اس کی محبت میں نہیں تھی۔ اب وہ تم ہو یا کوئی اور' مگر بہرحال وہ میں نہیں تھی۔ میں ہر وقت بس یہی سوچتی رہتی اور میرے اندر ایک آتش فشاں ابلتا رہتا اور جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو اپنے ساتھ کتنی اور کیسی تباہی لے کر آتا ہے۔ راہ میں آنے والی ہر شے جل کر خاک ہوجاتی ہے' فنا ہوجاتی ہے۔

یہ سب اس لیے ہوا کہ میں نے اپنی محبت' اپنا اعتبار اسے دینے کی کوشش نہیں کی۔ صرف چاہے جانے کی تمنا کی۔ وہ بھی جلد بازی کے ساتھ میری تمنا' عجلت پسندی اور غصیل طبیعت نے میرے اپنے ساتھ ساتھ تم دونوں کو بہت زیادہ ہرٹ کیا۔ بہت تکلیف اور اذیت میں مبتلا کیا۔

ہم نہ کبھی ٹھیک طرح سے خود کو سمجھ پاتے ہیں' نہ زندگی اور اس کے معاملات کو' آج میرا شوہر' اپنی اولاد کی شکل میں ان کے وجود میں اپنی پہلی بیوی کو کھوجتا ہے۔

میں نے طارق کے معاملے میں معمولی سی شراکت بھی برداشت نہیں کی اور آج مجھے مکمل طور پر تقسیم شدہ شوہر ملا ہے' جس نے اپنے آپ کو دو حصوں میں بانٹا ہوا ہے۔ ایک میں اس کا ماضی' محبت اور یادیں ہیں اور دوسرے میں حال' میں اور اس کے بچے اس میں بھی اس کی محبت اور توجہ کا بڑا حصہ بچوں کے لیے ہے۔ میں تو کہیں کونے کھدرے میں' آخری نمبر پر ہوں۔ میری حاکمانہ اور خود پسند طبیعت' یہ سب کس طرح برداشت کررہی ہے۔ شاید ہی کوئی سمجھ سکے۔ طارق کے کام مجھے مشکل لگتے تھے۔ اب شوہر کے ساتھ بچوں کی ذمہ داری بھی سنبھال رہی ہوں۔

جب کوئی جائے پناہ نہ ہو' سارے راستے مسدود ہوجائیں تو ہم سب اسی ایک در کی طرف بھاگتے ہیں۔ جو ہمیشہ ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا ہوتا ہے۔ ہم اسے ہی پکارتے ہیں جو ہماری پکار فوراً سنتا ہے اور جواب دیتا ہے۔ میں نے بھی عاجزی سے اس کے

سامنے سر جھکا دیا۔ حالات بدلیں نہ بدلیں، سکون تو مل ہی جاتا ہے۔

ایک مرضی اور چاہت اللہ کی تھی جو اس نے میرے لیے پسند کی، میں نے اسے قبول نہ کیا اور اپنی مرضی پہ اصرار کیا۔ اللہ نے اپنے قانون کے مطابق وہ بھی نہ دیا جو میری چاہت تھی اور وہ بھی چھین لیا جو اس کی مرضی تھی۔ اب جو بھی کچھ ہے۔ وہ جانے میری سزا ہے یا ایک اور آزمائش۔

میں نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو میرے دل میں تھا۔ میرا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو گیا اور بس آخری اور سب سے اہم بات میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ ہر بات کے لیے۔ اپنے ہر ہر لفظ کے لیے اور ہر حرکت کے لیے، اگر تم مجھے معاف کر دو گی تو میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

ثمینہ۔۔۔۔

ناہید کو علم بھی نہیں ہوا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

ہم بظاہر کتنے ہی خود غرض، بے نیاز اور کٹھور بن جائیں۔ پھر بھی دل کے اندر کہیں ایک نرم سا گوشہ، احساسات سے بھرا موجود ہوتا ہے۔ ذرا سا مہمیز ہوا اور چھلک پڑا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے طارق کو انکار کیوں کیا تھا؟" رات کو سونے سے پہلے ظہیر نے ون ملین ڈالر کا کوئسچن کیا تھا۔ ثمینہ کے پورے خط سے اس نے فقط یہی ایک بات اخذ کی تھی۔ اپنی مرضی کی۔ اپنے مطلب کی۔

ناہید چپ چاپ چند لمحے اس کی شکل دیکھتی رہی۔ پھر بے حد سکون سے گویا ہوئی۔

"کیونکہ مجھے اس جہنم میں آنا تھا۔"

ظہیر نے اس وقت تو کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ دو دن بعد وہ ضرور بولا تھا اور چھپر پھاڑ کر بولا تھا۔

"تم مجھ سے طلاق لے کر اپنے کزن سے ہی شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

ناہید کو اس سے ہر قسم کی بات کی توقع تھی۔ اسے کوئی بھی بات سن کر اب کوئی خاص حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ مگر اس وقت اسے اک دم سے دھچکا ضرور لگا تھا۔

"کوئی بھی شخص اتنا کیسے گر سکتا ہے؟"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" وہ یقیناً ناہید کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔ کسی کے مشوروں سے نہیں۔" ناہید کا لہجہ مضبوط تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔" ناہید کا پر سکون انداز اسے طیش دلا گیا۔

"مجھے بھی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔" ناہید نے دو بدو جواب دیا۔

ظہیر کا رویہ دن بدن جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ پابندیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اسے میکے لے جانا مزید کم کر دیا تھا۔ لے کر جاتا بھی تو وہاں یوں چوکنا ہو کر بیٹھا رہتا جیسے ابھی کسی کونے سے طارق نکل کر آ جائے گا۔

ناہید چپ چاپ یہ تماشا یوں دیکھ رہی تھی جیسے یہ سب اس کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہو۔ شکر ہے کہ وہ جسمانی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ مگر ذہنی اذیت، یہ تو جسمانی تکلیف سے بھی بڑھ کر تھی، مگر یہ خام خیالی بھی کچھ دنوں تک ہی تھی۔ رفتہ رفتہ ظہیر کا ہاتھ اٹھنے لگا۔ پتا نہیں کتنی فرسٹریشن تھی اس کے اندر، کتنی گھٹن تھی، وہ مار پیٹ کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ حیرت انگیز طور پر ناہید سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان بھی اور ہتھیار بنے ہاتھ پاؤں بھی۔ کہاں تو وہ ناہید جو کسی کا کہا ایک لفظ برداشت نہیں کرتی تھی اور اب اتنی بے حس ہو گئی تھی شوہر کی بد زبانی بھی برداشت کرتی تھی اور مار پیٹ بھی۔ دوسرے کو کیا، خود اس کو بھی یقین نہیں آتا تھا۔

☼ ☼ ☼
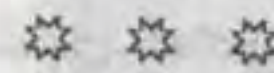
اس دن امی اور ابو دونوں سے ملنے آئے تھے۔

"کئی روز ہو گئے تم دونوں آئے ہی نہیں، ہم نے سوچا ہم ہی مل آئیں۔" ابو بہت دوستانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

ناہید چائے اور لوازمات لے آئی تھی۔ ظہیر بھی وہیں بیٹھا تھا۔ مگر اس کا انداز بہت اجنبیت اور بے گانگی لیے ہوئے تھا۔ ناہید اسے اور اس کے روکھے رویے کو نظر انداز کر کے ماں، باپ کے ساتھ گفتگو میں لگی رہی۔

"بھائی صاحب اور بھابھی آئے تھے، بہت پوچھ رہے تھے تمہیں۔" ابو نے اسے بتایا۔ "کسی روز تھوڑا وقت نکال کر ان کے گھر ہو آنا، شادی کے بعد سے تو وہ ایک بار بھی نہیں ملے تم سے۔"

"طارق بھی آیا تھا۔ وہ بھی پوچھ رہا تھا تمہیں۔" امی نے بڑی سادگی سے لقمہ دیا۔

"پیچھا نہیں چھوڑا اس نے اب تک؟" ظہیر بڑبڑایا۔

ناہید نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی۔ والدین کے سامنے ابھی تک اس نے اپنی ازدواجی زندگی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ سب اچھا ہے، اس کے گھر والوں کو ہمیشہ یہی بتایا تھا۔

"یہ چائے بنائی ہے؟ بالکل بکواس۔" ظہیر نے ایک دم ہی چائے کا بھرا کپ ناہید پہ کھینچ کے مارا تھا۔ گرم گرم چائے اس کے ہاتھ کو جلاتی کپڑوں کو داغ دار کرتی نیچے گری۔ کپ کرچی کرچی ہو گیا اور اس کے ساتھ اور بہت کچھ بھی، اس کا بھرم، اعتبار اور وہ رشتہ بھی جو اس کے اور ظہیر کے درمیان تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟" ابو اور امی دونوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے داماد کو دیکھا۔

"وہی کر رہا ہوں جو پہلے سے کرنا چاہیے تھا۔ شرم نہیں آئی تم دونوں کو، غیر لڑکوں کے پیغامات لا کر اپنی بیٹی کو دے رہے ہو۔ کچھ تو لحاظ کر لیتے کہ اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ ایک تو اپنی آوارہ بیٹی میرے سر منڈھ دی اوپر سے۔"

"تڑاخ۔" ناہید نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ مارا تھا۔ اس کی آتش فشاں اگلتی زبان چپ ہو گئی۔ رخسار پہ ہاتھ رکھے وہ ناقابل یقین نظروں سے ناہید کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ضبط کی ساری حدیں اب ختم ہو چکی تھیں۔

"بس خاموش، اب ایک لفظ اور منہ سے نکالا تو یہ دونوں کپ تمہارے منہ پہ پھینک دوں گی۔ جتنا تمہیں کہنا تھا کہہ لیا، جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اب شرافت سے چھوڑنا ہو تو چھوڑ دینا، ورنہ میں عدالت سے رجوع کروں گی۔" ناہید نے انتہائی سرد لہجے میں بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

ظہیر بت بنا کھڑا تھا۔ اسے ناہید کے ایسے رد عمل کی توقع ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا، ناہید اپنے اصل رنگ میں آج آئی تھی۔

اپنے گھر سے ماں، باپ کے ساتھ وہ خالی ہاتھ واپس آئی تھی۔ فقط تن پہ پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا، اس گھر کا ایک تنکا اس کے ہمراہ نہ تھا۔

ماں، باپ تو اس سے سارا معاملہ جان کر شاک میں تھے۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب؟"

"میں نے اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ آپ لوگوں کو تکلیف ہو گی۔" ناہید نے آہستہ سے جواب دیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ تھکن ذہنی بھی تھی، جسمانی بھی، کتنے عرصے بعد وہ آج سکون کی نیند سوئے گی۔

☼ ☼ ☼

ظہیر سے خلع کے لیے اس نے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ وہ طلاق دینے پر آمادہ نہ تھا۔ کچھ ہفتے عدالت کے چکر لگانے کے بعد اسے خلع مل گئی تھی۔ دادی اٹھتے بیٹھتے ہائے ہائے کرتیں۔ ماں باپ پہلے بھی کم گو تھے۔ اب اور بھی خاموش ہو گئے۔ بڑی آپا آتیں تو اسی کی فکر میں ہلکان رہتیں۔ چھوٹے بھائی اتنے چھوٹے بھی نہیں رہے تھے۔ کچھ بڑے اور سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ناہید سب سے بے نیاز کاغذ، قلم سے

دوبارہ رشتہ استوار کیے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

مہرین کی شادی تھی۔ وہ تیار ہو کر چلی گئی' رشتے دار خواتین کی اکثریت اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

"تم یہاں؟ تم کیسے آگئیں؟"

"سب لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر حیران کیوں ہو رہے ہیں۔" ناہید نے کچھ برا مان کر بڑی خالہ سے کہہ ہی دیا۔

"چھوڑو لوگوں کو اور ان کی باتوں کو اور تم کب سے لوگوں کی پرواہ کرنے لگیں۔" انہوں نے مسکرا کر اپنی بھانجی کو دیکھا۔

"پروا تو خیر نہیں کر رہی' مگر لوگوں کی حیرت دیکھ کر مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔" ناہید نے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

شاید لوگ اس سے توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اب گوشہ نشین ہو جائے گی۔ مگر وہ لوگوں کی توقعات کو ایک طرف کر کے تقریب میں دندناتی پھر رہی تھی۔

"کیسی ہو ناہید؟" ساحر اچانک ہی سامنے آئے تھے۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے بروقت خود کو سنبھالا۔ گھبرانے کی حالانکہ کوئی بات نہیں تھی۔ مگر یوں ایک دم سامنے رکنے اور مخاطب کرنے سے وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے' بالکل ٹھیک؟" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بات کر رہے تھے اور پہلے سے زیادہ ڈیشنگ اور اسمارٹ لگ رہے تھے۔

"آپ کی بیوی سے ملی تھی میں ابھی۔ بہت پیاری ہے۔ بہت اچھا کپل ہے آپ دونوں کا۔"

"اچھا..." وہ مسکرا دیے۔ "ثمانیہ' عادت' مزاج کی بھی بہت اچھی ہے۔ وہ تمہیں بھی منٹوں میں اپنی دوست بنا لے گی۔" ساحر سادگی سے اسے بتا رہے تھے۔ وہ ہنس پڑی۔

"مجھے خوشی ہو گی ایک اچھی دوست پا کر' اچھے دوست کا ویسے بھی کال ہے دنیا میں۔"

"میں تمہارے کسی معاملے کو کریدنا یا پوچھنا نہیں چاہتا' بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے جو بھی فیصلہ کیا اس پر مطمئن تو ہو نا؟" ساحر نے اچانک ہی اس سے سوال کیا تھا۔

"ہاں' میں مطمئن بھی ہوں اور خوش بھی۔" ناہید نے بے حد پرسکون انداز میں کہتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

"گڈ' ویری گڈ' آئی وش کہ تم آئندہ بھی خوش رہو۔" ساحر نے سر خم کرتے ہوئے اس سے اجازت چاہی۔ تو ناہید اپنی میز پر آن بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

دادی کی نمازیں اور وظیفے طویل سے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی دعاؤں کا بیشتر حصہ نواسیوں اور پوتیوں کی شادی کے لیے وقف تھا۔

"ہائے ہائے یہ پہاڑ سی زندگی ایسے کیسے کٹے گی۔" وہ ناہید کو دیکھ دیکھ کر ہولتی رہتیں۔

"کٹ جائے گی دادی' آپ کی بھی تو کٹ ہی گئی' کیا عمر تھی آپ کی جب بیوہ ہوئیں؟"

"دو کم چالیس۔" دادی کو ازبر تھا۔ "ارے مگر ہمارا تو بڑھاپا تھا۔" انہوں نے پوتی کو دیکھا۔

"بڑھاپا؟ دادی آج کل اس عمر میں شادیاں ہوتی ہیں۔" ناہید نے جتایا۔

"وہ شادیاں کہاں ہوتی ہیں میری بچی' سمجھوتے ہوتے ہیں۔" دادی نے ایک گہری سانس لی۔ "اللہ جانے تم دونوں بہنیں کیسا نصیب لے کر آئیں۔" دادی نے پھر ایک آہ بھری۔

"انسان زندگی کے بہت سے معاملات میں ناکام ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی کی شادی ناکام ہو جائے' ہو جائے تو دنیا اس پر اتنا ترس کیوں کھاتی ہے؟" ناہید نے سوال اٹھایا۔

"اس لیے کہ پہلی شادی' شادی ہوتی ہے' اس کے بعد عموماً" سمجھوتا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرد کے بغیر اکیلی عورت تنکو بن جاتی ہے۔ یہ مرد خواہ باپ ہو' بھائی ہو' بیٹا یا شوہر' اس کا ساتھ' اس کی موجودگی عورت کے لیے ضروری ہے۔ تب ہی وہ معتبر مانی جاتی ہے۔" ناہید کے سوال کا جواب اس کی دوست افشین نے دیا تھا۔

"تمہیں بھی جلد یا بدیر اس سہارے کو تھامنا پڑے گا۔ باپ سدا سر پر نہیں رہے گا۔ بھائی ہمیشہ ہمارے نہیں ہوتے۔" اس نے ناہید کو سمجھایا۔

"میرے لیے ایک تجربہ ہی اتنا کافی ہو گیا کہ دوسرے کے بارے میں سوچنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔"

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" افشین ناصح تھی۔

"مگر ان کا منبع تو ایک ہتھیلی ہوتی ہے نا۔"

"اب منطق جھاڑنے بیٹھو تو انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔"

"تم کچھ زیادہ ہی نصیحتیں نہیں کرنے لگی ہو؟" ناہید نے اسے گھورا۔

"تمہیں اس وقت ان کی ہی ضرورت ہے۔"

"کاش کہ کوئی چارہ ساز ہوتا' کوئی غم گسار ہوتا۔" ناہید نے ایک آہ بھری۔

"آ ہی جائے گا زندگی میں' تمہارا چارہ ساز اور تمہارا غم گسار۔" افشین مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے حیرت ہوتی ہے سوچ کر بلکہ غش آنے لگتا ہے کہ تو اس شخص سے چپ چاپ مار کھا لیتی تھی؟"

"چپ چاپ کیوں' آخری دن ایک ہی بار تھپڑ مارا تھا' سارے جواب اسی ایک تھپڑ میں تھے۔"

"آخری دن مارا نا' پہلی بار ہی مارنا چاہیے تھا اور پھر کسی کو بتایا بھی نہیں۔"

"کس کو بتاتی؟ لے دے کے والدین ہی رہ جاتے

ہیں۔ اپنا بوجھ انہیں منتقل کردیتی؟ وہ پہلے ہی چوٹ کھائے ہوئے تھے۔"

"تو اتنی اچھی اور سمجھ دار کب سے ہو گئی؟"

"جب سے بُرے لوگوں سے واسطہ پڑا۔"

"کہانیاں لکھنے والے کبھی خود بھی کہانی بن جاتے ہیں' ہے نا؟"

"ہاں' ایسی کہانی جس میں نہ ہیرو ہوتا ہے' نہ ہیروئن' بس ولن ہی ولن ہوتا ہے شروع سے آخر تک۔"

"ارے واہ' یہ کیا بات ہوئی' شروع سے آخر تک ولن ہی ولن' ہر کہانی میں ہیرو ہیروئن ہوتے ہیں' تب ہی تو ولن بھی ہوتا ہے' ورنہ ولن کی کیا اہمیت؟"

"میری کہانی میں بھلا ہیرو ہیروئن کہاں ہیں؟"

"بعض کہانیوں میں ولن پہلے آجاتا ہے۔ ہیرو' ہیروئن کا انکشاف بعد میں ہوتا ہے۔ اب تمہاری زندگی کی کہانی سے ولن کا کردار ختم' ہیرو کا کردار شروع۔"

"تم ہیرو' یعنی کہ میں ہیروئن؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہیروئن تو ہمیشہ بہت اچھی اور ڈھیروں ڈھیر خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہے۔ میری جیسی بہت سی خامیوں کا مجموعہ' ہیروئن نہیں ہو سکتی؟" اس نے بہت شدومد سے نفی میں سرہلایا۔

"یہ تو تمہارا قلم بیان کرتا ہے نا۔ ڈھیروں ڈھیر خوبیوں کا مجموعہ' ہیروئن ہوتی ہے۔ مگر کاتب تقدیر کا قلم انوکھا ہے۔ کس کے لیے کیا رقم کیا گیا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ اب ہیروئن کی تعریف لغت میں کچھ بھی ہو۔ کہانیوں میں ہیروئن وہی ہوتی ہے جسے ہیرو اور اس کی محبت ملے' ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔۔۔"

"تو بس' تجھے ہیرو بھی مل رہا ہے اور اس کی محبت بھی' پھر تو ہیروئن ہوئی یا نہیں؟"

"تمہاری منطق کے حساب سے تو ہوئی۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن چھوڑ' بات دراصل یہ ہے کہ محبت کا معاملہ کچھ عجیب و غریب ہے۔ کہیں پری پیکر لوگ محبت کو ترستے رہ جاتے ہیں اور یہ گوہر نایاب کسی عام سے فرد کی جھولی میں جا گرتا ہے۔ اور کبھی دنیا بھر کی دولت دے کر بھی انسان محبت حاصل نہیں کر پاتا اور کبھی کچے گھروں میں رہنے والوں کے بھاگ جاگ اٹھتے ہیں' کیا ضروری ہے کہ خوب صورت' بااخلاق' تمیزدار اور سلیقہ مند لڑکی ہی ہیروئن بنے۔ کبھی تیری جیسی بدتمیز' جھگڑالو اور لاپروا لڑکیوں کے نصیب میں بھی محبت لکھ دی جاتی ہے۔ نصیب خوب صورت ہو تو سب کچھ خوب صورت ہے' کیا سمجھی؟"

"میری تعریف کچھ زیادہ ہی نہیں کردی؟" دانت پیس کر کہا۔

"میں تو تیری تعریف میں پورے دفتر لکھ دوں۔ مگر مقتول ہونے سے ڈرتا ہوں۔ (قہقہہ)

"ہمارے درمیان جھگڑے بہت ہوں گے۔" پیشن گوئی کی گئی۔

"بہت نہیں ہوں گے۔ کم ہوں گے۔" اس نے ناہید کو جھٹلایا۔ "دراصل ہم نے اپنی زندگیوں سے کچھ اور سیکھا ہو یا نہیں ایک سبق ضرور سیکھا ہے۔ برداشت اور تحمل کا۔ تھوڑی برداشت تو کرے گی' تھوڑی میں کرلوں گا' گاڑی چل ہی جائے گی' پھر محبت کی زنجیر ہے نا' دونوں کو باندھ کر رکھے گی۔"

"ایک بات سن لو' مجھے تم سے لگاؤ یا انسیت' کچھ بھی کہہ لو وہ ہے۔ لیکن وہ شے جس کا نام محبت ہے' ابھی میرے دل میں نہیں آئی۔" ناہید نے صاف صاف جتایا۔

"آجائے گی' جب ہیرو کو محبت ہو جاتی ہے تو ہیروئن کو بھی لازمی ہو ہی جاتی ہے۔ کسی کو کہانی کے شروع میں ہوتی ہے' کسی کو درمیان میں اور کسی کو اینڈ میں' مگر ہوتی ضرور ہے۔" بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا۔

"زندگی ڈائجسٹ کی کہانی نہیں ہوتی۔"

"مگر ڈائجسٹ میں جو کہانی ہوتی ہے' وہ تو زندگی کی ہوتی ہے نا؟" برجستہ جواب ملا۔

"ان کہانیوں میں فینٹیسی بھی ہوتی ہے۔ زندگی میں نہیں ہوتی۔"

"تو؟ زندگی ہمیشہ ہی تو ڈل اور بورنگ نہیں ہوتی۔ تھوڑی بہت فینٹیسی ہوتی ہے اس میں۔ دیکھنے والی نظر چاہیے' اب تو خود سوچ' اتنے کرائسس سے گزر کر تجھے خوابوں کا شہزادہ مل ہی گیا۔ تیری زندگی میں فینٹیسی ہوئی نا؟"

"خوابوں کا شہزادہ؟ تمہیں اپنے بارے میں اتنی خوش فہمی کیوں ہے؟"

"محترمہ! اگر میں خود کو کسی لقب سے نوازتا ہوں تو دراصل آپ کو بھی یہ اعزاز دے رہا ہوتا ہوں' آپ میری مستقبل کی مسز ہیں۔ اگر میں ہیرو تو آپ ہیروئن' میں شہزادہ تو آپ شہزادی' میں راجہ تو رانی' کیا سمجھیں؟"

"یہی سمجھی کہ بحث کر کرکے دوسرے کو قائل کرنے کی تمہاری عادت اب تک برقرار ہے۔"

"تمہیں چاہنے اور محبت کرنے کی میری عادت بھی برقرار ہے اب تک۔" گمبھیر لہجے میں بتایا گیا۔

"کچھ عادتیں اچھی ہوتی ہیں۔ انہیں بدلنا نہیں چاہیے۔" ناہید نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور طارق بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

تایا نے طارق کی مرضی اور خواہش سے ایک بار پھر دست سوال دراز کیا تھا۔ لوگوں کو ایک بار پھر چٹخارے دار موضوع مل گیا تھا۔ ثمینہ کی طلاق اور اس کی خلع پہ انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ ناہید کو کسی کے کچھ کہنے کی پروا نہیں تھی۔ اسے سوچ سمجھ کر اپنے حساب سے فیصلہ کرنا تھا۔ مگر دادی کے تبصرے نے اسے کچھ دیر کو ٹھٹکنے اور سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

"دونوں بہنیں ایک دوسرے سے کٹ جائیں گی۔ بس کا رشتہ بالکل ختم ہو جائے گا۔" دادی نے کہا۔

"ہم دونوں بہنوں کے درمیان پہلے ہی کون سا گہرا اور مضبوط رشتہ قائم ہے۔ بس ایک رسمی سا تعلق ہے۔ پھر وہ ملک سے باہر ہے۔ اس کے شوہر کا فی الحال کوئی ارادہ بھی نہیں پاکستان واپسی کا۔ وہ آئندہ' پندرہ' بیس' پچیس سالوں بعد مستقل آئے تو آئے۔ فی الحال تو دو' تین سال بعد چکر لگاتے ہیں۔ پھر کیسا رشتہ اور کہاں کا تعلق۔" ناہید حقیقت پسند بن کر سوچ رہی تھی۔

اس نے پہلی بار طارق کو انکار اس لیے کیا تھا کہ اس کے خیال میں چونکہ دونوں ہی مزاج کے تیز تھے۔ اس لیے نباہ ہونا مشکل تھا۔ وہ شادی کے ناکام ہونے سے ڈرتی تھی۔ مگر ہوا کیا؟ جس چیز سے وہ خوف کھاتی تھی' وہی چیز اس کے سامنے آئی۔ حالانکہ اس نے آخری حدوں تک اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی تھی۔ اب معاملات اور حالات بہت بدل گئے تھے۔ کسی حد تک تبدیلی ان دونوں میں بھی آئی تھی۔ طارق نے بھی یہی کہا تھا۔

"دیکھ لڑکی! جھگڑے تو ہوں گے۔ بس کبھی تو برداشت سے کام لے لینا۔ کبھی میں خاموش ہو جاؤں گا۔ اسی طرح گزارا ہوگا۔ وگرنہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی متحمل نہیں ہے۔ شادیوں کی ہیٹ ٹرک کرنے کا۔"

ناہید نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد فیصلہ کر ہی لیا۔

بہن ہزاروں میل دور تھی۔ اس سے تعلق اور رشتہ نبھانے کا سوچتی تو قریب موجود ماں' باپ کو اپنے مستقبل کے لیے کب تک پریشان اور فکر مند رکھتی۔ اس نے اپنا سوچا' اپنے والدین کا سوچا اور ہاں کردی۔

"دنیا والے جو کہیں سو کہیں' کچھ عرصے بعد سب چپ ہو جائیں گے۔ اگر ہم دنیا کی پروا کرتے رہیں تو شاید مسکرانا اور جینا بھی چھوڑ دیں۔" اس نے سوچا اور ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔

"ویسے میری توقع کے برعکس تم بڑی آسانی سے مان گئیں۔" طارق نے کہا۔

"ہاں تھوڑی سی خود غرض اور بے حس جو ٹھہری۔" ناہید مسکرادی۔

☼

لوگ اسے پھر پھر۔۔۔ پھرا کہتے تھے اس کے منہ پر کہتے تھے۔۔۔ ڈٹ کر کہتے تھے۔۔۔ ڈرتے ورتے نہیں تھے۔ اس سے کیسا ڈرنا۔۔۔ جو جھلی ہو۔۔۔ پگلی' دیوانی سی ہو اس سے کیسی لجا۔۔۔ تو لوگ اسے پھر پھر کہتے تھے۔۔۔ پورے سر تال کے ساتھ کس کر' جم کر' آواز لگا کر۔۔۔ ردھم سے۔۔۔ ترنم سے۔

نام اس کا فرزانہ تھا لیکن چونکہ عام رواج ہے اور خاصا مشہور اور دل پسند رواج ہے تو اس کے تحت وہ فجی بھی ہو گئی۔۔۔ تو یہ فجی تو ہوا عرفی اور معاشرتی نام۔۔۔ چلیے رواجی بگاڑ ہی سہی۔۔۔ اور پھر پھر۔ پھرا۔۔۔ یہ اس کی خصوصیت' خاصیت۔۔۔ مزاجی تہمت۔۔۔ ذاتی فارمولا۔۔۔ اس کی شخصیت کا حاصل جمع۔۔۔

ہنسی کی پہلی قسط ایسے نکلتی جیسے لاہور بھر کے کبوتر "پھر" سے ایک ساتھ اڑے ہوں۔ دوسری قسط ایسے نکلتی (جو پہلی کے ہی عین پیچھے پیچھے چلی آتی) جیسے ان کبوتروں پر بجلی آن گری ہو۔۔۔ اور اللہ ضرور ہی معاف کرے تیسری اور لگاتار قسط ایسے نکلتی جیسے لاہور بھر کی بلیوں اور بلوں نے ان کبوتروں پر حملہ کر دیا ہو۔

بچے بچے کو معلوم تھا فجی کیسے ہنستی ہے۔۔۔ وہ ہاتھ جوڑ کہتے۔

"باجی جی! بس کر دیں پھر پھرانا۔" اتنا سنتے ہی وہ اور لوٹ پوٹ ہو جاتی ایویں سی بات تھی لیکن کافی سنجیدہ بھی تھی کہ مائیں اسے تاکید کرتیں۔

"اے فجی! منا سو رہا ہے۔ ذرا قابو میں رہیو۔" مطلب ذرا دھیان سے۔ ہنسنا نہ شروع کرنا۔

اماں کو تو یاد کرنے سے بھی یاد نہ آتا کہ یہ بیماری اسے کب سے لگی خوش رہتی تھی نا۔ اور خدا ہی جانے وہ کب سے اتنی خوش رہنے لگی تھی' وہ اتنی اپ بنڈ (اوٹ پٹانگ) کب سے ہوئی کہ کئی سو لوگوں میں بھی اماں اسے پیٹ ڈالتی تھیں۔

"چپ کر جا پگلی۔۔۔ دیکھ' سارا زمانہ ہنس رہا ہے۔"

دس بارہ فواروں کا ایک اور بڑا فوارہ نکلتا۔

اماں دوپٹے کا گولہ بنا کر اس کے منہ میں ڈھونس دیتیں۔ ذرا نہ رحم کھاتیں۔

"کوئی جن ون تو نہیں۔۔۔؟" اماں کی دور کی چچی نے پوچھا۔

"جن ہی ہوتا۔ جان تو چھوٹتی۔۔۔"

"دم درود کرواؤ۔۔۔"

"بہتیرے کروائے۔۔۔"

"کملی جھلی لگتی ہے۔ لگتا ہے خاندان سے اس کا رشتہ نہیں لینا تمہیں۔"

"اپنے باپ سے بھی مار کھائی ہے۔۔۔ پر منحوس ماری کی ہنسی ہی قابو میں نہیں۔۔۔ جی جی مذاق اڑا جاتا ہے اس کا۔۔۔"

اس مکالمے کی نوبت ملتان والی پھوپھو کے بڑے بیٹے کی ڈھولک میں آئی تھی۔۔۔ گھر بھرا پڑا تھا۔۔۔ کھلی وسیع چھت پر ڈھولک بجائی جا رہی تھی۔ لڑکیاں خوب چہک رہی تھیں۔۔۔ اور اپنی یہ فجی بھی۔۔۔

ایک لڑکی نے چٹکلہ چھوڑا۔

"بڑے بڑے بیاہے گئے۔ پیارے اللہ جی ہمارے والے کدھر کو گئے؟" قہقہوں کے مرغولے آسمان

تک اڑے۔۔۔ پھر پس بھی گئے اور اپنی یہ فجی۔۔۔ ڈھولکی بجانے والی پڑوس کی لڑکی نے ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ لیا۔۔۔ چھلے والی نے گردن موڑ کر دولہا کی بہن کو تاڑا۔۔۔ آس پڑوس والیوں نے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ پھوپھی خود فجی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اماں نے بڑھ کر گھسیٹ کر اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر پیچھے چلی گئیں پھر ڈھولکی ذرا دیر سے بجی۔ اس دوران بڑی سرگوشیاں اٹھیں۔

"کون ہے یہ رضیہ تمہاری؟"

"لاہور والے چھوٹے ماموں کی بیٹی۔" رضیہ چڑ گئی۔

"پاگل ہے کیا!"

"ہم کیا جانیں۔۔۔ پہلے تو نہ تھی۔"

"توبہ ایسے ہنسنا۔۔۔؟"

"ہماری جانے بلا۔۔۔"

گانے، سہرے گائے جانے لگے ۔۔۔ اماں ساری شادی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ سب طرح طرح کے سوال کرنے لگے، لاہور والوں کی تو خیر تھی۔ سب ہی اس کی عادت سے واقف تھے بس یہ دور دراز کے رشتے دار ہی حیران ہوتے پھر وہ بھی عادی ہو جاتے۔

"جنگلی ہنگلی، پھر پھراتی فجی کے۔"

اماں کہتیں "یہ بیماری ہوتی ہے ۔۔۔ ہنسنا تو ہنستے ہی رہنا ۔۔۔ رونا تو روتے ہی رہنا ۔۔۔ جیسے ہچکی کہ جان لے کر ہی ٹلے۔"

"یہ ہنسی بھی جان لے گی کیا۔" چھوٹی عذرا ہنس کر بولی۔

"توبہ ہے ۔۔۔ اب تو اللہ نے نسلی بچے بنانے ہی چھوڑ دیے شاید۔" اماں موت کے تذکرے پر ہول گئیں۔ ان کی پیاری بچی فجی ہنستی ہے ہنستی رہے۔ جان کیوں جائے اس کی۔

"خود ہی تو کہا ہے اماں!"

"ارے جا ۔۔۔ میں نے کچھ کہا۔ تو کچھ سمجھی۔"

"باجی زندہ تو رہے گی نا ۔۔۔؟" عذرا اب ٹلنے والی نہیں تھی۔

"اس کا تو پکا ہے۔ تیرے لیے دعا کرنی پڑے گی۔" اماں نے جوتی اٹھالی۔

فجی کی سہیلی کی شادی ہوئی تو وہ روئی وہ روئی جیسے سہیلی بیاہی نہ گئی ہو جل کر مر گئی ہو خدانخواستہ ۔۔۔ اس کے گھر والوں نے بھی کہا۔

"اے فجی! اتنے بین نہ ڈال۔"

اور فجی "وہ چلی گئی ۔۔۔ مجھے چھوڑ گئی ۔۔۔ وہ لے گئے" کہہ کہہ کر روتی رہی ۔۔۔ یہی دونوں سہیلیاں چھت پر چڑھ کر ایسے ایسے جناتی قہقہے پھر پھراتیں کہ در و دیوار تھرا اٹھتے۔

خیر ولیمہ ہوا اور دلہن سہیلی گھر آگئی اور پھر قہقہوں کی وہ قسم نکلی کہ بڑے بوڑھے کہہ اٹھے "یہ کیا بے غیرتی ہے چپ کرواؤ انہیں۔"

انہیں چپ کروانے کی ناکام کوشش کی گئی۔

یہ وہی سہیلی تھی جس میں فجی کی پور پور جان تھی ۔۔۔ تو عمری میں کہا کرتی تھیں، ایک ہی گھر بیاہ کر جائیں گی۔ ذرا سالوں بعد پھر یہ بات کسی نے ان کے منہ سے نہ سنی۔

سنت نگر کے پرانے نقوش کے گھر تھے۔ بہت جگہوں سے ساتھ ملے ہوئے تھے، چھتیں تو مانو ایک ہی تھیں۔ کبھی بالکنی پھلانگ کر، کبھی کھڑکی سے پانچ فٹ لکڑی کا زینہ اتر کر اور کبھی چھت سے پھلانگ کر وہاں جایا کرتی اور خوب ہی جایا کرتی ۔۔۔ ایسے کہ چائے چولہے پر رکھی ہے اور ابال آنے تک وہاں ۔۔۔ پریشر ککر لگا ہے، سیٹی بولنے تک وہاں ناشتا کیا۔ چکر لگا آئے۔ شام کا تفصیلی اعلانیہ پھیرا الگ سے ۔۔۔ درمیان کے بہانی حادثاتی پھیرے الگ سے۔

اماں پہلے تو بہت بڑبڑائیں پھر جب اسی سے اس نے سینا پرونا سیکھ لیا۔ ہزار طرح کی کڑھائیاں ۔۔۔ طرح طرح کے ڈیزائن کے کپڑے اور چھوٹے بچوں کے تو ہزاروں طرح کے کہ خالہ ماموں کے سارے بچوں نے اسی کے ہاتھوں کے سلے کپڑے پہنے۔ لہنگے، شرارے، فراکیں اس نے سب بچیوں کو خوب سی سی کر دیں تو پھر یہ اعتراض اٹھ گیا کہ وہ ہر وقت دھنی کے یہاں گھسی رہتی ہے۔ دھنی نے ہی اسے حلیم بنانا سکھائی ۔۔۔ ہریرہ تک فجی نے اس سے سیکھ لیا ۔۔۔ تو ایسی استاد سہیلی پر اتنی جانثاری اماں کو خاص نہ کھلی جہاں اس نے اسے سارے گن سکھائے وہاں پھر پھراتا فجی سے سیکھ لیا ۔۔۔ خیر اس فن میں دونوں ہی استاد نکلیں۔ مجال تھا کہ کوئی ایک بھی مات کھا کر پیچھے رہ جاتا فجی ادھر اپنے خاندان میں مشہور تھی تو دھنی ادھر اپنے خاندان میں۔

دھنی بیاہی گئی پھر بھی فجی وہیں پائی جاتی، چند ماہ گزرے سلیم نے کھڑکی بند کروا دی ۔۔۔ بالکنی کی طرف یہ بڑے بڑے لکڑی کے تختے لگوا دیے ۔۔۔ چھت کی دیواروں پر تین تین روے چنائی کروائی اور کانچ لگوا دیا ۔۔۔ فجی خوب ہنسی۔

"یہ دیواریں ۔۔۔ یہ بندشیں ۔۔۔ یہ دیواریں۔"

...ہنستی جاتی۔

اماں نے دھمو کے جڑے "اب کیوں ہنس رہی ہے۔"

"بھیا نے بالکنی بند کروا دی ۔۔۔ کھڑکی بھی ۔۔۔ اور وہ چھت ۔۔۔"

"ہاں تیرے کرتوت دیکھ کر کیا سب ۔۔۔"

"تو اماں ۔۔۔! اتنی سی بات نہیں سمجھتیں ۔۔۔ یہ اتنی سی چنائی کس کام کی ۔۔۔؟" وہ پھر دل لگا کر ہنسی۔

"اوندھی کھوپڑی! ہم ذات ہیں وہ ۔۔۔ یاری دوستی کی حد تک تو ٹھیک تھا ۔۔۔ باقی کا خناس نکال دے ۔۔۔ یہ دمدمے (مصنوعی قلعے) بنانے چھوڑ دے۔"

"لو نکال دیا خناس ۔۔۔ خناس ہی تو نہیں گھسنے دیا دماغ میں ۔۔۔ دمدمے بنائیں ہمارے دشمن ۔۔۔ ذات صرف خدا کی ۔۔۔ انسان کی ذات اس کے اعمال ۔۔۔"

منہ سے پھر پھر کبوتر اڑے۔

"کتنی سمجھ دار ہوں میں اماں ۔۔۔ اتنی جلدی اتنی اچھی باتیں سیکھ گئی ۔۔۔ دیر نہ کرو ۔۔۔ سیکھ لو مجھ سے۔" وہ پھر پھرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

بڑے دن گزرے، ڈھنگ کا رشتہ ہاتھ آیا نہ کھڑکی چھت کی چنائی میں دراڑ آئی۔

"یہ تیرے انار کلی کے چکر بہت بڑھ گئے ہیں؟" اماں اس پر نظریں گاڑے پوچھ رہی تھیں "لے کر بھی کچھ نہیں آتی۔"

"کوئی کپڑا جوتا پسند آئے تو لاؤں ۔۔۔ دو بار تو خالہ کے لیے گئی۔ ان کی منی کے جوتے کا ماپ ٹھیک نہیں تھا۔"

"منا منی کے جوتے بھی تو ہی لائی ہے اور ماپ بھی تو ہی غلط لاتی ہے ۔۔۔ فجی میرے قہر سے بچی رہ ۔۔۔ ایک بار گردن جو پکڑی تو انار کلی والے ہی تماشا دیکھیں گے۔"

"جو تماشا لگے تو ایسے ہی سہی ۔۔۔" وہ ہنسی۔

"تیری اس ہنسی کا گلا تو میں دباؤں گی کسی دن۔

دھیان سے رہا کر ۔۔۔"

"ماں ہو کر یہ کرو گی؟" پھر پھراتے کبوتر زمین پر آ کر گرنے لگے اس کے انداز سے ایک ایسی ہوک نکلی کہ اماں چپ اسے دیکھے گئیں۔

سنت نگر، کرشن نگر سے انار کلی جانا کون سا پہاڑ کھودنا تھا، یہاں ارادہ کیا وہاں پہنچ گئے تو یہ ارادے روز کیے جاتے، دن میں کئی کئی بار کیے جاتے۔ قرب و جوار ہی میں سب آباد تھے ۔۔۔ چھوٹے بڑے پانچ ماموں ۔۔۔ تین خالائیں، اماں کی خالہ زاد بہنیں ۔۔۔ ان بہنوں کے آگے پیچھے کے رشتے دار ۔۔۔ ادھر ادھر کے چچا، چچی ۔۔۔ رشتے کے نانا، نانی، دادا، دادی ۔۔۔ بہت رشتے دار تھے کہ صبح ملنے نکلو تو اگلی صبح واپس آؤ ۔۔۔ کچھ ایک ہی گلی میں رہتے۔ کچھ ایک ہی بلڈنگ میں اوپر نیچے ۔۔۔ کچھ آگے پیچھے کی چھوٹی بڑی سڑک پر۔

جب تک دھنی بیاہی نہ گئی۔ وہ مشکل سے ان سب رشتے داروں کو اپنی شکل دکھاتی، دھنی گئی تو وہ ان سب کو سلام کرنے نکلتی اور ایسے نکلتی کہ اماں کو جا کر ڈھونڈ کر اسے لانا پڑتا۔

وہ کسی ایک کے گھر جاتی۔ اسے سلام کرتی، ذرا ادھر ادھر جھانکتی۔ اگلے گھر نکل جاتی۔ تین چار جگہ حاضری لگوا کر بھاگم بھاگ بڑی سڑک تک آتی۔ بس اسٹاپ سے بس میں بیٹھتی اور آٹھ دس منٹ میں انار کلی پہنچ جاتی ۔۔۔ دو سو ۔۔۔ ڈھائی سو جوتوں کی سیل والے کے پاس پہنچتی ۔۔۔ اور آدھے گھنٹے میں واپس آجاتی۔

اماں کو شک ہوتا ۔۔۔ روز ہی ہوتا، کسی خالہ، مامی، نانی سے پوچھ لیتیں۔

"ہاں آئی تھی ۔۔۔" خالہ کہتی۔

"ارے ہاں نا! چائے پی کر گئی۔ برتن بھی دھو گئی پھر نوشاد کے گھر چلی گئی۔" مامی بولتی۔

"کیا ہوا آپا؟" کوئی ایک پوچھ لیتا۔

"ہونا کیا ہے۔ سلیم غصہ کرتا ہے۔"

"کیوں کرتا ہے غصہ ۔۔۔ رشتے داروں کے گھر نہ آئے گی تو کہاں جائے گی پھر بیاہی جائے گی کہاں آنے

دے گا کوئی۔۔۔ سلیم کو نت نئی سوجھتی ہے۔۔۔ اپنے گریبان میں نہیں جھانکتا۔ اس چنڈال کو چمن سے آئس کریم کھلا رہا تھا۔ کالے منہ والی۔۔۔ ہونہہ!"

"میری تو سنتا ہی نہیں۔" اماں کو نئی فکر لگی۔

خیر ایک دن اماں نے اسے انار کلی جالیا۔۔۔ سیل میں رکھی جوتیاں پہن پہن کر دیکھ رہی تھی اور ایسے ہنس رہی تھی کہ آس پاس والے تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اماں نے کمر پر زور سے چٹکی بھری۔

"یہ تو خالہ شکیلہ کے گھر کھڑی ہے نا۔۔۔؟"

اس نے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ضد تو وہ کر رہی ہیں اگر وہ اسے سیدھے راستے سے چلنا کریں تو وہ الٹے راستے کی طرف نہ جائے۔

"سلیم تجھے جان سے مار دے گا۔۔۔ اس دو پیسے والے کے ساتھ تجھے کبھی نہیں بیاہے گا۔۔۔ کباڑیے ہیں وہ۔ بھول گئی۔۔۔ تیرا باپ کتنا ہنستا ہے ان پر۔"

اس نے وہ قہقہہ بلند کیا کہ اماں شرمندہ سی ہو گئیں اس کے قہقہے میں بڑی وضاحتیں تھیں۔ بڑے زہریلے طنز تھے۔

"اماں! مجھے کہتی ہو۔ میرے کرتوت برے ہیں۔۔۔ بھلے مانس انسانوں کو گالی دے رہی ہو۔۔۔ ان کی حلال کی کمائی پر لعنت بھیج رہی ہو۔۔۔ ان کے پیشے سے انہیں اوقات دے رہی ہو۔۔۔ اماں! اب تو مجھے ہنس لینے دو۔"

اماں نے اسے در فٹے منہ کیا۔ اس کا گھر سے جانا بند کیا۔ جانا ہوتا تو اپنے ساتھ لے کر جاتیں۔

☼ ☼ ☼

چھوٹی عید، بڑی عید، شب برأت، عید میلاد النبی، محرم میں سب بڑے گھر (بڑے ماموں) کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔ یہ بڑا تین منزلہ گھر تھا۔ ایسے موقعوں پر گھر بھر جاتا، اماں فجی کو ڈھونڈتی رہتیں۔ پہلا چوبارہ، دوسرا، تیسرا۔۔۔ کہاں گئی۔۔۔ فجی۔۔۔

"یہیں کہیں ہو گی۔" کوئی کہہ دیتا۔

وہ کہیں سے نکلتی نظر آجاتی۔۔۔ ہونٹوں میں ہنسی دبائی ہوتی۔

"کہاں تھی تو؟"

"یہیں تو تھی۔"

"یہیں کہاں۔۔۔؟"

"وہ ادھر چوبارے میں۔۔۔"

"اِدھر اُدھر کے سب ہی چوبارے دیکھ آئی تھی میں۔۔۔"

"وہیں تو تھی اماں۔۔۔" وہ کہہ کر کھسک جاتی۔

پیاز، لہسن، ادرک، نمک، مرچ۔۔۔ آلو، دال، چاول۔۔۔ کچھ بھی کم پڑ جاتا۔ وہ فوراً حاضر ہوتی۔

"لاؤ میں لے آؤں جھٹ بازار سے۔"

"تندور سے روٹی لگوا لاؤں۔ نان لے آؤں۔ ابھی لائی دہی۔۔۔ بس آدھ سیر۔"

"آپ کے تو دوپٹے بھی پیکو نہیں ہوئے۔۔۔ نہیں نہیں۔ دس منٹ کا تو کام ہے۔۔۔ یہ تو ہے بازار۔ ابھی کروا لاتی ہوں۔۔۔"

"خالہ زہرا! پنوں کے بغیر جوڑا کہاں بنے گا۔ ساڑھی پر تو جوڑا ہی بنایئے۔۔۔ میں ابھی پنوں کا پتا لے کر آئی۔۔۔"

ادرک لہسن، نمک مرچ، آلو پیاز۔۔۔ دہی، گوشت انار کلی سے آرہے ہوتے۔۔۔ روٹی نان بھی وہیں سے۔۔۔ دس روپے کا پنوں کا پتا بھی تیس روپے کا کرا لیا کر وہیں سے لایا جاتا۔۔۔

وہ بھاگ کر جاتی، بھانپ کر آتی۔

شادی بیاہ۔۔۔ سالگرہ، بسم اللہ، آمین، میلاد، دسواں، چالیسواں۔۔۔ مرگ، جنم۔۔۔ جہاں کوئی کمی بیشی ہوتی فجی بھاگ بھاگ انار کلی سے پورا کرتی۔۔۔ منت نگر، کرشن نگر کے بازار چھوڑ کر وہ انار کلی جاتی۔ منگوانے والے کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ یہ دو کلو بیسن صرف انار کلی سے آیا ہے۔۔۔ اور یہ چھٹانک بھر بادام اور سویوں کا ایک چھوٹا پیکٹ بھی۔۔۔ حد تو یہ کہ دو جوڑوں کے ساتھ کی دو نلکیاں بھی وہیں سے آتیں۔

اللہ اللہ فجی۔۔۔

☼ ☼ ☼

ایک دن یہ حقیقت کھلی جب دس روپے کا لاسٹک خریدنے گئی اور واپسی پر دھرلی گئی۔

دور کی نوے سالہ پرنانی نے کہا "بیاہ دو اسی سے۔ قصہ ختم کرو۔"

اماں نے دور کی پرنانی کو گھورا "تمہاری طرح ابھی کھیائے نہیں۔"

"اور کسے کہتے ہیں سٹھیانا۔۔۔ مسلمان بچہ ہے۔۔۔ کماتا کھاتا ہے بس بیاہ دو۔"

"ہونہہ بیاہ دو۔۔۔ چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔"

"اے بی بی۔۔۔ پریت نہ جانے جات کجات، اتنا سمجھ لو پیاسی کو پانی رہنے دو۔ آگ نہ بناؤ۔۔۔ یا وہ جل جائے گی یا تمہیں جلا مارے گی۔۔۔ میرے سر کی چاندی دیکھو اور میری زبان سے نکلا سمجھو۔۔۔"

"اپنی چاندی اور زبان اپنے ہی پاس رکھو نانی۔"

"اے بجی! بات سن۔۔۔ سیدھی ہو جا ورنہ اپنی جان سے جائے گی۔"

اماں آتے ہی اسے سنانے لگیں۔ وہ طوطوں کے پنجرے کے پاس کھڑی سیٹی مار مار کر انہیں بہلا رہی تھی۔

"خاندان میں رہنا ہے مجھے۔۔۔ کباڑیوں کے لیے کوئی راضی نہیں ہو گا۔"

"میں راضی ہوں۔" کہہ کر اس نے پھر سیٹی ماری طوطے بھی جواب میں مارنے لگے۔

"اپنے باپ بھائی کے ہاتھوں سے بچ بھی گئی تو تیرے چاچے مامے نہیں چھوڑیں گے تجھے۔۔۔ غیر ذات کے لیے مان بھی جائیں تو ان کی اوقات دیکھی ہے تو نے۔۔۔ ان کے گھروں کے تیلیے چاٹتے چاٹتے تو تو ان کے پیندوں سے ہی جا لگی۔۔۔ کباڑیوں نے کباڑ خانے کی چیزیں دے دے کر تجھے خرید لیا۔۔۔ وہ ہاتھ پیر ٹوٹی پلاسٹک کی گڑیاں اور پیتل تانبے کے توے چمٹے۔ اس بیوپار کو اس گھر میں نہ گھسا۔۔۔ کوئی ایک آدھ اور مرے گا۔"

وہ سیٹی بجانا بھول گئی۔

دھنی کے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی تھی۔ رات کو اس کا ابا پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلے صحن میں الٹ دیتا اور پھر سب مل کر پیتل، لوہا، پلاسٹک، گتا، کاغذ الگ الگ کرتے۔۔۔ وہ کتنی ہی چیزیں اٹھا لیتی۔۔۔ کبھی پلاسٹک کی ٹوٹی پھوٹی ٹرین۔۔۔ کبھی زنگ لگے چھری کانٹے۔۔۔ کبھی گڈا گڑیا۔۔۔ کبھی تصویروں سے اٹی کتابیں۔ چاچے نے کبھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ چیز سو کی ہوتی یا روپے کی، وہ پلٹ کر نہیں دیکھتا تھا کہ اس نے کیا اٹھا لیا۔۔۔ ہاں ان ہی چیزوں نے اسے خرید لیا۔۔۔ اماں کیسے سمجھتیں کہ کس نے کیسے اسے خرید لیا بھلا یہ انسان اتنی جلدی بکنے پر تھوڑی آتا ہے۔ کوئی چمکار رہا ہوتا ہے تو ہی بکتا ہے نا۔۔۔ ورنہ تو تخت و تاج پر بھی نہیں بکتا۔۔۔

"ڈولی نہ کہار، بی بی بیٹھی ہیں تیار۔۔۔" اماں بڑبڑائیں۔ منڈیر پر دو کوے بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے۔

ان پر نظر پڑتے ہی وہ ایسے ہنسی کہ ذرا دیر بعد اماں کو ڈر ہوا کہ وہ صدمے سے پاگل ہو گئی ہے۔

"ہائے میری بچی۔۔۔ مر جائیں منحوس مارے ساتھ والے۔۔۔"

"اماں! ان کوؤں کو دیکھ۔۔۔ دیکھ دیکھ ذرا۔۔۔ ارے دونوں ہی کالے ہیں۔۔۔ نجانے کیا ذات ہے ان کی۔۔۔ پر دونوں ہی کائیں کائیں کرتے ہیں۔۔۔ سن سن اماں! ایک سی کائیں کائیں کر رہے ہیں۔۔۔ میں بہری ہوں شاید۔۔۔ اندھی بھی ہوئی لگتی ہوں۔۔۔ یہ دو تو ایک ہی نہیں۔۔۔

ساجن ہم تو ایک ہیں دیکھت کے ہیں دو
من کو من سے تول لے دو من کدی نہ ہو"

اماں نے ایک زوردار چانٹا جڑا "جانور ہیں وہ۔۔۔"

"جانور ہی بھلے ہیں اماں پھر۔۔۔" ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔۔۔ "جانور ہی بھلے پھر۔۔۔ جو یہ جانوروں کے رتبے پر نہ ہوئے تو جنت صرف ان ہی پر واجب ہوتی۔"

"کافر ہوئی ہے کم بخت۔۔۔! جانوروں کو جنت میں لیے جا رہی ہے۔"

"انسانوں نے تو ارادے ہی بدل لیے ہیں نا۔۔۔ کوئی تو جائے پھر۔۔۔ کوئی تو جائے۔"

سلیم کہیں آگے پیچھے کھڑا سن رہا تھا۔ اس بار اس نے اس کی چٹیا ہی پکڑ لی وہ مار ماری کہ سب ہی ماموں، چاچے اکٹھے ہو گئے، اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی منہ سر کا الگ عالم تھا۔

"تم کوئی رشتہ کیوں نہیں ڈھونڈتیں۔" ماموں بھڑکے۔

"پچاس تو دیکھ چکی اب تک۔"

"تم سے تو نہیں ہو گا پھر یہ۔۔۔ کل میں چھٹی کر رہا ہوں، میرے ساتھ چلنا۔۔۔ رات سے دن نہ کرو اور قصہ ختم کرو۔۔۔ خبردار سلیم! جو تو نے دوبارہ میری فجی کو ہاتھ لگایا۔۔۔ بچی ہے، سمجھ جائے گی۔۔۔ نادان ہے ورنہ تو اس جمشید کے منہ پر تھوکے بھی نہ۔"

سلیم نے بچی کو تو ہاتھ نہ لگایا۔ بچے کو نہ چھوڑا۔ دو دوست لے جا کر انار کلی بازار میں وہ تماشا لگایا کہ دوکانداروں کو پولیس بلانی پڑی۔۔۔ اور دور تک وہ رش لگا جیسے تعزیہ نکل رہا ہو۔۔۔ تین دن بعد ماموں سلیم کو تھانے سے لے کر آئے۔۔۔ ان تین دنوں میں خاندان والے چیل کوے بنے اس کی بوٹی بوٹی نوچتے رہے۔۔۔ جمشید کی ماں بھی آئی۔

"تو ہمیں بہت پیاری ہے لیکن جمشید سے زیادہ نہیں۔۔۔ یہ رشتہ نہیں ہو گا۔ خون خرابا ضرور ہو گا۔۔۔" اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

جمشید کو زبردستی کراچی بھجوا دیا۔۔۔ خود وہ دوسرا گھر ڈھونڈنے لگے۔ اماں ابا کے آگے بھی ہاتھ جوڑ گئے "آپ کی بچی، آپ اس کے مائی باپ۔ ہم کون ہیں۔"

کرشن نگر کے سنار کے سامنے ان کی کیا حیثیت۔۔۔ بچہ بچہ۔۔۔ بندہ بندہ اسے سنار سے شادی کے فوائد گنوا گیا۔۔۔ اس کی نادانی اسے سمجھا گیا۔ اسے پاگل نادان کہہ گیا۔ اسے چپ لگی تو پھر نہ ٹوٹی۔ بچے اسے فجی باجی پھر پھر کہنے کے لیے ترس گئے۔

"ہو جائے گی ٹھیک۔۔۔" چھوٹی خالہ نے کہا۔

"آج رو رہی ہے، کل ہنسے گی۔" مامی بولیں۔

"بیاہ کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے آپا! سونے پیلی رہے گی۔"

سلیم تک نے چاہا۔ مجنونانہ ہی سہی، وہ ہنسے تو۔

ماموں نے کہا "خبردار جو کسی نے اب اسے پھر پھر کہا۔۔۔ اس کے سسرالیوں تک یہ نام نہ جائے۔" ایسے ہی جھڑک رہے تھے۔ بڑوں چھوٹوں کو۔۔۔ یہ نوبت تو فجی آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔

وہ تو مٹی کی وہ ہانڈی بنتی جا رہی تھی جسے سونے چاندی سے بھر کر زمین میں دبا دیا جاتا ہے۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اور پھر دبانے والا بھول جاتا ہے کہ ہانڈی کہاں دبائی تھی۔

ہائے یہ لڑکیاں۔۔۔ ہائے یہ ہانڈیاں۔۔۔

کچھ زمین کے اوپر لا کر بھول جاتے ہیں۔۔۔ کچھ زمین میں دبا کر۔۔۔ یہ بھول جانا ان کے نصیب میں بار بار آتا ہے۔ ضرور آتا ہے۔

ڈھائی مرلے کا گھر دھنی ہو رہے بیچ گئے۔۔۔

اماں نے کہا "فکر نہ کر۔۔۔ دھنی کو ضرور بلاؤں گی تیری شادی میں۔۔۔ تیری مہندی ابٹن وہی کرے گی۔۔۔ اسے گھر میں بلا کر رکھوں گی۔ دے دلا کر بھیجوں گی۔۔۔ تیری سہیلی ہے وہ۔۔۔ فکر مت کر۔۔۔ وہ ضرور آئے گی۔۔۔ جانتی ہوں تیری جان ہے اس میں۔"

ماموں نے خاص۔۔۔ حیدر آباد آرڈر دے کر کانچ کی چوڑیوں پر "فرزانہ جمیل" لکھوایا۔ اسے لا کر بیٹی کو دکھایا۔ چھوٹی خالہ نے ایک جاننے والے سے دلی سے ساڑھیاں اور چاندی کی پازیبیں منگوائیں۔ سلیم پشاور رباڑے سے آدھا جہیز خرید کر لایا، خاص کر شاہی قالین۔۔۔ شیر چیتوں کے کمبل۔۔۔

اماں نے عذرا کے حصے کا رکھا زیور بھی اسے ہی دے دیا۔۔۔ عذرا تو بڑے ماموں کے بیٹے سے بیاہی جائے گی۔ کچھ نہ بھی دیا تو خیر ہے۔ سب بس فجی کو دیا جائے۔ سب فجی کو ہی دیا جانے لگا۔ سب سامان لا لا کر بڑے دو کمروں میں رکھنا شروع کر دیا۔۔۔ اس سے چند سال چھوٹی لڑکیوں کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

"فجی کے لیے اتنا کچھ۔۔۔ سب کچھ ہی فجی کے لیے کیوں جی؟"

خالہ، مامیاں، نانیاں آتیں۔ ایک ایک چیز کی مدح سرائی کرتیں۔ "یہ ایسا ہے، یہ ویسا ہے۔۔۔" برتن بکتیں۔۔۔ کپڑے دیکھتیں۔

"یہ نکال دو آپا۔۔۔ یہ نہیں جچے گا ان کے خاندان میں۔" کسی نہ کسی چیز کو اٹھا کر کہا جاتا۔

"دولہا کی بہن کو دو کپڑے بہت ہیں۔"

"یہ مردانہ شالیں۔۔۔ کہاں سے منگوا لیں۔۔۔ ذرا اچھی والی منگوا لیتے۔ سلیم سے کہو نا، ایک چکر اور لگا لے باڑے کا۔"

اس کے جہیز کی دھوم پڑی خاندان بھر میں۔۔۔ مجال ہے جو کوئی کمی رہنے دی گئی ہو۔ سب جتے ہوئے تھے، ہزار ہزار بار چیزیں پرکھتے تھے۔۔۔ رات رات بھر سوچتے تھے۔ ان کو بازار سے کیا کیا لانا ہے۔ کیسا لانا ہے۔ کس بازار کو جانا ہے۔ کس راستے سے جانا ہے۔۔۔ جیسے ہی ہے تانگ جانے دو۔۔۔ بچی کی ناک بن جائے، کوئی بات نہ کر جائے، آج ماں باپ، مامے، چاچے زندہ ہیں سوئے رہے ہیں۔ کل کو نہ رہیں تو کون دے گا۔۔۔ سب ہیرے، جواہر سونا چاندی، ریشم کمخواب اکٹھا کر دے دیا جائے۔۔۔ قارون کے خزانے کی چابیاں مل جائیں تو وہ بھی خوشی سے۔۔۔ بڑے دل نہیں تھے ان کے جو حساب دینے کو تیار تھے۔

تاریخ رکھی گئی۔ اماں اس کا ہاتھ کھینچ کر بڑے دونوں کمروں میں لے گئیں سامان کھول کھول کر رکھا تاکہ وہ دیکھ لے۔۔۔ دیکھ کر خوش ہو لے۔۔۔ خوشی سے خوش قسمت جان لے خود کو۔۔۔ وہ ایک ٹک سامان کو دیکھے گئی۔

"اتنا پیار کرتی ہو اماں مجھ سے؟" بہت دیر گزری پھر اس نے پوچھا۔ اماں جواب تو ضرور دیتیں، اس کے انداز پر سلگ اٹھی تھیں پر چپ رہیں۔ پندرہ دن بعد نکاح تھا اس کا۔

☼ ☼ ☼
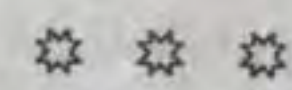
"پانچ لاکھ سکہ رائج الوقت قبول ہے۔۔۔؟"

فجی نے پہلی بار نظریں اٹھا کر کمرے میں موجود ایک ایک شخص کو دیکھا۔ رجسٹر اس کی گود میں رکھا تھا۔۔۔ یہ کیا ڈھونگ ہے۔۔۔ اسے ہنسی آئی۔ وہ قبول نہیں کر رہی پھر بھی کر رہی ہے۔

"قبول ہے؟" نکاح خواں کو پھر سے پوچھنا پڑا۔ ذرا پیچھے کھڑے ماموں گڑبڑا سے گئے۔۔۔ یہ بے وقت کی ہنسی۔۔۔ کمرے میں موجود پندرہ بیس عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، بڑی مامی نے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔ کوئی سسرالی عورت ہی اندر نہ آ جائے۔

"فرزانہ بنت جمیل احمد۔۔۔!" نکاح خواں پھر سے دہرانے لگے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر پھرانے لگی۔

"فرزانہ۔۔۔!" ماموں گرجے۔

"جی ماموں۔۔۔!" اس کی آنکھوں کا کاجل پھیل

چکا تھا۔

نکاح خواں سر اٹھائے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

"دستخط کرو بچے..... جلدی کرو....."

"اچھا ماموں جی! جیسی آپ کی مرضی..... اچھا اماں جی..... ابا جی.....! خالہ جان۔ اچھا جی ٹھیک ہے نایا جی..... جی اچھا۔"

"فرزانہ.....!" ماموں پھر دبی آواز میں گرجے..... مامی نے آکر ماموں کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا' دائیں بائیں بیٹھی خالہ' مامی نے کمر اور شانوں پر ہاتھ سے زوردار تھپکی دی۔

"ایسے نہیں گھبراتے فرزانہ!" زہرہ خالہ بولیں۔

"ہاں جی' خالہ جی ٹھیک کہتی ہیں۔" ہنسی کا فوارہ نکلا۔

"آپ بھی کہیے نا مولوی صاحب جی.....!"

"فرزانہ بنت....."

"بعوض ماں باپ کی عزت' خوشی مجھے قبول ہے۔"

اس نے ایسی آواز میں کہا جو آواز کسی نے آج سے پہلے اس کے حلق سے نکلتی نہیں سنی تھی ذرا کونے میں کھڑی اماں کانپ گئیں۔ بیک وقت سب نے جیسے شیش ناگ دیکھ لیا۔

"بعوض خاندان کی عزت' غیرت مجھے قبول ہے۔" انداز اور آواز پہلی سی ہی تھی۔

"بعوض سونا چاندی' ذات برادری' نام....."

ماموں نے اس کی گود میں سے رجسٹر گھسیٹا..... اور مولوی صاحب کو لے کر جھٹ باہر نکلے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ الٹا.....

کاجل پھیلی آنکھوں سے ایک نظر سب کو دیکھا۔

"میں ہنس لوں اماں جی....."

اماں جو اس کے نکاح کے بعد رونا چاہتی تھیں ششدر کھڑی اس کے انداز پر ساکت ہو گئیں۔

"اجازت ہو تو میں ہنس لوں؟" اس نے مشترکہ سب سے پوچھا۔

اسے ہاں کہنے کی ہمت کون کرتا..... اسے ناں کہنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔

وہ ایسے پھڑپھڑائی جیسے لاہور بھر کے کبوتر ایک ساتھ اڑے ہوں اور یکدم ہی بالکل "فوراً" ہی ان پھڑپھڑاتے کبوتروں پر بجلی آن گری..... خالہ' مامی' چچا چچی سب نے ایک دوسرے سے نظریں چرائیں۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا..... دیکھو' وہ ہنس رہی تھی..... کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔

عذرا کانپ سی گئی۔ اماں کی طرف دیکھا۔

"اماں؟" اتنا ہی کہہ سکی۔ اتنا ہی پوچھ سکی۔

اس کی آواز کمرے سے باہر جا رہی تھی..... لیکن وہ اس پنڈال تک نہیں جا سکتی تھی جہاں اس کے خاندان کے بڑے..... اس کے باراتی اور اس کا دولہا بیٹھا تھا۔ وہ وہاں تک بھی نہیں جا سکتی تھی جہاں کوئی معاشرتی خواندہ بیٹھا لکیریں اور خانے کھینچ کھینچ لوگوں کو اوپر اور نیچے رکھ رہا تھا وہی خواندہ جو عزت و شرافت کو سب سے نچلا خانہ بھی نہیں دیتا..... ہاں ہاں وہی خواندہ۔ ہاں ٹھیک وہی جو ذات و مرتبے کو..... ہاں ٹھیک وہی۔

وہ اس خواندہ پر ہنس رہی تھی..... نہیں۔ وہ خاندان بھر پر ہنس رہی تھی..... نہیں نہیں۔ وہ قبول کر چکی ہے..... بس وہ اسی لیے ہنس رہی ہے۔

خالہ زہرا نے اپنی آٹھ سالہ بچی کو خود میں بھینچ لیا..... کیوں؟ جانے کیوں..... وہ ایسا کر گئیں بس۔

"نجی.....!" اماں کی لرزتی آواز اس تک آئی لیکن وہ سن نہ سکی۔

ہر ایک کے ساتھ اس کی پھڑپھڑاہٹ لپٹ گئی۔

اور پھر..... پھر اڑ کر جانے والے سب ہی پرندے جلے پروں کے ساتھ اس دھرتی پر آگرے۔ جواب "اوسر" (بنجر) ہو چکی تھی۔ اوسر کر دی گئی تھی۔

اب یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں رہی کہ پھر کسی نجی کے منہ میں دوپٹا ٹھونس کر اس کی ہنسی کا گلا گھونٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

ناولٹ

اُم ایمان

"اوئی ماں.....!" دادی کی لاٹھی اچھی طرح اس کی کمر پر سینک گئی۔ وہ جو درخت پر بندر کی طرح لٹکی ہوئی تھی، نیچے گرتے گرتے بچی۔

"اتر آ کمبخت! اتر آ۔ کتنی دفعہ کہا ہے کچے آموں کا ناس نہ مارا کر۔ پر نہ جی! اس کان سے سنے گی۔ اس کان سے نکال دے گی۔"

دادی کی لاٹھی کی پہنچ سے دور وہ اب دو ٹہنیاں اوپر چڑھ کے بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں ادھ کھایا کچا آم تھا۔

"آج تو نے کچے آم اپنی اس دھماچوکڑی ٹیم کو کھلائے تو دیکھنا! کیسے آج تیری ٹانگیں توڑتی ہوں۔ میں کہتی ہوں۔ اترتی ہے یا بلواؤں تیرے باپ کو دکان سے وہی آکر تجھے اتارے۔"

دادی کی اب کے دی گئی دھمکی کچھ کام کر گئی۔ اس نے ادھ کھایا کچا آم نیچے پھینکا۔ مگر دو ٹہنیاں نیچے اتر کر رک گئی۔

"ایک شرط پر اتروں گی۔" اب کے مزید دادی کا کلیجہ جلایا۔

"کیا شرط ہے پھوٹو منہ سے۔"

"ماریں گی تو نہیں مجھے؟" معصومیت بھرا سوال دادی کو آگ ہی لگا گیا۔

"نہیں ماروں گی۔" الفاظ اور تاثرات ایک دوسرے کے مخالف نظر آئے۔

"کھائیں شاہو کی قسم۔" وہ مزید پھیلی۔

"نام مت لے اپنی دو گز زبان سے اس غریب کا۔ کاٹ کے ہتھیلی پہ رکھ دوں گی نامراد! لٹکی رہ ساری زندگی تیرے باپ کو بھیجتی ہوں وہی آکر اتارے گا تجھے۔"

شاہو کا نام لے کر اس نے دادی کے اصل غیظ و غضب کو آواز دی تھی، ورنہ ایسی چھوٹی موٹی جھڑپیں تو اس گھر کا روز کا معمول تھیں۔ دادی کے وہاں سے چلے جانے کا اطمینان کرنے کے بعد اس نے آخری ٹہنی سے چھلانگ لگائی۔ کپڑے جھاڑے۔ سائیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر لاپروائی سے گلے میں ڈالا۔ وہیں پر موجود کونے میں بہتے نل سے ہاتھ منہ اور پاؤں اچھی طرح سے دھوئے اور گھر کی اندرونی سمت چلی آئی۔

کچن میں آکر فریج کھولا۔ توقع کے عین مطابق
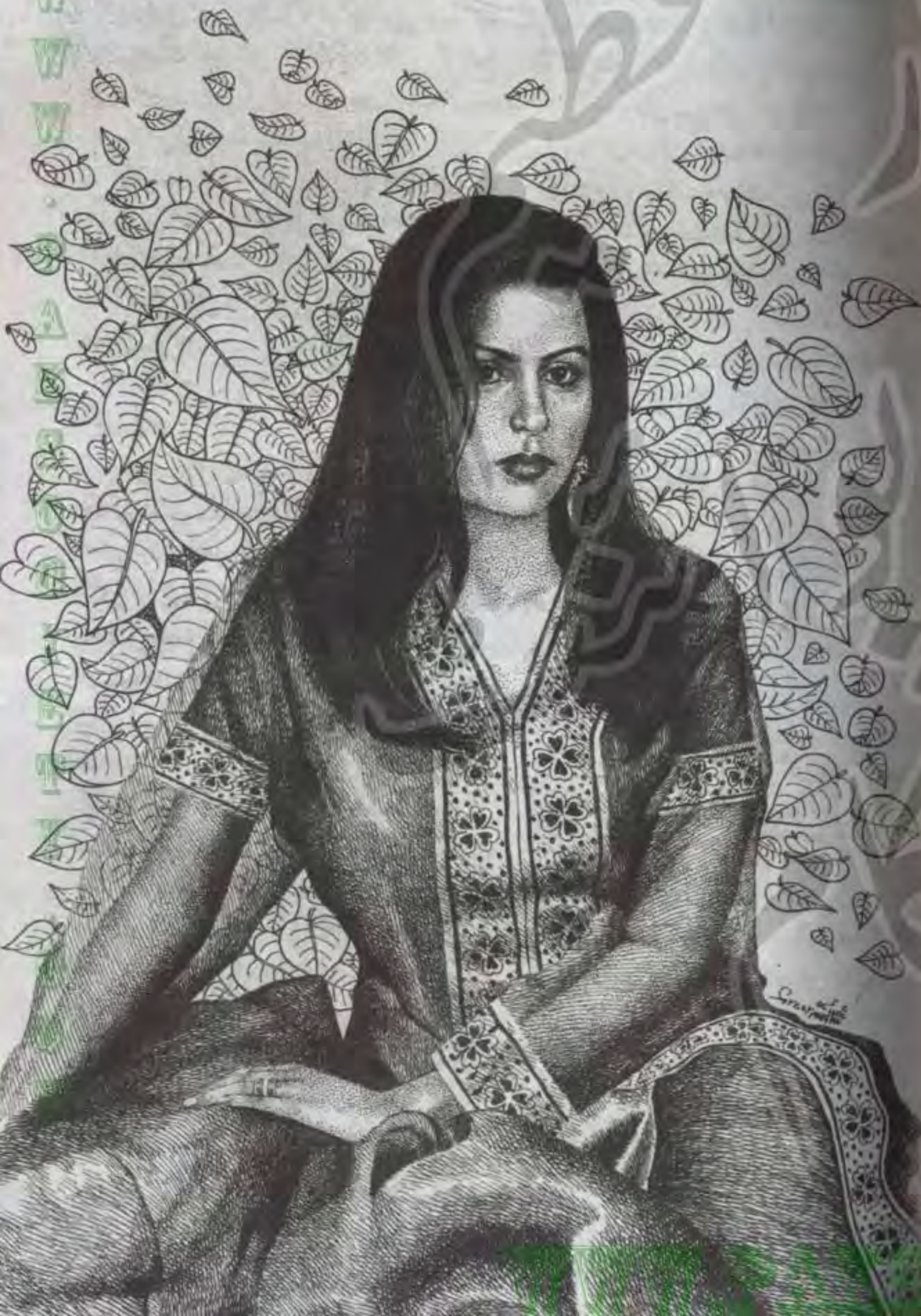
جگ میں فالسے کا شربت موجود تھا۔ گلاس اٹھا کر وہ گلاس شربت پی کر باقی جگ ویسے فریج میں رکھا اور اپنے اور دانیہ کے مشترکہ کمرے کی طرف چلی آئی جہاں حسب معمول دانیہ ہیڈ فون کانوں سے لگائے کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ موبائل پر گانے سنے جا رہے تھے شاید لیکن انہماک پورا قمیص پر ابھرے خوب صورت پھول کی طرف تھا۔ وہ دھم سے اس کے پاس مسہری پر ہی گر گئی۔

دانیہ نے فریم سائیڈ پر رکھ کر ہیڈ فون کانوں سے اتار دیا۔ پتا تھا اس کی موجودگی میں کوئی کام ڈھنگ سے کرنا ناممکن ہوتا تھا۔

"دادی کہاں ہیں؟ اس نے آنکھیں موندے موندے پوچھا۔

"سو گئی ہیں۔ پتا بھی ہے تمہیں یہ ٹائم ان کے قیلولے کا ہوتا ہے۔"

"ان کے اسی قیلولے نے تو مجھے بے موت مروا دیا تھا آج۔ میں نے ان کو دروازے میں سے جھانک کر بستر پر سوتے دیکھا یہ تصدیق کیے بغیر کہ وہ سو گئی ہیں یا نہیں اور چڑھ گئی ان کے ایک عزیز از جان درخت پر۔ بہت جی چاہ رہا تھا آج کچے آم کھانے کا، پر کیا پتا تھا کہ رنگے ہاتھوں ہی پکڑ لیں گی۔ اف! ایسی ٹکا کے لگائی کمر پہ کہ اب تک ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ مزید میری خدمت پر آمادہ تھیں، وہ تو میں ان کی چھچ سے دور گئی تو بچت ہو گئی۔ اور اصل غصہ تو انہیں تب آیا، جب میں نے ان سے کہا کہ ایک شرط پر نیچے اترتی ہوں کہ اپنے چہیتے شاہو کی قسم کھائیں کہ مجھے نہیں ماریں گی بس جی شاہو کا نام سننا تھا کہ میری اگلی پچھلی ساری کسریں نکال لیں، ساتھ میں ابو جی سے شکایت کی دھمکی دیتے ہوئے چلی گئیں۔" کمال اطمینان سے آج کی تازہ روداد دانیہ کے گوش گزار کی گئی جبکہ وہ اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا ملتا ہے تمہیں ان کو تنگ کر کے؟"

"جو انہیں مجھے تنگ کر کے ملتا ہے اور ہاں! آج فالسے کے شربت میں چینی کم تھی لیکن پیاس بہت لگی تھی پھر بھی مزہ ہی آگیا۔ کھانے میں کیا ہے آج؟"

"ماش کی دال اور پودینے کی چٹنی ہے۔ تھوڑے سے چاول بھی ابالے تھے دادی کے لیے، وہ بھی بچے ہوئے ہیں۔ رائتہ بھی ہو گا فریج میں۔" دانیہ نے تفصیل بتائی۔

"اف یہ دال... پرسوں مسور کی دال، آج ماش کی دال... کسی دن ان بھرے ہوئے دالوں کے ڈبوں کو بھی روپوش کرنا پڑے گا مجھے تب ہی ان سے جان چھوٹے گی۔" اس نے دانت کچکچائے۔

"چاول کھا لو رائتے کے ساتھ۔" تحمل دانیہ کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔

"ایک تو دادی نے اپنی ساری قناعت پسندی تمہارے اندر ہی انڈیل دی ورنہ تمہارا ووٹ بھی میرے ساتھ ہوتا تو میں دیکھتی کیسے یہ ٹنڈے آلو، دال روز پکتے ہیں اس گھر میں اور پلیز دانیہ! ذرا کھانا ہی لا دو یہاں۔" ایک بات کا سرا دوسری بات سے جوڑتے ہوئے دانیہ سے التجا بھی حکمیہ لہجے میں کی جواباً دانیہ سرہلاتی ہوئی اٹھ کر کچن میں چلی آئی جبکہ اس نے ہیڈ فون اپنے کانوں سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

"ذرا زور سے دباؤ۔ ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا۔" ساس کی کراری آواز نیند کے اس میٹھے جھونکے سے دوبارہ اسے اسی مخصوص تلخ فضا میں کھینچ لائی۔ نیند سے بند ہوتی بوجھل آنکھیں کھول کر اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا، گھڑی ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ درد سے دکھ رہا تھا۔ ساس صاحبہ کی میٹھی نیند میں جانے تک اسے یہ کام کرنا تھا۔ ابھی غنی کے صبح کے لیے کپڑے پریس کرنے تھے۔ وہ تو شکر ہے کہ کچن کا اچھا خاصا کام سمیٹ آئی تھی۔ تاہم صبح کے لیے آٹا گوندھنا باقی تھا۔ ان کی گہری ہوتی نیند کا احساس ہوتے ہی وہ آہستہ سے اتری۔ اگرچہ کچن میں جانے کے خیال سے ہی کوفت ہونے لگی لیکن صبح اٹھنے کی تیاری میں پچنے والی ہڑبونگ سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے آٹا گوندھ کر باؤل میں ڈالا۔ فریج میں رکھا۔ گیلے کپڑے سے کچن کے فرش پر پوچھا پھیرا اور لائٹ بجھا کر، کچن کا دروازہ بند کرتی وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ غنی ٹی وی دیکھ رہا تھا اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کہاں ہے یار! کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ محترمہ پتا نہیں کن اہم کاموں میں مصروف ہیں؟" اس کی ہر مصروفیت کا علم ہونے کے باوجود وہ اسی سے شکوہ کناں تھا۔

"کچن میں مصروف تھی۔ آپ بتائیں کیا کام تھا؟" دودھ کا گلاس اسے تھماتی وہ آہستہ سے بولی۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں اتنا خود غرض ہوں کہ تمہیں صرف کام کے ٹائم یاد کرتا ہوں یا تم یہ باور کرانا چاہتی ہو کہ ساری ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر پڑی ہیں۔ گھر کے لوگ ہی کتنے ہیں ہم، صرف تین؟ اور تین لوگوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے مگر تمہاری ہر وقت کی اس بے زار شکل سے ایسا لگتا ہے جیسے تین سو بندوں کے کام نمٹا کے آئی ہو۔"

حسب عادت بغیر وجہ اور بغیر کسی بات کے وہ بگڑ چکا تھا۔ ابھی رہ جانے والے کاموں کی کوفت ہی برقرار تھی کہ صاحب بہادر کو منانے جیسا مشکل ترین کام بھی سر پر آ پڑا۔ اس کا سر حقیقت میں چکرا گیا۔ آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں جنہیں اس نے یک بارگی جھپک کر جھٹلایا کہ آنسو نکل آنے کی صورت میں کوئی اور وجہ لگ جاتی۔

کچھ بھی تو روایتی نہ تھا ان کے رشتے کے بیچ۔ نہ نئے شادی شدہ جوڑوں والی شوخی و شرارت، نہ اولین دنوں کی والہانہ محبتیں، نہ روٹھنے منانے کے حسین سلسلے۔ ایک حقوق و فرائض کی لڑی تھی جس میں فرائض کے سارے موتی پرونا اس کے ذمے تھے اور وہ ان کو بجالانے میں سرشار ہوتی اگر جو دوسری جانب سے فرائض کی ادائی کا ایک ایسا ہی سلسلہ ہوتا لیکن دوسری طرف حقوق کی ادائی کا بھول کر بھی کہیں ذکر نہ تھا۔ اپنی مردانگی دکھا لینے کے بعد جب سو گیا تو دکھتے سر اور جسم کے ساتھ اس نے صبح کے لیے کپڑے استری کیے اور بستر پر دراز ہو جانے کے باوجود نیند آنکھوں سے روٹھی رہی۔

پانچ بجے اٹھ کر غسل کر کے جب اعصاب کچھ ڈھیلے محسوس ہوئے تو اس نے نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کتنی ہی دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

عصر کے ٹائم آسمان پر دیکھتے ہی دیکھتے گرد و غبار کے بادل چھا گئے اور تیز چلنے والی آندھی نے سارے میں گرد و غبار کا طوفان مچا دیا۔ مہو کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے جھٹ سے گیند بلا اٹھایا اور فٹ سے گھر کے پچھواڑے آگئی۔ پتا تھا کرکٹ کے سارے شیدائی مٹی کی گرمی کا زور ٹوٹتا دیکھ کر فوراً "یہیں آئیں گے۔ اس کا اندازہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ گیارہ بارہ سال کے بانی "گڈو"، عاصم اور احمد جلد ہی پہنچ گئے اور وہی مخصوص ہاہاکار مچ گئی جو ایسے ہی ماحول کا نتیجہ ہوتی تھی جبکہ دانیہ کو صبح دھوئے کپڑوں کے اڑ جانے کی فکر نے حواس باختہ کر ڈالا۔ وہ جلدی سے کپڑوں کا ڈھیر جو دوپہر میں اس نے مہو کے ذمہ لگایا تھا کہ اتار لائے۔ اس کی غیر ذمہ داری کے باعث اسے ہی لانے پڑے۔ اس نے کپڑوں کا ڈھیر مسہری پر پھینک کر جلدی جلدی دونوں کمروں کی کھڑکیاں بند کیں لیکن تب تک آندھی اپنا رنگ دکھا چکی تھی۔

"جا بیٹا! آندھی سے کافی سارے کچے آم گر گئے ہیں، پہلے وہ سمیٹ لے۔ اچار ہی ڈال لیں گے۔ ایسے ہی چھوڑ دیا تو اس ٹارزن کی بچی اور اس کی چنڈال چوکڑی نے چورن لگا کے سارے کھا جانے ہیں۔ یاد نہیں پچھلی دفعہ کی آندھی پر جو کھائے سو کھائے، باقی سب سمیٹ سماٹ کر ساتھ لے گئے بدتمیز بچے۔" دادی فوراً اندر آئیں اور ادھر ادھر کا پھیلاوا سمیٹتی

دانیہ کو مخاطب کیا جو "جی دادی۔" کہہ کر باہر جانے لگی۔

"اور ہاں بیٹا! فالسے آج میں نے دیکھے کافی سارے پک گئے۔ ٹوکری لے جا میرا بچہ! پکے پکے سارے اتار کے فریج میں رکھ دے۔ صبح شربت بنا کے رکھوں گی میرے شاہو کو بڑا پسند ہے۔"

ان کے بوڑھے چہرے پر محبت کے سارے رنگ پھیل گئے تھے شاہو کے ذکر پر۔ دانیہ نے رک کر ان کی بات سنی اور کچن سے ٹوکری اٹھا کر صحن کے بائیں جانب بنے اس کچے احاطے میں چلی آئی جہاں دادی کا بنایا چھوٹا سا کھیت ان کی محبت اور محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

آم کے پانچ پیڑ، چار کینو کے پیڑ، لیموں کے آٹھ دس پودے، دو امرود اور دو جامن کے پیڑ ساتھ میں فالسوں کے پیڑ جن پر کچے پکے فالسوں کی بہار تھی۔ درمیان کی خالی جگہ کو موسمی سبزیاں لگا کر پر کیا گیا تھا۔ موتیا اور گلاب کے پودے الگ بہار دکھاتے نظر آتے۔

دادی کا دن کا بیشتر حصہ ان پیڑ پودوں کی ناز برداری کرتے گزرتا۔ آج سے دس برس پہلے تقدیر نے ان کے بڑھاپے پر کاری وار کیا، جب شاہ میر اور دانیہ کے والدین اور مہر النسا کی والدہ جب دوسرے گاؤں ہونے والی کسی فوتگی میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے۔ ثاقب احمد دادی کے چھوٹے بیٹے جن کا گاؤں میں اپنا جنرل اسٹور تھا کام کی وجہ سے رک گئے تھے۔ بچے بھی پڑھائی کی وجہ سے گھر پر تھے اور دادی کی اس دن طبیعت ٹھیک نہیں تھی، سو وہ بھی گھر پر رک گئیں صبح کے وقت گھر سے ٹھیک ٹھاک روانہ ہونے والے تین نفوس واپسی پر کفن اوڑھے میتوں کی صورت واپس آئے تھے۔ دادی کے لیے ایک جوان بیٹے اور دو بہوؤں کی موت کا صدمہ ہی جان لیوا تھا۔ ان کا ہنستا کھیلتا گھرانہ اجڑ گیا تھا۔ پر تین لڑکپن کی حدود میں قدم رکھنے والے معصوم بچوں کی صورت ان کو کمر کس لینے پر مجبور کرتی۔ بچوں کے مستقبل کی خاطر انہوں نے اتنا بڑا غم اپنے دل کے اندر اتار لیا تھا۔ بڑے بیٹے فرید کا بڑا بیٹا تیرہ سال کا، اس سے چھوٹی دانیہ گیارہ سال کی جبکہ چھوٹے بیٹے ثاقب کی مہر النسا ابھی دس سال کی تھی۔ دادی اللہ تعالیٰ سے اب بس کچھ مہلت، ہمت اور حوصلے کی توفیق کی دعا کرتیں۔

دادی کی توجہ، تربیت اور پیار نے جہاں شاہ میر کو ایک ذمہ دار، محنتی اور احساس ذمہ داری رکھنے والے نوجوان کی شکل میں ڈھالا۔ اپنے باپ کی طرح اونچے لمبے قد کاٹھ اور خوب صورت تیکھے نقش والے شاہ میر کو نظر لگ جانے کے ڈر سے نظر بھر کر بھی نہ دیکھتیں۔ وہ شہر میں مکینیکل انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا جبکہ دونوں لڑکیاں آج کل بی اے کے پیپر دے کر رزلٹ کے انتظار میں تھیں۔ دانیہ میٹرک کے امتحانات میں شدید بیمار پڑنے کے باعث امتحانات نہ دے سکی تھی۔ نتیجتاً اب دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں اور یہی ایک قدر ہی ان دونوں میں مشترک تھی اس کے علاوہ دونوں کی عادات، خیالات اور شکل و صورت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

دانیہ تیکھے نین نقش لیے قدرے سانولا رنگ رکھتی تھی لیکن اس کے گھٹنوں تک آتے لمبے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مقابل کو مبہوت کر دیتی تھیں۔ سلیقہ مندی گویا اسی پہ ختم تھی۔ دادی کو پتا نہیں کب سے اس نے پلنگ پہ بٹھا دیا تھا۔ گھر کے سارے کاموں کا چارج اسی کے ہاتھ میں تھا۔ انتہائی نرم مزاج، ہمدرد اور مخلص۔ ان تین لفظوں میں دانیہ کی فطرت بیان کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی مہر النسا عرف مہو، جس کے تربیت کرنے والے وہی لوگ تھے جو دانیہ کے، پر طبیعتوں کا تضاد دیکھنے والوں کو حیران کر دیا کرتا تھا۔

شوخ، نٹ کھٹ، چلبلی مہو بچپن سے ہی بہت شرارتی تھی۔ اسکول میں بھی اس کے دوست زیادہ تر لڑکے ہی تھے، جن کے ساتھ وہ لڑکوں والے کھیل ہی کھیلا کرتی تھی۔ کبھی گلی ڈنڈا۔ کبھی کبھی کرکٹ۔ گھر میں بھی اپنے دوستوں کو بلا کر دھما چوکڑی مچائے رکھتی۔ شروع شروع میں تو کپڑے بھی مردانہ پہنتی تھی پر ذرا بڑی ہونے پر دادی نے زور زبردستی کر کے اسے شلوار قمیص پہننے پر مجبور کیا تھا ہاں دوپٹا سنبھالنے کی عادت اب بھی نہ تھی اس میں۔ دادی کو اور ابا کو دیکھ کر کونوں کھدروں سے دوپٹا برآمد کر کے کونا سر پر ٹکانے کا تکلف کر لیا کرتی تھی۔

عمر کے اس خوب صورت دور میں پہنچ کر بھی اپنے حسن سے بے نیاز تھی۔ ماں کی طرح لانبا قد، گھنے سیاہ بال۔ سرخ و سفید رنگت پر تیکھے نقوش۔ دادی اس کا ہو بہو سراپا دیکھ کر دہل جاتیں۔ اگرچہ وہ بس کبھی بھنگ کے حلیے میں نظر آجاتی۔ ورنہ زیادہ تر اپنے آپ سے غافل ہی رہتی۔ بی اے کے پیپر دے دینے کے بعد بھی اس کا وہی حال تھا۔ کبھی دادی کے چھوٹے سے باغیچے کے کچے مالٹوں کی شامت آئی رہتی۔ کبھی چوری چوری کچے فالسے توڑ توڑ کر کھائے جاتے، کبھی نظر کرم امرودوں کی جانب ہو جاتی۔ کھیلتے کھیلتے کبھی جو موڈ بنتا تو سبزیاں بھی محفوظ نہ رہتیں۔ مولیاں، گاجر، شلجم زمین سے نکال کر دھو کر کھائے جاتے۔

دادی پھل پکنے پر اپنی ضرورت کا رکھ کر محلے میں بھجوا دیتی تھیں۔ ایسے ہی موسمی سبزیاں اور مختلف قسم کے شربت بنا کر بھی بوتلوں میں بھر کے رکھ دیتیں۔ شاہو کو گھر میں بنے موسمی شربت بہت پسند تھے۔ سبزیوں اور آم کے اچار بنانے کے کئی طریقے دادی نے دانیہ کو ازبر کرا دیے تھے۔ یوں نہ صرف اپنی کفایت شعاری کے باعث دادی کو بچت ہو جاتی تھی بلکہ محلے دار بھی مستفید ہو جاتے۔

دانیہ کی بات اپنی خالہ کے بیٹے سے طے تھی جس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد دانیہ کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔ جبکہ شاہ میر کے ساتھ دادی نے ہمیشہ مہو کا تصور کیا تھا۔ شاہ میر کو بھی اپنی شرارتی سی کزن دل و جان سے پسند تھی لیکن اس کی نٹ کھٹ اور لاپروا طبیعت اسے مہو کے سامنے اپنے جذبے آشکار کرنے سے باز رکھتی اور خود وہ عمر کے اس حسین دور میں ہونے کے باوجود ان قسم کی باتوں سے کوسوں دور تھی۔ دادی یا ابا نے بھی اس قسم کی کوئی بات بچوں کے سامنے نہ کی تھی۔ وہ چاہتے تھے وقت آنے پر ان کو بھی بتا بھی دیں گے اور مضبوط رشتوں میں باندھ بھی دیں گے۔

☼ ☼ ☼

اس نے کبھی اس قسم کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ رویوں، رشتوں سے اسے ہمیشہ محبت، پیار اور اعتماد کی فضا ملی تھی اور اب شادی کے بعد اس کی زندگی میں کمی تھی تو انہی چیزوں کی۔ زندگی کی تلخی کیا ہوتی ہے وہ اب دیکھ رہی تھی۔ حقیقی رشتے روح کو کیسی ٹھنڈک بخشتے ہیں، اس نے کبھی محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن مجازی رشتوں کے ناگ کیسے کیسے اپنا زہر اس کی نس نس میں انڈیل رہے تھے، زندگی کے رنگ اتنے تلخ بھی ہو سکتے ہیں اسے اب پتا چلا تھا۔ اسے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اتنے چاؤ سے بیاہ کر لانے والی ساس نے پہلے دن سے اس سے ایسا بیر باندھا تھا جس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ تنہائی میں اس سے پیار کے راگ الاپنے والا غنی ماں کے سامنے ایسا کاٹھ کا الو بن جاتا، جس کی ڈور اس کی ماں جہاں چاہے ہلاتی رہتی تھیں۔ اس کی ساس کو اس کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے سے لے کر اس کے کھانے پینے تک پر بے حد اعتراض ہوتا۔ اسے شروع سے گوشت دھونے سے ابکائی آتی تھی۔ گھر میں کوئی بھی کام کے لیے اس سے نہ کہنا پڑتا تھا مگر جب سے اس کی ساس کو اس عادت کا پتا چلا تھا وہ خود ساتھ کھڑے ہو کر اس سے گوشت دھلواتیں۔ اسے چاول صاف کرنے سے الرجی ہوتی تھی۔ اس کی ساس مہینے کا سودا جب اکٹھے منگواتیں، سب سے پہلا کام ڈھیروں چاول صاف کر کے ڈبوں میں رکھنے کا دے دیتیں۔

نئی نویلی دلہن تھی۔ اپنے نئے کپڑے اور زیور اور میک اپ کی چیزیں برتنے کا شوق ہر نوبیاہی لڑکی کو ہوتا ہے۔ اس کو بھی تھا۔ شروع شروع میں بری اور جہیز کے نئے کپڑے نکال کر وہ زیور پہن کر تیار ہو جاتی تو اس کی ساس اس قسم کے سجنے بننے کو بازاری حرکات

قرار دیتیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اس کا سارا زیور اپنے قبضے میں لے لیا۔ جس کی دوبارہ آج تک اسے شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوئی تھی۔ تقدیر کے اس موڑ کے بارے میں جتنا سوچتی' اتنی پریشان ہو جاتی۔ سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ نہ تو اپنی ساس کے مزاج کے تمام رنگوں سے آشنائی حاصل کر پائی تھی' نہ مجازی خدا کے۔

گرمیاں آ گئی تھیں' پر ابھی تک اس کے پاس اپنے جہیز کے وہی ریشمی جوڑے تھے' جو اب اس تپتی گرمی میں اسے چبھنے لگے تھے' پر اس کی ضروریات کی ذاتی چیزوں کی فراہمی کا خیال نہ تو ساس کو آیا تھا نہ ہی شوہر کو۔ وہ تو میکے سے جو سوغاتیں اور ضروریات کا سامان آجاتا۔ اس کو بھی قبضے میں لے لیتی تھیں۔ حالانکہ میکے سے آئی یا لائی گئی چیز سے عورت کو خصوصی انسیت ہوتی ہے۔ اس گھر سے آتی تپتی ہوا بھی عورت کو باد نسیم لگتی ہے۔

اب کی بار اس کے میکے سے چار جوڑے لان کے جس میں سے دو سلے اور دو ان سلے آئے تو اس کی آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں۔

آج اس نے نہا دھو کر وہ سوٹ پہنا تھا اور اس میں ماں کی محبت باپ کی شفقت محسوس کر کے دل بہت گداز ہو رہا تھا۔ طبیعت بہت بوجھل سی تھی' سو بہت ست روی سے گھر کے معمول کے کام نبٹانے میں مصروف تھی اچانک کچھ اس طرح سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا کہ کچھ سجھائی نہ دیا۔ اس نے سہارے کے لیے پاس کسی چیز کو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے نیچے گر پڑی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز پایا۔ ذرا حواس بحال ہونے پر ساس صاحبہ کی خشمگیں نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا جو سامنے پڑے صوفے پر نیم دراز تھیں۔

"کب سے یہ حال ہے تمہارا؟" کڑے لہجے میں استفسار نے اسے بوکھلا دیا۔

"جی کیسا حال؟" مرے مرے لہجے میں دریافت کیا۔

"یہی چکر وکر... الٹیاں بھی آتی ہیں؟" بتانے کے ساتھ اگلا سوال بھی جڑ دیا۔

"ہوں..." بہت معنی خیزی تھی اس ہوں میں۔

"کچھ نہیں ہوا ٹھیک ہے سب' کمزوری ہے تھوڑی سی۔ شام کو ڈاکٹر صاحب سے دوائی لے کر آؤں گی وہ کھا لینا اور اپنی طبیعت کا ذکر میاں سے مت کرنا۔ مرد کو بیمار بیوی کبھی بھی متاثر نہیں کرتی۔ کھانا میں نے بنا لیا ہے۔ وہ لاتی ہوں' کھالو۔"

کرخت لہجے میں توجہ کا ایک عنصر اسے بے طرح حیران کر گیا۔ اس پورے ایک سال میں پہلی دفعہ اس کی ذات کے حوالے سے تھوڑی سی تفتیش اسے مطمئن کر گئی تو اس نے بیڈ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

جون کی تپتی دوپہر میں جب ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ درخت کے پتے تک ساکت تھے۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں گرمی کی تپش سے پناہ لیے چھپے بیٹھے تھے۔ گاؤں کی نہر میں گھٹنوں تک ڈوبے وہ تینوں موجود تھے۔ آم کی گھنی شاخوں نے نہر کے اوپر چھت سی بنا دی تھی۔ دادی کے باغ سے توڑا گیا تربوز اس وقت ڈش میں نفاست سے کاٹ کر دانیہ نے اس میں تین کانٹے رکھے اور ان دونوں کو پیش کیا۔ دوسرا سبز تربوز نہر کی سطح پر تیر رہا تھا' جو اگر ان کی پہنچ سے ذرا دور جانے لگتا تو کبھی ٹانگ سے شاہو اسے اپنی طرف کر دیتا کبھی مہو ہاتھ سے اسے دھکیل کر دانیہ کی سمت کر دیتی یہاں سے نہر کا پاٹ بہت کم چوڑا تھا۔ نتیجتاً وہ سامنے والے کنارے سے ٹکرا کر پھر انہی کی جانب آجاتا۔

"شاہو... تمہاری کلاس میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں؟" تربوز کھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہاں کیوں؟" وہ چونک کر گویا ہوا۔

"تمہیں کوئی پسند ہے تو مجھے بتا دو۔ دراصل دانیہ کی شادی کے بعد میں اکیلی رہ جاؤں گی تو میں چاہتی ہوں اس کی کمی محسوس نہ کروں۔"

دانیہ نے اپنی شادی کی بات پر پہلے تو گھور کر اسے دیکھا' ساتھ ہی ایک دھپ رسید کی' دانیہ کی بات بہت پہلے سے اس کی خالہ کے ہاں طے تھی' جو نزدیکی گاؤں میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کا بیٹا اب تعلیم مکمل کر کے آیا تھا اور اس نے اپنے گاؤں میں ہی پیسٹی سائیڈز کا بزنس کر لیا تھا۔ اس کی ہونے والی ساس ابھی پرسوں ہی دادی کو کہہ کے گئی تھیں کہ وہ جلد ہی شادی کی تاریخ طے کرنے آئیں گی۔ اس بات پر پرسوں سے ہی مہو نے چھیڑ چھیڑ کر دانیہ کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ بہانے بہانے سے یہی ذکر نکال کر بیٹھ جاتی۔ کبھی گانے گانا شروع کر دیتی اور تو اور دادی بھی مسکرا دیتی تھیں۔

"پتا ہے شاہو! تم شہر سے اگلی بار ڈھولکی لے آنا اور کچھ چیزوں کی لسٹ بنا کر دوں گی' وہ لے آنا تاکہ ابھی سے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔"

اب اس کی گفتگو کا دھارا دانیہ کی طرف مڑ گیا تو شادی کے کئی منصوبے بنا لیے گئے جبکہ شاہ میر دل ہی دل میں یہ سوچ کر رہ گیا کہ کیا اس کی آنکھوں میں جذبوں کے رنگ کبھی مہو کو نظر نہیں آئے۔ لازمی ہے کہ ہر بات کا زبان سے اقرار کیا جائے؟

"مہو! تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟" شاہ میر کا پوچھا گیا سوال یکدم اسے چونکا گیا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب سب کی شادی ہوتی ہے تو اسی حوالے سے ہر ایک نے کوئی نہ کوئی خیالی خاکہ ذہن میں ضرور بنایا ہوتا ہے۔ تمہارا بھی ہوگا ظاہری بات ہے اور تمہاری شادی بھی کرنی ہے ہم نے۔"

دانیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر شاہ میر کو دیکھا کیونکہ وہ بھائی کے دل کی خواہش سے واقف تھی۔ جبکہ مہو کی کیفیت دانیہ کی کیفیت سے جدا تھی۔

"کیا مطلب شاہو! تم اپنی بیوی لانے سے پہلے مجھے گھر سے بھگانا چاہتے ہو؟" اس کی بے وقوفانہ سوچ پر شاہ میر کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

"پتا ہے شاہو! میری کسی سے دب کر رہنے کی فطرت ہے نہ کسی کی غلط بات برداشت کرنے کی عادت۔ جبکہ شادی ایک ایسا بندھن ہے جس میں ایک شخص اس قابل ہے۔ یا نہیں ہے کہ اس کی غلامی کی جائے' پر نہ چاہتے ہوئے عورت کو یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اوپر سے ساس' نندوں جیسی مخلوقات کا حکم بجالانا' نہ چاہتے ہوئے انہیں برداشت کرنا تو تمہیں پتا ہی ہے ناں کہ کوئی میرے اوپر ایک لمحے کو اپنے خیالات حاوی کرے' مجھے اسی سے اتنی گھٹن ہوتی ہے کجا کہ ساری عمر کے لیے چند لوگوں کو اپنے اوپر مسلط کر لینا۔ اف توبہ!" اس نے بے ساختہ جھرجھری لی۔

"لیکن ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہر مرد ایسا نہیں ہوتا جو بیوی کو اپنا غلام بنائے۔ نہ ہی ہر ساس اور نند ایسی ہوتی ہے' جو زبردستی بہو بھاوج کو حکم بجالانے پر مجبور کرے اور خود کو بہو کے سر پر تمام عمر مسلط کرے۔" دانیہ کو اس کی بات سے شدید اختلاف ہوا تو وہ بول اٹھی۔

"تم کہہ سکتی ہو کیونکہ تمہارے ہونے والے سسرالی تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں اور تم کسی نہ کسی حد تک ان کی فطرت و عادات سے واقف ہو۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد پہلے محبتیں جتانے والے یہی لوگ رشتے کی نوعیت تبدیل ہونے پر خود بھی بدل جاتے ہیں۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ دونوں بہن بھائی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف نگاہ کی۔

"تمہارے سسرالی رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے تمہارے رشتہ دار نکل آئیں۔"

"میرے دور دور تک ایسے کوئی رشتہ دار نہیں ہیں۔" کمال اطمینان سے جواب دیا گیا۔

"قریب کے تو ہیں لیکن تمہاری قریب کی نظر شاید کمزور ہے۔" دانیہ سے زیادہ دیر تک اس کی فضول گوئی برداشت نہ ہوئی' نہ ہی بھائی کا پھیکا پڑتا چہرہ تو وہ بول پڑی۔

"قریب کا رشتہ تو صرف شاہو سے ہے۔ لیکن میں

ایک فضول رشتہ بنانے کے چکر میں اس سے، جو میرے اور ڈھیر سارے رشتے بنتے ہیں۔ وہ ختم نہیں کر سکتی۔ یہ میرا ایسا کزن ہے، جس سے ہر قسم کی فرمائش دھڑلے سے کر لیتی ہوں۔ یہ میرا ایسا دوست ہے، جس سے اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک کر لیتی ہوں۔ بلکہ تم میری سہیلی کم ہو، یہ زیادہ ہے۔" اس نے شاہ میر کو شرارت سے دیکھا۔ "تم تو کبھی کبھار ٹوک بھی دیتی' یہ نہیں ٹوکتا۔ تسلی اور توجہ سے میری بات سن کر مسکرا دیتا ہے۔" وہ پھر مسکرائی۔

"میں ایک رشتہ جوڑ کر اتنے ڈھیر سارے رشتے نہیں توڑ سکتی' نہ ہی شاہو ایسا چاہے گا۔" اس نے تائیدی نظر سے شاہ میر کی طرف دیکھا۔

"اچھا پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔ اگرچہ بہت سی باتیں تمہاری غیر منطقی ہیں اور میں تمہیں اچھی طرح سمجھا سکتا ہوں' پر ابھی ہمیں آئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ دادی انتظار کر رہی ہوں گی اور چچا بھی دکان سے آ گئے ہوں گے۔"

شاہ میر نے سنجیدگی سے کہہ کر پاؤں نہر کے پانی سے نکالے اور پاس گھاس پر پڑی چیزیں سمیٹ کر ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ وہ دونوں بھی پانی سے نکل کر اس کے پاس آ گئیں اور کچھ ہی دیر میں وہ لوگ گھر پر تھے۔ شاہ میر کی توقع کے عین مطابق دادی جاگ چکی تھیں اور ان کے انتظار میں تھیں۔

"آ گئے میرے بچے!" انہوں نے تینوں کو مخاطب کیا اور شاہو کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ان کے بٹھانے کی دیر تھی' وہ بھی ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند گیا۔

دانیہ دادی کے لیے کھانا نکالنے چلی گئی جبکہ مہو بھی پاس پڑے پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ دادی آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں اور ساتھ ساتھ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ مہو محبتوں کے اس مظاہرے پر جل ہی تو گئی۔

"اٹھالیں لاڈ اپنے لاڈلے پوتے کے۔ جب اس کی بیوی آ جائے گی نا' تو آپ کو اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دے گی۔ تب میں ہی ہوں گی جس کے پاس پناہ ڈھونڈنے آئیں گی آپ اور میں بھی ایسے ہی تو لفٹ کرا دوں گی جیسے آپ مجھے کراتی ہیں۔"

ایسی بے سروپا بات پر جہاں دادی جھٹکے سے سیدھی ہوئیں' وہاں شاہ بخیر بھی پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا کہا تو نے۔ کون ہو گی اس کی بیوی؟ ارے کس میں جرأت ہے، جو میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کر سکے۔" دادی چمک کر بولیں۔

"وہی جس سے یہ شادی کرے گا۔ گاؤں میں تو اس کے معیار کی کوئی ہے نہیں۔ شہر سے ہی لائیں گے ہم اپنے شاہو کی دلہن۔۔۔ اور شہری لڑکیاں سب سے پہلے ساس کو ٹھکانے لگانے کے چکر میں ہی ہوتی ہیں۔" وہ جوش سے بولی۔

"لیکن آپ فکر کیوں کرتی ہیں دادی! میں ہوں گی آپ کے ساتھ۔ اس لیے تو کہتی ہوں مجھ سے بنا کے رکھا کریں۔" اب کے وہ اترا کر بولی تو دادی کو پتنگے ہی لگ گئے۔

"کمبخت! منہ کے آگے خندق ہے۔ بولے چلی جائے گی۔ تجھے کس نے اجازت دی کہ فیصلے کرتی پھرے۔" دادی نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھا بیٹا! ابھی بھی مجھے کہتی ہے کہ میں تجھ سے اور دانیہ سے زیادہ پیار کرتی ہوں اور اس کی سوتیلی ہوں۔ باتیں سنیں اس کی۔ فضول کی باتیں کروا لو سارا دن یا وہ موا ڈنڈا لے کے چوبیس گھنٹے کھلوا لو۔ ارے وہ بچی بھی تو ہے دانیہ۔۔۔ سارا گھر اس نے سنبھال رکھا ہے۔ منہ میں زبان نہیں ہے اس کے۔"

اتنے میں دانیہ نے کھانے کی ٹرے لا کر آگے رکھی اور اشارے سے شاہ میر سے دادی کے غصے کا سبب دریافت کیا۔

"چھوڑیں دادی! کھانا کھائیں۔ ابھی کھلنڈری ہے ہماری مہو۔ ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی؟" شاہ میر نے دادی کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"اکیس سال کی ہو گئی ہے اس سال۔ میں تو دانیہ کی شادی کے بعد اس کی شادی کا سوچ رہی ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ چھوڑ دیں۔"

"میں نے شادی نہیں کرنی کسی اونگے بونگے سے۔ بس آپ۔" لاپروائی سے پلنگ پر بیٹھی ٹانگیں ہلاتی اور اپنے قصیدے بڑے شوق سے دادی کے منہ سے سن رہی تھی۔ شادی کی بات سنتے ہی بدک پڑی اور نا، نا کرتے کہتی باہر چلی گئی۔

"دیکھے اس کے تیور۔" دادی نے غصے میں شاہ میر کو مخاطب کیا تو وہ تسلی دیتے ہوئے اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر انہیں کھلانے لگا۔

ان ہی گزرتے دنوں میں چھٹیاں گزار کر شاہ میر واپس ہاسٹل چلا گیا تو دانیہ کی ساس اس بار پھر شادی کا تقاضا لیے چلی آئیں۔ دادی نے ابا سے مشورہ کر کے شادی کی تاریخ دے دی اور مہو سب کچھ بھول بھال کر شادی کی تیاریوں میں لگ گئی۔

"باپ کے لاڈ پیار نے یہ حال کر دیا اس کا۔ اب بیچارے شاہو کی قسمت پھوٹے گی۔ پتا نہیں کیسے گزارہ کرے گا میرا بچہ اس فتنے کے ساتھ۔"

دادی کے یہ الفاظ کان میں پڑے تو دانیہ کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی تھی۔ لیکن اسے پتا تھا کہ اس کے بھائی کا دل مہو کی محبت میں سمندروں ایسا وسیع تھا اور محبتوں میں بہت کچھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ غلطیاں بھی اور محبت تو اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ کچھ بھی بدلنے پر قادر ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی مہو اس کے بھائی کی محبت جلد ہی اپنا آپ منوا لے گی۔

☼ ☼ ☼

اس دن اپنے مخصوص آم کے پیڑ کے نیچے وہ اور اس کی دوستوں نے لوڈو کی گیم جمائی ہوئی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ رہائشی کمروں کی جانب آئی تو دادی کے پاس ایک فربہ عورت اور ساتھ ہی نہایت وجیہہ اور خوب صورت نوجوان کو بیٹھے پا کر وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

"مہو! ان سے آ کر ملو یہ تمہاری فرزانہ خالہ اور یہ ان کا بیٹا ہے۔ میری بھانجی ہے یہ۔ شادی کے بعد دبئی چلی گئی تھی۔ اب کافی عرصے بعد پاکستان آئی ہے۔ لاہور میں رہتی ہے۔ یہاں گاؤں میں کسی شادی میں آئی تو بوڑھی خالہ بھی یاد آ گئی اسے۔"

خوشی سے بتاتے بتاتے آخر میں دادی آبدیدہ ہو گئیں۔ جھجکتے ہوئے اس نے اندر قدم رکھا اور کھانے کے خالی برتن اور پھلوں کی ٹوکریوں میں کھائے پھل دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ انہیں آئے کافی دیر ہو چکی تھی اور حسب معمول کھانے پینے کا سارا انتظام دانیہ نے اکیلے کیا تھا۔ اسے بے اختیار اپنی سلیقہ مند اور کم گو سی کزن پر بے اختیار پیار آیا۔ کسی کی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر کے چونک گئی۔

شوخ نگاہوں کے ارتکاز پر وہ خود بے ساختہ نظریں جھکا گئی۔ ابا اور شاہ میر کے بعد پہلا مرد تھا جس کے روبرو وہ بیٹھی تھی۔ اس کی مشہور زمانہ طراری کے غبارے سے ہوا نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔

جلد ہی وہ خالہ سے بے تکلف ہو گئی۔ اس کو ان کی شوخ طبیعت نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جس کمپنی میں ان کا بیٹا ملازم ہے انہوں نے دبئی اور لاہور میں اس کو دو گھر دیے ہوئے ہیں اور جہاں ان کا بیٹا جاتا ہے وہاں وہ بھی جاتی ہیں۔ وہ زیادہ تر دبئی برانچ میں ہوتا تھا تو وہ بھی زیادہ تر دبئی میں ہوتی ہیں۔

جاتے ہوئے اسے خوب بھینچ کر پیار کیا۔ دادی کا ماتھا ٹھنک گیا اور تین روز بعد دادی کے خدشے کو تصدیق کی سند مل گئی۔ جب وہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر دوسری بار ان کے پاس آئیں۔

دادی تو شاہ میر سے اس کی نسبت کا بتا کر فوراً" انکار کرنا چاہ رہی تھیں لیکن دو ٹوک انکار کرنا انہیں مناسب نہ لگا تو اپنے بیٹے اور بچوں سے مشورہ کا کہہ کر بعد میں جواب دینے کا کہا اور اشارے کنائے میں یہ بھی بتا دیا کہ ان کے گھر کا بھی بچہ موجود ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ گھر کی بات گھر میں ہی طے کر لیں۔

شام کو ابا کے گھر آنے پر دادی نے ان کے سامنے بات رکھی تو ابا نے کہا کہ انہوں نے ہمیشہ مہرالنسا کے

لیے شاہ میر کو سوچا ہے لیکن بہتر ہے بچوں کی رائے معلوم کرلی جائے۔ خصوصاً" مہرالنسا کی تاکہ زندگی میں کبھی وہ شکوہ نہ کرسکے کہ ماں کا سایہ سر پہ نہیں تھا تو کسی نے زندگی کے سب سے اہم معاملے میں اس کی رائے نہیں لی۔

اس دن وہ اپنے معمول کے مطابق بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ چونکہ نماز پڑھ کے دوبارہ سو جاتی تھی تو دوبارہ تقریباً" دس بجے بیدار ہوتی۔ ناشتا اس کو تازہ چاہیے ہوتا اور دانیہ بھٹری سب کی فرمائشیں بجالانے پر مامور سو ہر کام چھوڑ کر پہلے اس کے لیے ناشتا بنا کر لے آتی اگرچہ اس بات پر بھی دادی بہت برا بھلا کہتی تھیں پر اس نے اور کون سی باتوں پر توجہ دی تھی جو اس بات پر دیتی۔ لیکن دادی کے پاس آکر بیٹھنے سے ماتھا ٹھنک گیا۔ بہت سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کون سی تازہ ترین واردات سرزد ہو گئی ہے اس سے جو دادی تشریف لے آئی ہیں۔ یہ یاد نہ آسکا کیونکہ بیدار ہونے کے بعد پہلا کام وہ ناشتا ہی کر رہی تھی۔

لسی کا گلاس خالی کرکے رکھا اور بغور دادی کی طرف دیکھنے لگی جو اسے کچھ الجھی ہوئی دکھائی دیں۔

"کیا بات ہے دادی! خیر تو ہے ناں؟" اس کا تشویشی انداز دادی کو چونکا دیا۔

"ہاں خیر ہے۔ تم ذرا سکون سے بیٹھو۔ ایک بات کرنی ہے تم سے۔" انہوں نے تمہید باندھی تو مہو بھی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"تمہیں پتا ہے اگلے ماہ دانیہ کی شادی ہے تو ہم نے سوچا ہے شاہو کی دلہن بھی گھر لے آئیں۔ تمہیں شاید نہ پتا ہو کہ میں نے اور تمہارے ابا نے شاہو کی دلہن کے طور پر بہت پہلے تمہیں چن رکھا ہے۔ ہم دانیہ کی شادی کے ساتھ ہی تمہاری اور شاہو کی شادی بھی کردیتے ہیں۔ چونکہ تمہاری کہیں نسبت کا اعلان نہیں کیا تھا تو ایک دو جگہوں سے تمہارا رشتہ بھی لے کے آئے کچھ لوگ۔ ایک دو گاؤں کے عزیز ہیں۔ دوسری فرزانہ میری بھانجی جو اس دن اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا بھی بڑا اصرار ہے تمہارے لیے۔

ہم نے سوچا تمہارا عندیہ لے لیں تو اگلے ہفتے کی تاریخ پکی کردیتے ہیں تاکہ جب لوگوں کو اس نسبت کا پتا چلے گا تو رشتوں کا یہ سلسلہ بھی بند ہو جائے گا اور میں بھی جلد اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھ لوں گی۔ عمر ایسی ہے کہ ہر دم بلاوے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جانا تو ہے پر تم لوگوں کو خوش دیکھ جاؤں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں مانگا اس سوہنے رب سے میں نے۔" انکشافات کی پٹاری اس کے سامنے کھول کر آخر میں دادی آبدیدہ ہو گئیں تو انہیں اشک بار دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔

"ارے' ارے آپ روئیں مت۔ آپ کو پتا ہے میں کسی کو روتے دیکھوں تو مجھے بھی فوراً" رونا آجاتا ہے۔" اس کی آواز میں نمی محسوس کرکے دادی نے جھٹ اپنے آنسو صاف کرلیے۔

"اچھا اب بتا تیری کیا رائے ہے؟" دادی اپنا متوقع جواب سننے کے لیے بے تاب ہوئیں۔

"آپ..... آپ فرزانہ خالہ کو ہاں کردیں۔" اس کا جواب پاس بیٹھی دادی اور اندر آتی دانیہ کو ساکت کر گیا۔

"اور..... اور شاہو کا کیا ہو گا؟" دادی کی سرسراتی آواز پر وہ چونکی۔

"شاہو کے لیے اچھی سی لڑکی میں خود پسند کروں گی۔"

"وہ اچھی لڑکی تو نہیں ہو سکتی مہرالنسا؟" دادی کی کانپتی آواز میں عزیز پوتے کے ادھورے خواب کی کرچیاں بول اٹھی تھیں۔

"میں نے کبھی شاہو کے لیے اس انداز میں نہیں سوچا۔"

"وہ تجھے پسند کرتا ہے مہرالنسا!" دادی کی آس بھری نظروں پر وہ نگاہیں چرا گئی۔

"آپ کو اپنے پوتے کی پسند تو پتا چل گئی دادی! میری کیوں نہیں؟" اب کی بار دادی نے چونک کر اسے دیکھا بھیگی آنکھوں میں کسی کی محبت صاف رقم تھی۔

"مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا لگا تھا' پر میں جو ساری زندگی شادی نام کی شے سے چڑتی آتی ہوں۔ میرے تمام دعوے ریت کی دیوار ثابت ہوئے لیکن میں نے اس بات کو اپنی وقتی پسندیدگی کہہ کر دل میں دبا لیا تھا پر اب اگر تقدیر نے اسے میرے سامنے لا کھڑا کیا ہے تو ضرور اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہوگی۔" آہستگی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی دادی کو اپنا حال دل سنائے گئی تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگا لیا اور پیشانی چوم کر کہا تو صرف اتنا کہ "میرے لیے دانیہ شاہو اور تم..... تینوں برابر ہو۔ بے فکر رہو۔ تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔" دل گرفتہ سی دادی اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔ جبکہ دانیہ دروازے سے ہی واپس پلٹ گئی۔

اپنے بھائی کی خاموش محبت کے ادھورے رہ جانے کا غم اس کا دل کاٹے دے رہا تھا۔ دادی نے فون کروا کے شاہو کو ارجنٹ بلوایا تھا۔ وہ پریشان ہو کر بھاگا چلا آیا اور جب دادی کی زبانی ساری صورت حال پتا چلی تو تقدیر کے اس فیصلے پر اس کا دل رو اٹھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے دادی کو وہاں ہاں کر دینے کو کہا تھا جہاں مہو چاہتی تھی۔ جبکہ دانیہ اس بات پر اس سے خوب لڑی تھی۔

"تم تو لڑے بغیر ہی ہار رہے ہو بھائی! ایسا مت کرو۔ ایک بار تو اپنا دل کھول کے اسے دکھاؤ۔" وہ سسک ہی اٹھی۔

"تیرا بھائی اتنا کمزور نہیں ہے دانی! کہ محبت جیسی نعمت بھی بھیک کی طرح لے۔ شاید میرے جذبوں میں ہی کھوٹ ہو گا' جو وہ ان کو ایک دفعہ بھی محسوس نہ کر پائی۔ آج کے بعد یہ بات زبان پر مت لانا۔ دعا کرنا وہ ہمیشہ خوش رہے۔"

دانیہ کا سر تھپتھپا کر وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ شادی کے معاملات اس قدر تیزی سے طے ہوئے کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ حالانکہ مہرالنسا نے ضد بھی کی تھی کہ دانیہ کی شادی اس سے کچھ دن پہلے ہو تاکہ وہ شادی کو ٹھیک طرح سے انجوائے کرسکے لیکن اس کی ہونے والی ساس کا اصرار تھا کہ بہو کو ساتھ لے کر جانا ہے دبئی۔ سو ایک دن کے وقفے سے دانیہ اور مہرالنسا کی شادی طے ہوئی اور دونوں لڑکیاں دل میں مختلف خدشات و خیالات لیے پیا سنگ سدھار گئیں۔

دانیہ کو نئے گھر جانے کی خوشی تھی تو بھائی کی ادھوری رہ جانے والی محبت کا غم بھی تھا۔ دادی اور چچا سے الگ ہونے کی فکر بھی تھی۔ پہلے تو جب بھی اپنی وداعی کا خیال آتا' یہ خیال مطمئن کر جاتا کہ پیچھے مہو ہو گی تو اسے دادی اور چچا کی فکر نہیں رہے گی۔ پر مہرالنسا کے خیالات اس سے جدا تھے۔ وہ نئی نئی محبتوں کے خمار میں تھی۔ شوہر کی وارفتہ نگاہیں شرم سے گلنار کیے دے رہی تھیں تو ساس کا والہانہ انداز سرشار کیے دے رہا تھا۔ اتنا کہ وہ پچھلوں کو بھلائے بیٹھی تھی۔

دنیا کی کوئی بھی یونیورسٹی آپ کو وہ سبق نہیں پڑھاتی' جو زندگی کے نصاب میں درج ہوتے ہیں۔ مہرالنسا جس کے لیے زندگی حقیقتاً" پھولوں کی سیج تھی۔ جس میں محبتیں تھیں' پیار تھا دل میں ہزاروں ارمان لیے وہ غنی اور اس کی ماں کے سنگ پہلے لاہور والے گھر میں آئی تھی۔ گھر میں اس کی ساس کے کچھ رشتہ دار بھی تھے۔ اسے ایک کمرے میں لاکر بٹھایا گیا جو معمولی سامان سے آراستہ تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ ایک اعلیٰ کمپنی میں اعلیٰ عہدہ رکھنے والے دبئی پلٹ کا گھر ہے۔ اس کا سامان تو اس کی ساس نے یہ کہہ کر لینے ہی نہ دیا تھا کہ کمپنی کی جانب سے غنی کو فرنشڈ گھر ملا ہے۔ اگر وہ لوگ کچھ دینا بھی چاہتے ہیں تو اپنی بیٹی کو کیش دے دیں۔ ابا نے شاہ میر سے مشورہ کرنے کے بعد ایسا ہی کیا تھا۔ وہ چیک اس وقت اس کے پرس میں موجود تھا۔

انتظار کی گھڑیاں طویل ہونے پر اس نے اپنی کمر کو تختہ بنے محسوس کیا۔ دفعتاً" اس کی ساس کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

"تم اگر اس انتظار میں ہو کہ دولہا تمہارے پاس آئے گا تو اس بھول میں مت بیٹھی رہو کیونکہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب تک گھر میں ایک بھی مہمان

رہے۔ دولہا دلہن والے کمرے میں نہیں آتا۔"
مہرالنسا کے لیے نہ تو بات عام تھی نہ لہجہ عام تھا۔ خالہ کا پیار جتاتا انداز مفقود تھا بلکہ مہرالنسا کو ان کے لہجے سے عجیب سی تحقیر کا احساس ہوا ـــــ مگر اس وقت کیا کہتی۔ خاموش ہو رہی۔

"اور وہ جو چیک تمہارے ابا نے دیا ہے وہ تو مجھے دے دو۔ گھر بھرا پڑا ہے مہمانوں سے کسی کی نیت کی کیا خبر کب بدل جائے۔ میں سنبھال کر رکھ لوں گی۔ کل کلاں کو تمہارے ہی کام آنا ہے وہ گھر کو سجانے سنوارنے کے لیے۔" وہ دروازے سے دوبارہ پلٹ آئیں۔

اسے ان کی یہ بات پہلی بات سے کہیں زیادہ کھٹکی پر اپنے گھر کے خوش کن احساس نے کسی ناگوار احساس کو سر نہ اٹھانے دیا اور پرس کھول کر چیک ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ویسے بھی غنی کے علاوہ اور ہے کون ان کا اس نے سوچا۔ اتنی دیر میں اس کی ساس دروازہ بند کر کے جا چکی تھیں۔ آئینے میں اپنا سراپا دیکھتے ہوئے کتنے ہی آنسو بے اختیار ہو کر پلکوں کی باڑ توڑ کر چلے آئے۔ اس نے کبھی سجنے سنورنے کی طرف دھیان نہیں دیا تھا پر آج جس کے لیے اس نے اپنا پور پور سجایا تھا۔ وہ اس کے پاس نہیں تھا اس کے حسن کو سراہنے کے لیے۔

کتنی دیر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کے بعد تھکے تھکے انداز میں اس نے اپنا عروسی لباس تبدیل کیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ بھلا اس وقت گاؤں کے اس آنگن میں بسنے والے اس سے محبت کرنے والے کیا کر رہے ہوں گے۔ ابا دادی ـــ اور شاہو۔

"سچ سچ بتانا مہو ـــ کیا کبھی بھی تمہیں شاہو کی آنکھوں میں وہ محبت نظر نہیں آئی۔ جو اس نے پتا نہیں کب سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ میں چاچا دادی ـــ ہم سب سے کبھی شاہو نے اس حوالے سے کچھ نہیں کہا پر ہمیں اس کی آنکھوں میں محبت کے دیپ جلتے نظر آ گئے۔ اور جس کے لیے اس نے محبت کے خزانے سینت سینت کر رکھے کسی متاع کی طرح اس کو پتا چلتا تو ایک طرف احساس ہی نہ ہو۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔"

شادی سے محض تین دن پہلے دانیہ کی کہی گئی باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ اسے ایک دم شدید پیاس اور گھٹن کا احساس ہوا جیسے گلے میں ہزاروں کانٹے اگ آئے ہوں۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"نہ دانیہ پتر! میرے شاہو کے لیے بھی دیکھنا میرے اللہ نے کہیں ڈھیر ساری خوشیاں سنبھال رکھی ہوں گی۔ وقت آنے پر میرا سوہنا رب اس کو بھی خالی ہاتھ نہیں رکھے گا۔ محبت کسی کے کہنے سننے سے تھوڑی کی جاتی ہے بچے! یہ تو دل کی بنجر زمین پر خود بخود پھوٹ پڑتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بنجر ٹکڑا لہلہاتی فصل میں بدل جاتا ہے۔ اللہ سوہنا میری پتری مہرالنسا کا نصیب بھی اس کی صورت جیسا سوہنا کرے۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ اپنی بہن کو دعاؤں کا تحفہ دے کے رخصت کر میرے بچے!"

اسی پل اسے دادی کا اندر آ کر دانیہ کو ٹوک دینا بہت کچھ سمجھا گیا تھا پر وہ اپنے ضدی دل کا کیا کرتی جس نے ہمیشہ اپنی من مانی کی تھی۔ محبت بھرے دلوں کو چھوڑ کر اسیر ہوا بھی تو کس کا۔ محض ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک اجنبی کا جواب اسے اجنبی نہ لگتا تھا۔

اسی سوتی جاگتی کیفیت میں پتا نہیں کب اسے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے اپنے گرد عورتوں کا جم غفیر دیکھا جو اس کی ساس کی سسرالی عزیز تھیں اور دلہن کو اچھی طرح دیکھنے کی چاہ میں جمع تھیں۔ ان میں سے بقول ایک عورت کے دلہن بنے تو ہر لڑکی خوب صورت لگتی ہے۔ اصل میں کسی کی صورت کو پرکھنا ہو تو میک اپ کے بغیر دیکھو۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی سائیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر سر پر ڈالا۔

"بہو تو بڑی ڈھونڈ کر لائی ہے۔"

ایک عورت نے توصیفی انداز میں کہا تو اکثریت نے تائید میں سر ہلایا۔ کئی طرح کے جملے کانوں میں پڑے جو اس کے حسن کی شان میں تھے پر جس سے وہ سننا چاہ رہی تھی اس کو کل سے اس نے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ معاً ایک عورت جو اس کی ساس کی شاید جیٹھانی تھی ناشتا لے آئی۔ اسے واش روم جانے کی تاکید کر کے باقی لوگوں کو کھانے کے لیے بلا کر لے گئی تو فریش ہو کر آنے کے بعد اس نے کمرا خالی دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

"ارے اکیلے اکیلے ہی ناشتا کیا جا رہا ہے۔ دولہا بھائی کہاں ہیں۔"

چائے پیتی مہرالنسا ایک دم چونک کر مڑی تو دروازے میں دانیہ کو کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ وہ بھاگ کر اس سے ایسے گلے ملی جیسے صدیوں سے بچھڑی ہو۔

"دادی کہاں ہیں؟" رندھی آواز میں پوچھا۔

"دادی تو نہیں آ سکیں۔ اتنا لمبا سفر کہاں کر سکتی ہیں وہ پر تمہارے لیے بہت سا پیار اور دعائیں بھیجی ہیں۔ میں چاچا شاہو اور وہ آئے ہیں۔"

دانیہ کو شاد مطمئن اور کھلا کھلا دیکھ کر اسے یاد آیا کہ ان کی شادی ایک دو دن کے وقفے سے ہوئی تھی۔ دانیہ کا پور پور کسی کی چاہت میں بھیگا نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاس سنانے کو بے تحاشا قصے تھے اور پوچھنے کو ہزار باتیں۔ اس کی شوہر کی والہانہ محبت کے قصے سن کر وہ اسے اپنے حوالے سے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پائی۔ اتنے میں دو تین عورتوں کے ساتھ بیوٹیشن اسے تیار کرنے چلی آئی۔ تیار ہونے کے بعد دانیہ ابا اور شاہو کو اس سے ملوانے لے آئی۔ ابا سے ملتے ہوئے کئی گرم گرم آنسو نکل کر چہرہ بھگوتے چلے گئے۔

"کیسی ہو مہو؟" شاہو کا نرمی سے پوچھا گیا سوال اسے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر گیا پر اس کی آنکھوں کا وہی نرم سا تاثر چہرے پر ہمیشہ کی طرح بھلی مسکراہٹ۔

"ٹھیک ہوں۔" آہستہ سے کہہ کر وہ ابا سے الگ ہوئی۔ بہت سی دعائیں دینے کے بعد ابا اور شاہو دوبارہ مردانے میں چلے گئے۔

کل صبح کی ان کی دبئی کے لیے فلائٹ تھی۔ سو فنکشن ختم ہونے کے بعد جب وہ لوگ روانہ ہونے لگے تو اس کا ضدی دل ہمک ہمک کر اسی آنگن میں دوبارہ جانے کی ضد کرنے لگا جہاں عمر کے اکیس سال سب کی محبتوں کی چھاؤں میں گزارے تھے۔

پورے ایک دن بعد اس نے غنی کو دیکھا تھا جب دانیہ نے اسے بہت زیادہ اصرار سے بلوایا تھا۔ ان کے ہاں ولیمہ پر دولہا مردانے میں اور دلہن زنان خانے میں ہوتی تھی۔ اسے اس قدر سجے سنورے دیکھ کر وہ مبہوت ہی رہ گیا پر دانیہ کا خیال کر کے اس سے بمشکل دھیان ہٹا پایا۔

ابا لوگوں کے روانہ ہونے کی دیر تھی کہ غنی جو ابھی بیٹھ کر کمر بھی سیدھی نہ کرنے پایا تھا کہ باہر سے پیغام آ گیا کہ کچھ دوست بلا رہے تھے۔ ایک بھرپور نظر اس پر ڈال کر وہ اس سے کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا کہ پیغام لانے والی جو بھی تھی وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک وہ باہر نہ نکل گیا۔

مہمانوں کی اکثریت شام کو ولیمہ ختم ہونے پر چلی گئی جو اکا دکا لوگ باقی تھے ان کا کل ان لوگوں کے ساتھ ہی نکلنے کا پروگرام تھا وہ جو غنی کے حوالے سے کتنے خواب سجائے بیٹھی تھی دبئی آنے پر وہ سارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔

اس کی آج تک یہ سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اس کی ساس نے یہ سب کچھ کرنا تھا تو اسے بیاہ کر کیوں لائی تھی۔ غنی جس کو ایک نظر دیکھ کر وہ اس کی اسیر ہو گئی تھی ایک ایسا کاٹھ کا الو ثابت ہوا تھا جس کی ڈور اس کی ماں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں دیکھتا اور نظر انداز کر دیتا۔ کبھی کبھار ان زیادتیوں میں خود بھی شریک ہو جاتا۔

دادی ابا اور دانیہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ جو تحائف بھیجتے وہ اسے کبھی برتنا نصیب نہ ہو سکے تھے۔ اس کی ساس نے اس کے گھر والوں کو جو لارا لگایا تھا کہ وہ لوگ کچھ عرصہ دبئی کچھ عرصہ لاہور میں ہوتے ہیں سب جھوٹ تھا اس ایک سال میں اس نے دبئی کی فضا تک کو محسوس نہ کیا تھا۔ دس ماہ کے اس عرصہ میں

لیا سے فقط تین بار اس کی بات ہوئی تھی۔

اپنے گھر میں ایک سالن اپنی پسند سے نہ پکنے پر تماشا کھڑا کر دینے والی مہرالنسا کو سمجھ میں نہ آئی کہ وہ ان لوگوں کی زیادتیوں پر چپ تھی تو کیوں۔ شاید وہ اس دکھ کا ازالہ کرنا چاہتی تھی جو شاہو سے شادی کے انکار کی صورت میں دیا تھا۔ اس نے معاشی تنگی، بے رخی، طعنے ہر چیز برداشت کی تھی، پر کل جو اس کی ساس نے کیا تھا وہ، وہ برداشت نہ کر پا رہی تھی۔ اس کی ساس نے اس کی کمزوری دور کرنے کی جو دوا لا کر دی تھی، وہ کھا کر تین گھنٹے بعد درد و اذیت کا جو صحرا اس نے عبور کیا تھا، وہ ایک طرف، اس انکشاف نے ہی اس کی پوری ہستی کو ہلا ڈالا کہ اس کی ساس نے اس کی کوکھ اجاڑ دی۔

اسے کبھی پتا نہ چلتا، اگر وہ ماں بیٹے کی گفتگو نہ سن لیتی، جو اسی کے حوالے سے تھی۔

"یہ کیا کیا اماں! آپ نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ اگر یہ مر مرا جاتی تو پتا ہے نا یہ پاکستان نہیں ہے۔ جہاں کوئی کسی کے ساتھ کچھ بھی کر ڈالے کوئی پوچھنے والا نہیں یہاں تو پولیس کو بھنک بھی مل گئی تو فوراً" دھر لیں گے ہم دونوں کو۔"

غنی کی بات سن کر وہ ایک دم دروازے کے اور قریب ہوئی۔

"ارے تو پیدا ہونے دیتی وہ سانپ کا بچہ۔ فکر مت کرو، ابھی ابتدائی ایام تھے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ بڑی ڈھیٹ ہے۔ میرے تو سینے کی آگ ہی تب ٹھنڈی ہو گی، جب اسے اس حال میں بھیجوں گی اس کے باپ کے پاس کہ پہچان نہیں پائے گا اپنی لاڈلی کو۔ برسوں سے ٹھکرائے جانے کی جو آگ جل رہی ہے نا میرے اندر تو نہیں سمجھ سکتا۔ ان پڑھ گنوار کہہ کر ٹھکرایا اس کے باپ نے مجھے اور لے آیا پڑھی لکھی ناگن۔ اب دیکھے گا اس کی پڑھی لکھی نازک بیٹی کا یہ ان پڑھ گنوار کرتی کیا ہے؟"

اپنی ساس کی زہریلی آواز اور تنفر بھرا لہجہ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ جسم میں جیسے جان ہی نہ رہی۔

"میں تو کہتا ہوں اماں! مکاؤ یہ ٹنٹا۔ اگلے مہینے ثمینہ آ رہی ہے امریکا سے۔ اس نے اور اس کے باپ نے تو جان کھا لینی ہے ہماری۔ پکڑ کے سیدھا پولیس میں دے دیں گے کہ دوسری شادی کی اجازت کس نے دی۔ آپ کو پتا بھی ہے، یہ نوکری، یہ ٹھاٹ باٹ میرے سسر کی وجہ سے ہیں۔ پہلے تو چلو باپ کی بیماری کی وجہ سے وہ وہیں تھی نامعلوم عرصہ کے لیے مگر اب انکل کی طبیعت ٹھیک ہے۔ آج ہی ثمینہ کا فون آیا تھا۔"

غنی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس سے زیادہ سننے کا مہرالنسا میں یارا نہ رہا تو وہ تیورا کر نیچے آ رہی۔

☼ ☼ ☼

ہادی کو اٹھائے وہ باہر آیا۔ آم کے گھنے پیڑ کے نیچے اپنی مخصوص جگہ پر وہ اسے بیٹھی دکھائی دی۔

"لو بھئی۔ وہ رہیں آپ کی ماما!" اس نے ہادی کو گود سے نیچے اتارا تو وہ بھاگتا ہو پیچھے سے اس سے لپٹ گیا۔ اس کی جنت مکمل تھی۔ پر اسے یہ جنت بہت دعاؤں کے بعد ملی تھی اور اب وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

طلاق کے کاغذات ہاتھ میں لیے اجڑی بکھری مہرالنسا جب نیم پاگلوں کی سی حالت میں ان کے پاس پہنچی تھی۔ دادی تو یہ دکھ برداشت ہی نہ کر پائیں اور اسی دکھ کو لیے دنیا سے چلی گئیں۔ یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو ان کے خاندان کو جھیلنا پڑا تھا۔

مہو کی ذہنی حالت مہینوں ایسے ہی رہی۔ ابا اس کے غم سے بیمار رہنے لگے تھے۔ انہیں احساس جرم ستاتا کہ ان کی بیٹی کی حالت کی وجہ وہی ہیں۔ نہ وہ جوانی میں اپنی منگیتر (مہو کی ساس) کو ٹھکراتے نہ یہ ہوتا۔ پر کاتب تقدیر نے سب کچھ یونہی لکھا تھا۔ دانیہ اپنا گھر بار چھوڑ کے اس کے سرہانے بیٹھ گئی تھی ان بہن بھائیوں کی محبت اسے پھر دنیا کی طرف کھینچ لائی اور وہ ایک بار پھر ان کی مقروض ہو گئی تھی۔

"میں نے ایک بار دیر کی تھی مہو! پر اب کی بار میں اپنی قسمت خود آزمانا چاہتا تھا۔ میں لمبے چوڑے دعوے نہیں کروں گا، پر محبتوں کے سفر میں میں نے ہمیشہ تمہارے سنگ چلنا چاہا تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس ایک رشتے کے جڑنے سے باقی رشتے ختم نہیں ہونے دوں گا۔ زندگی کے ہر دکھ سکھ میں تمہارا دوست پہلے اور شوہر بعد میں ہوں گا۔"

"میں تمہارے قابل نہیں ہوں شاہو!" ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ رو دی تھی۔

"تم کس قابل ہو، یہ میں اور میرا دل جانتا ہے۔" وہ نرمی سے اس کے ہاتھ تھام کر مسکرایا۔ "پر اس بار جیتوں گا میں ہی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے اور ایک بات اور..." وہ کچھ رک کے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"انکار کرنے سے پہلے ایک بار دادی کے خواب کی تعبیر، تمہیں اور مجھے ساتھ دیکھنے کی تھی۔ چاچا کی بیمار آنکھوں میں مچلتی حسرت، جو تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہیں... ضرور یاد کر لینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ پھر زندگی میں کبھی میری شکل نہیں دیکھ پاؤ گی۔"

"نہیں نہیں شاہو! مجھے چھوڑ کے مت جانا۔ میں بہت اکیلی ہوں۔"

اس کی آخری بات اسے ہولا گئی تھی۔ گزرتے دنوں نے ابا کی وفات کا غم بھی ان کی جھولی میں ڈالا مگر وہ مطمئن ہو کر اس دنیا سے سدھارے تھے۔ اپنی لاڈلی کو شاہ میر کے سنگ خوش دیکھ کر وہ ان کی دائمی خوشیوں کی دعائیں کرتے چلے گئے۔

دانیہ اکثر آتی رہتی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ مہو جو کبھی کلنڈری، منڈا ماہی ٹائپ لڑکی ہوتی تھی۔ ایسے بدلی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے تھے۔ وہ سرتاپا شاہ میر کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ کبھی کبھار گزرتے دنوں کی ناگوار یادیں ستاتیں تو وہ اپنی پسندیدہ جگہ پر جا بیٹھتی مگر جب دو تین گھنٹے بعد وہاں سے اٹھتی شاہ میر کی ہنستی مسکراتی مہو ہوتی۔

ہادی کی کھلکھلانے کی آواز پر شاہ میر چونکا پھر بھرپور انداز میں مسکرا دیا۔ ہادی مہو کے دوپٹے کا پلو پکڑے پتا نہیں کیا کیا باتیں کر رہا تھا کہ مہو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کی الوہی چمک شاہ میر کو یہاں تک محسوس ہوئی تھی۔ قریب آنے پر اس نے لپک کر ہادی کو گود میں اٹھایا، مہو کا ہاتھ تھاما اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☼

آمنہ ریاض

ماہِ تمام

باقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت ہڈ حرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساہر کو اس سے شدید جلن ہے وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے ساہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساہر پر لگا دیا کہ ساہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر، ساہر کو دو تھپڑ مار دیتا ہے۔ ساہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور ساہر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف کر دیتے ہیں مگر ساہر شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود۔ جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوا دیتی ہے۔

کاسٹنگ ڈائریکٹر جاثم ۔۔۔۔۔ تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں، جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔

—٦—
چھٹی قسط

"میں نے کہا تھا نا، میں تمہارا اتنا اعلا پورٹ فولیو بناؤں گی کہ بڑے بڑے پروفیشنلز بھی حیران رہ جائیں گے۔"

مہک اپنی کارکردگی سے بہت خوش تھی۔ خوش تو تقی بھی تھا۔ مہک نے واقعی بہت اچھا پورٹ فولیو بنایا تھا۔ جاثم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ بہت پروفیشنل انداز میں کام کرتی تھی۔ بلکہ اسے فوٹو گرافی پر عبور حاصل تھا۔ تقی جانتا تھا، وہ ہینڈسم ہے۔ لیکن اتنا زیادہ ہے، یہ آج تک اسے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔

"میں تو کہتا ہوں ان ہی تصویروں میں سے کوئی ایک بردکھوے کے لیے بھجوا دینا۔" سمیر نے تصویریں دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا تھا۔ اس وقت تو ہنسی مذاق میں بات ٹل گئی، لیکن اب کچھ روز سے تقی سوچ رہا تھا، شاید بردکھوے کے لیے تصویر بھجوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ممکن ہے اسے بنفس نفیس جانا پڑے۔ مہک کئی بار اسے گھر آنے کی دعوت دے چکی تھی۔

یہ خیال آتے ہی تقی نے غیر ارادی طور پر مہک کو دیکھا۔ وہ ابھی تک بڑے انہماک اور جوش کے ساتھ اپنے آئی فون پر اس کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ اس کی خواہش میں مبتلا نہ ہونا اپنے بس کی بات ہی نہ تھی۔

"تم کیا کھاؤ گی؟ میں لے آؤں؟" وہ دونوں ایک مشہور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں آئے ہوئے تھے۔ یہاں چونکہ سیلف سروس تھی۔ اس لیے تقی پوچھ رہا تھا۔ مہک نے بتایا تو وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ مہک نے گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نیلی جینز پر کالے رنگ کی ہاف سلیوز ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں اس کے کالی کھیڑی تھی، جو وہ اکثر پہنے ہوتا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا۔ مہک ارسلان جیسی دلکش لڑکی کے ساتھ باہر آتے ہوئے بھی اس نے کوئی خاص تیاری کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ تقی کاؤنٹر کے پاس کھڑا لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور مہک اسے دیکھ رہی تھی۔

ان چند دنوں میں پورٹ فولیو تو جو بنا سو بنا، اس دوران ان دونوں کے مابین بڑی اچھی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

مہک نے کئی بار سوچا۔ لیکن ہر بار وہ فیصلہ کرنے سے رہ جاتی تھی کہ وہ کون سی چیز ہے، جو اس کے دل کو تقی کی طرف کھینچ رہی ہے۔ کیا اچھی شکل؟ نہیں یہ کوئی ایسی خصوصیت نہیں کہ مہک جیسی لڑکی دل کو ہارا ہوا محسوس کرے۔ وہ خود بھی کم خوب صورت نہیں تھی۔ پھر جتنے امیر باپ کی وہ بیٹی تھی، ایک سے ایک اچھی شکل والا اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔

پھر شاید تقی کی بذلہ سنجی۔۔۔۔ اس کا اعلا اخلاق؟

اس نے کئی بار اپنے دل سے کسوٹی کھیلی تھی اور ہر بار بس یہی نتیجہ نکال پائی تھی کہ تقی ان لوگوں میں سے ہے، جو جانے انجانے دوسروں کو اپنی محبت میں مبتلا کر جاتے ہیں۔

"تقی! میں سوچ رہی تھی، تمہارے پورٹ فولیو کو مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیز میں بھجواتا ہوں۔" تقی واپس آیا تو مہک نے اس سے کہا۔

"کیا فائدہ؟" تقی نے زنگر برگر کا بڑا سا نوالہ لینے کے لیے پر تولتے ہوئے بری سی شکل بنا کر کہا۔ "وہاں سے کوئی نہ کوئی آفر آجائے گی۔ جسے میں ابا کے ڈر سے قبول نہیں کر سکوں گا اور میری حسرتوں کی لسٹ میں ایک اور حسرت کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ یہ کام نہ ہی کیا جائے۔"

"تم کتنے کانفیڈنٹ ہو۔ جیسے آفر آہی جائے گی۔" مہک نے اسے چڑانے کی غرض سے کہا۔

تقی ہنس دیا۔ لیکن کہا کچھ نہیں کہ وہ دونوں ہی جانتے تھے، تقی کا پورٹ فولیو جس بھی ایجنسی میں بھجوایا جائے گا، وہاں سے آفر ضرور آئے گی۔

"ابا کا ڈر درست سہی، لیکن میرا خیال ہے کہ برائٹ فیوچر کے لیے تمہیں یہ اسٹیپ تو لینا ہی پڑے گا۔" چند منٹ بعد مہک نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"دعا کرو، مجھے اچھی نوکری مل جائے۔ ابا کا لائق فائق بیٹا بن کر دکھاؤں تو انہیں میرے شوبز جوائن کرنے پر اعتراض نہیں ہوگا۔ یقیناً۔۔۔ شاید۔۔۔ پتا نہیں۔" وہ اس معاملے میں خود بہت کنفیوز تھا۔ بقول امی، ساری زندگی لودھی صاحب کے ساتھ گزار لینے کے باوجود وہ ابھی تک ان کے بارے میں کوئی درست پیشن گوئی نہیں کر سکتی تھیں تو تقی کو تو ابھی دنیا میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے۔

مہک ہنسنے لگی۔

"اچھا۔۔۔ میرے ڈیڈی سے کب ملو گے؟"

"میں ان سے مل کر کیا کروں گا؟" تقی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"انہیں بھی ایکٹنگ کا بہت شوق تھا۔ ڈیڈی کہتے ہیں۔ انہوں نے بہت بار آڈیشن بھی دیا۔ لیکن کوئی بھی اپنی فلم ان کی ناقص ایکٹنگ کی وجہ سے فلاپ کروانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے پاکستانی فلم انڈسٹری کو ایک عظیم اداکار ملنے سے رہ گیا۔" مہک نے بڑے دلچسپ انداز میں بتایا۔

"میں چاہتی ہوں، مستقبل کا ایک عظیم اداکار ان سے ضرور مل لے۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"کیا تم مجھے صرف اسی لیے ان سے ملوانا چاہتی ہو؟" تقی گو کہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن پر سوچ نظروں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

"نہیں۔" مہک کی مسکراہٹ بہت خاص تھی۔

"دیر از سم اسپیشل ریزن۔"

اب کی بار تقی بھی کھل کر مسکرایا۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے پروپوز کر رہی ہو؟"

اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"ہرگز نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے زور دے کر بولی۔ "لڑکیاں پروپوز کرتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔ پروپوز تو تم ہی کرو گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن کیا تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟"

"نہیں! کھانا بنانا تو نہیں آتا۔"

"اوہ۔۔۔" اسے مایوسی ہوئی۔ "مجھے کھانا کھانے کا

بہت شوق ہے۔ اس لیے میری بیوی کو کھانا بنانا ضرور آنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ بہت اعلا قسم کی بریانی' کٹاکٹ اور پائے بنائے گی تو میری اس سے محبت میں بے تحاشا اضافہ ہو گا۔" اس نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔

"یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں کھانا بنانا سیکھ لوں گی۔"

"اچھی طرح سوچ لو میڈم! مجھے کھانا کھانے کا جتنا شوق ہے' میں اپنے کھانے پینے کے معاملے میں اتنا سیلیکٹو بھی ہوں۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہرگز نہیں ہو گا۔" تقی نے اسے ڈرایا۔

"یہ سوچنا تمہارا نہیں' میرا کام ہے کہ تمہارے ساتھ زندگی آسان ہو گی یا نہیں۔ البتہ کھانا بنانا میں سیکھ لوں گی۔" وہ بہت پراعتماد تھی۔

ایک تعلق جو بہت خاموشی سے ان دونوں کے درمیان اپنی جگہ بنا رہا تھا' لفظوں میں ڈھل کر مضبوط ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
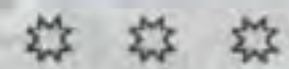
ساہر کا بس نہیں چل رہا تھا۔ خوشی سے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے۔

"تقی! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ اتنے سالوں کے بعد۔ اور تم کتنے ہینڈسم ہو گئے ہو۔"

"ہو گئے ہو سے کیا مراد ہے؟" تقی نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ "تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ میں اور زیادہ ہینڈسم ہو گیا ہوں یا یہ کہ میری وجاہت کو چار چاند لگ چکے ہیں۔ کیونکہ میں تو پہلے بھی ہینڈسم ہی تھا۔ البتہ تمہیں دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ کوجی تو تم پہلے بھی تھیں۔ اب تو موٹی اور بھدی بھی ہو گئی ہو۔" اس نے جتنی سنجیدگی اور مایوسی سے کہا تھا' اتنا ہی بے ساختہ عمیر کا قہقہہ تھا۔

"اس بات پر آپ بہت خوش ہوئے ہیں عمیر بھائی! میرا خیال ہے اتنا سچ بولنے کی ہمت آپ ساری زندگی نہیں کر سکتے تھے۔" وہ شرارت پر آمادہ تھا۔

"اسی لیے تو خوش ہو رہا ہوں کہ کوئی تو ہے' جو میرے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔"

"اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ساہر نے آپ پر کپتی بیویوں کی طرح رعب بہت رکھا ہوا ہے کہ آپ اپنے دل کی بات نہیں کہہ پاتے یا پھر یہ کہ آپ بھی اس کی بدصورتی سے خائف ہو کر زبان بند رکھتے ہیں۔"

"بس بھائی! کیا بتاؤں تمہیں... ہم تو دونوں طرح سے ہی پھنسے ہوئے ہیں۔" عمیر نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اب ٹھنڈی آہیں نہ بھریں۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی تو آپ نے خود ہی ماری ہے۔" تقی کی اس بات پر تو ساہر نے اسے کشن ہی کھینچ مارا۔ تقی نے لیکن اس کی ذرا پروا نہ کی۔

"ہاں! تو میں جھوٹ تھوڑا ہی بول رہا ہوں۔ محبت کی شادی میں یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ پھر آپ کسی دوسرے کو الزام نہیں دے سکتے۔ اپنی غلطی کو میڈل بنا کر ساری زندگی گلے میں لٹکانا پڑتا ہے۔ یقین مانیں عمیر بھائی! ہم نے تو شکر ادا کیا تھا کہ کسی نے تو ہماری بدصورت ساہر کو پسند کیا۔ ورنہ ہمیں تو اسے اپنے سرکل میں انٹروڈیوس کرواتے بھی شرمندگی ہوتی تھی کہ کہاں ہم اتنے ہینڈسم' اتنے سوہنے بھائی اور کہاں یہ رج کے کوجی لڑکی۔"

اس نے مبالغہ آرائی کی حد ہی کر دی۔

"بس کرو تقی! تمہاری وجاہت کو چار چاند لگے ہوں یا نہیں۔ لیکن زبان کو ضرور لگ چکے ہیں۔" ساہر نے کہا۔

تقی شرارت سے ہنستا رہا۔ پھر عمیر سے مخاطب ہوا۔

"میری باتوں کو سنجیدگی سے مت لیجیے گا عمیر بھائی! امی کہتی ہیں' تقی کو بک بک کرنے کی عادت ہے۔ ساہر تو ہماری بہت پیاری بہن ہے۔ ایٹ لیسٹ مجھے اور میری اماں کو اب تک آپ سے گلہ ہے کہ ساہر کو ہم سے دور کر دیا۔"

اس کا لہجہ سادہ تھا۔ لیکن سنجیدہ بھی۔

"میں نے کہاں دور کیا یار! وہ تو آپ کے والد صاحب ہی ملنا پسند نہیں کرتے۔ ورنہ ساہر سے پوچھ لو میں نے کئی بار اس سے کہا کہ یہ جانا چاہے تو جا سکتی ہے یا میں بھی اسے ملوانے لے جا سکتا ہوں۔"

"جی! دراصل ضد کے معاملے میں ساہر ابا کی فوٹو کاپی ہے۔" تقی نے کہا۔ "خیر' امی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔"

"تم ان کو بھی ساتھ لے آتے نا۔"

"تم ان کو نہیں جانتیں؟ تمہیں یاد تو بہت کرتی ہیں' روتی بھی ہیں' لیکن ابا کی بات ان کے لیے پتھر کی لکیر ہے۔ جب تک ابا اجازت نہیں دیں گے۔ وہ کڑھتی رہیں گی۔ لیکن ان کی حکم عدولی نہیں کریں گی۔ لیکن خیر... میں آگیا ہوں نا۔ ان کو بھی لے ہی آؤں گا۔" تقی کا لہجہ مضبوط تھا۔

"تقی! تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں ساہر کو سمجھاتا ہوں کہ ضد چھوڑ کر اپنے تایا ابا سے ملے۔ لیکن یہ واحد بات ہے میری' جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ تم سمجھاؤ۔ شاید سمجھ لے۔ مجھے دراصل اس وقت جانا ہو گا۔ آفس سے ایک اہم کال آرہی ہے۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گے۔" عمیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

پھر عمیر چلے گئے تو وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر تقی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب آتے جاتے رہنا تقی۔"

"ہاں! میں دوبارہ آؤں گا اور اگلی بار میرے بھانجا بھانجی کو بے وقت مت سلانا۔ میں ان کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔ کتنے پیارے ہیں دونوں۔ بالکل اپنے تقی ماموں پر گئے ہیں۔"

اس کی لن ترانیاں کسی حال میں ختم نہ ہوتی تھیں۔ تب ہی اس نے دیکھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک ہرا آنچل غائب ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ دل کہیں اور اٹکا ہو تو رنگ برنگے آنچلوں کی کون پروا کرتا ہے۔ بھاڑ میں جائیں سب۔

☼ ☼ ☼

تقی' عادل اور ہدیہ کی تصویریں اپنے موبائل فون میں کھینچ لایا تھا۔ امی ہر دو گھنٹے بعد نکلوا کر ایک گھنٹہ دیکھتیں۔ نہ وہ دیکھ دیکھ کر تنگ آرہی تھیں۔ نہ تقی دکھا دکھا کر تنگ ہو رہا تھا۔ وہ بار بار کہتیں۔

"ماشاء اللہ کتنے پیارے ہیں دونوں۔"

"مجھ پر گئے ہیں۔ پیارا تو ہونا ہی تھا۔" وہ بھی ہر بار ایک ہی بات مختلف انداز سے کہہ دیتا تھا۔

"مجھے یاد آیا تقی! ساہر کی تو ایک بڑی پیاری سی نند بھی تھی۔" "نہیں کچھ خیال آیا تو کہا۔

"آپ نے پہلے نہیں بتایا کہ اس کی کوئی نند بھی ہے۔ اور یہ کہ "پیاری" بھی ہے... پہلے بتا دیا ہوتا تو میں اس کی بھی تصویر لے آتا۔"

"تم تو جب بھی بولنا' الٹا ہی بولنا۔" وہ پھر سے تصویریں دیکھنے لگیں۔

"امی! آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ساہر سے ملوا لاتا ہوں۔"

امی نے اسے دیکھا۔ ایک افسردہ آہ بھری۔ یہ ایسی ہی آہ تھی' جسے تقی ہمیشہ فلم اسٹار شبنم کی آہ سے تشبیہ دیتا تھا۔

"تمہارے ابا کو پتا چلا تو بہت واویلا کریں گے۔"

"انہیں کون بتائے گا امی! آپ نے بلاوجہ ابا کو ہوا بنا کر سر پر سوار کیا ہوا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں۔ یہ دراصل ابا کو غیر ضروری اہمیت دینے کا نتیجہ ہے کہ وہ اتنا سر چڑھ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ انسان کو اس کے ظرف سے زیادہ ملنے لگے تو وہ خود کو انسان نہیں' کچھ اور ہی سمجھنے لگتا ہے۔"

وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ ٹانگیں سامنے دوسری کرسی پر پھیلا رکھی تھیں اور لیپ ٹاپ ٹانگوں پر رکھا تھا۔ انگلیاں کھٹا کھٹ چل رہی تھیں۔ ساتھ میں زبان بھی۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انگلیاں زیادہ تیز چل رہی ہیں یا زبان۔

"خدارا آہستہ بولو۔ انہوں نے سن لیا تو قیامت

اٹھادیں گے۔" امی نے دہل کر کہا۔
تقی نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے کہا نا' آپ نے ابا کو ہوا بنا کر سر پر سوار کیا ہوا ہے۔ بھئی! جن کے خوف سے دہل رہی ہیں۔ وہ گھر پر ہیں ہی نہیں۔"
"ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئی۔" امی نے جھینپ کر کہا۔
"اچھا تو پھر چلتی ہیں؟"
"جانتے نہیں کیا ان کی ضد کو۔۔۔ ذرا بھی ان کی حکم عدولی ہوئی تو مجھے تو فورا" بے دخل کر دیں گے۔ میرے منہ میں خاک۔۔۔ میں اس عمر میں کوئی تماشا نہیں چاہتی۔" وہ خود عاجز تھیں۔
"امی! کبھی سوچا ہے' ابا ایسے کیوں ہیں؟"
"بس بیٹا! کچھ چیزیں قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔ ہم جتنا بھی زور لگالیں' انہیں بدل نہیں سکتے۔ تمہاری دادی کا تو ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ سوتیلی ماں کے ہاتھوں پلے۔ بچپن کی کچھ محرومیوں نے انہیں ضدی بنادیا۔ اپنی پہچان بنانے نکلے تو زمانے کی ٹھوکروں نے مزاج میں سختی بھر دی۔ اسی سخت مزاجی اور ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر باپ کے ترکے کو لات مار آئے۔ پھر اپنی پہچان تو بنالی۔ لیکن غرور آگیا کہ جی! جو کیا' خود کیا' جو کمایا' خود کمایا۔ باپ کا سہارا نہیں لیا۔ وہ تم لوگ کیا کہتے ہو۔۔۔ سیلف میڈ۔۔۔ ہاں! تمہارے ابا سیلف میڈ ہیں۔ تمہارے چچا کو تو اب تک اس بات کے طعنے دیتے ہیں کہ انہوں نے باپ کی چاکری کی۔"
اسی وقت امی کے ہاتھ میں پکڑے اس کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی۔ انہوں نے اسکرین کو دیکھا۔ پھر چشمے کے اوپر سے اسے گھورا۔
"یہ کون ہے؟"
تقی نے ایک نظر اس سی ڈی کو دیکھا۔ پھر مسکرایا کہ نمبر کے ساتھ مہک کی تصویر بھی نمایاں تھی۔
"آپ کی ہونے والی بہو ہے۔"
"اس سال یہ ساتویں لڑکی ہے۔ جس کے بارے میں تم یہی بات کہہ رہے ہو۔"
"ان چھ کے بارے میں بھی میں نے یہی کہا تھا کیا؟" اس نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔ پھر خود ہی ہنس دیا۔
"یہ ساتویں ہے امی! لیکن یہی آخری بھی ہے۔ یہی آپ کی بہو بنے گی۔" اس نے فون ان سے لے کر کال کاٹ دی۔
"اپنے ابا کو جانتے ہو نا۔۔۔ انہیں پتا چلا' تمہاری پسند ہے تو اڑ جائیں گے۔" امی نے سنجیدگی سے کہا۔
"او میری بھولی ماں! جب گھٹن بڑھ جاتی ہے تو ٹھنڈی ہوا کے لیے کھڑکی کھول لی جاتی ہے۔ ابا کی پابندیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ ہم بھی کھڑکی کھول لیں گے۔" اس کا انداز سادہ تھا۔
"مطلب؟" وہ الجھیں۔
"رضی نے بھی تو پسند کیا تھا نا بھابھی کو؟ لیکن شادی اتنی پلاننگ سے ہوئی کہ ابا اب تک سمجھتے ہیں' بھابھی ان ہی کی پسند کی ہوئی ہیں۔ ہم بھی کوئی ایسی چالاکی کریں گے کہ ابا کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔"
وہ مطمئن سا موبائل لے کر اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

تعلق کی نوعیت بدلی تو حق بھی جتایا جانے لگا۔ مہک نے اس کے منع کرنے کے باوجود اس کا پورٹ فولیو مختلف ایجنسیز میں بھجوا دیا تھا اور توقع کے عین مطابق فورا" ہی دو ایجنسیز سے کال بھی آگئی تھی۔
"میری مانو۔ ان میں سے کسی ایک کو ضرور اوکے کر دو۔" مہک نے کہا۔
"دیکھو! ڈراما تو تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ ہی کرنا ہوگا۔ لیکن یہ دونوں بھی اچھی آفرز ہیں۔ ان پر بھی غور کرلو۔ تمہیں زیادہ ٹائم بھی نہیں دینا پڑے گا اور میڈیا کی نظروں میں بھی آجاؤ گے۔" جاثم اور مہک مل کر اس پر دباؤ ڈال رہے تھے۔
"ابا کی نظروں میں بھی آجاؤں گا۔" اس نے کہا۔
"ابا سے ڈرتے رہو گے تو ترقی نہیں کر سکو گے۔ یہ

نہیں بتادوں۔" جاثم نے اسی کے انداز میں کہا۔
تقی الجھ گیا۔ اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔
"جو کام تم خود نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے لیے مجھے کیوں فورس کر رہی ہو؟" وہ الجھا ہوا تھا۔ مہک سے پوچھ بیٹھا۔
"کیونکہ میں تمہارے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔" مہک نے سنجیدگی سے کہا۔ "اچھی زندگی کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے کیا مجھے تمہیں بتانا پڑے گا؟"
مہک کیا کہہ رہی تھی' تقی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ تقی بھی کسی گئے گزرے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لیکن مہک کے والد کا مقابلہ بہرحال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگ جدی پشتی رئیس تھے۔ نہ صرف یہ' بلکہ اس کے والد اور بڑے دونوں بھائی اچھے عہدوں پر تھے۔ مہک نے اسے پسند کرلیا تھا۔ اب اسے اپنے اسٹیٹس تک لانا چاہتی تھی۔ تقی کو اس کی باتوں سے سخت نخوس ہوئی۔ اس نے مہک کو خوب کھری کھری سنائیں اور ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا۔ لیکن دو روز بعد اس نے جاثم کے ذریعے اس ماڈلنگ کے لیے ہامی بھرلی۔ سب باتوں پر غور کیا تھا۔ اسے ترقی تو کرنا ہی تھی۔ کیا برا تھا کہ اپنی پسند کی فیلڈ جوائن کرلیتا۔ چھوٹے موٹے افیئرز اب تک بہت چلائے تھے۔ محبت پہلی بار کی تھی۔ سو مہک سے دست برداری اسے منظور نہیں تھی۔
"ابا کو غصہ آئے گا۔ لیکن زیادہ سے زیادہ کیا کرلیں گے۔ چیخیں چلائیں گے ہی نا۔۔۔ گولی تو نہیں ماردیں گے۔"
اس نے سوچا اور یوں جو کام اب تک وہ خود نہ کر سکا تھا' وہ اس سے مہک کی محبت نے کروالیا۔

☼ ☼ ☼

فوٹوشوٹ مکمل ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اسے مختلف ایجنسیز کی طرف سے پیش کش موصول ہونے لگیں۔ کچھ ٹی وی کمرشلز تھے۔ اس کی تصویریں بڑے بڑے بل بورڈز پر لگتیں تو وہ دنوں میں مشہور ہو جاتا۔ اس نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ ابا کی خفگی کا ڈر تو بہرحال تھا۔ لیکن ایک نئے نئے میوزک بینڈ کی میوزک ویڈیو کی پیش کش اسے قابل غور لگی۔ اس ویڈیو کو مڈل ایسٹ میں آن ایئر ہونا تھا۔ پاکستان اور انڈیا کے لیے اس بینڈ کے ممبرز نے کسی انڈین ماڈل کو لینے کا سوچ رکھا تھا۔
بینڈ نیا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گانا مطلوبہ ریٹنگ حاصل کر بھی سکے گا یا نہیں۔ یوں یہ گھاٹے کا سودا ہوتا' لیکن تقی کو رسک لینے کا شوق تھا۔ سو اس نے ہامی بھرلی۔
"تو پٹے گا بھائی! تو بہت پٹے گا۔" سمیر ہر بار یہی کہتا۔
"تیری زبان کالی ہے سمیر! سوچ سمجھ کر بولا کر۔" تقی نے اس روز کہا۔
"اگر اتنی کالی ہوتی تو میری منگنی ثمر سے نہ ہو رہی ہوتی۔" سمیر نے منہ بگاڑ کر کہا۔
"تصویر دیکھ لی؟"
"کہاں یار! ابو نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ میری تمام امیدوں پر پانی پھیر کر رہیں گے۔ اتنی کوشش کی کہ کسی طرح تصویر دکھادیں۔ لیکن انہیں میری بات بھول ہی نہیں رہی۔" اس کے اپنے دکھڑے تھے' جنہیں تقی سن ہی سکتا تھا۔ سلجھانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ سو وہ سنتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اور ہوا بھی وہی' جس کا ڈر تھا۔ عین اس لمحے جب وہ انگوٹھی پہنانے لگا۔ عقدہ کھلا کہ یہ ظالم وہی ہے' جس نے ننھی سی جان پر ظلم ڈھایا تھا۔
بدبخت فوٹو گرافر نے بھی عین اسی لمحے تصویر کھینچنا تھی۔ اب تصویر کچھ یوں آئی کہ ہاتھ میں ہاتھ تو تھا۔ لیکن سمیر کا منہ بوکھلاہٹ سے ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ ثمر کی آنکھوں میں بے یقینی اور غصہ چھلک رہا تھا۔
سمیر اسی بوکھلاہٹ میں رک گیا۔ اس نے ثمر کا ہاتھ

چھوڑ دیا۔
"کیا ہوا سمیر! انگوٹھی پہناؤ۔" ساتھ بیٹھے ابو نے ٹھوکا دیا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔۔۔۔
اس کے ابو اس کے ساتھ جبکہ شکیل انکل ثمر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ دونوں کی والدائیں ساتھ والے صوفوں پر۔ بہن بھائی، کزنز وغیرہ بھی اسی طرح آمنے سامنے یہاں وہاں بکھرے تھے۔
سمیر نے فیصلہ کیا۔ وہ اس بدتمیز لڑکی کو انگوٹھی نہیں پہنائے گا۔ تقدیر کے اس غلط فیصلے کو وہ اپنی تدبیر سے بدل دے گا۔ لیکن اتنی ساری نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ سٹپٹا گیا۔ ابو، بھائی تو دو، تین بار اسے انگوٹھی پہنانے کا کہہ بھی چکے تھے۔ لیکن اسے لگ رہا تھا ہاتھوں میں جان ہی نہیں رہی کہ انہیں حرکت دیا جائے۔
"میرا خیال ہے سمیر خوشی کے مارے ٹرانس میں چلا گیا ہے۔ اس لیے انگوٹھی اب تک ہاتھ میں پکڑے بیٹھا ہے۔" یہ چہکتی ہوئی آواز اس کے بڑے بھائی کی تھی۔ "ابو! آپ ہی انگوٹھی پہنا دیں۔ پتا نہیں سمیر کا ٹرانس کتنا طویل ہو جائے۔"
اس بات پر قہقہے گونجے تھے۔ معاً" ابو نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی۔
"تب تو یہ فرض میں ہی پورا کر دیتا ہوں۔" انہوں نے خوشگواریت سے کہتے ہوئے آگے ہو کر انگوٹھی ثمر کی انگلی میں ڈال دی۔ اسی طرح شکیل انکل نے اس کو انگوٹھی پہنا دی۔
مبارک سلامت کے شور میں، کھٹا کھٹ تصویریں کھنچواتے ہوئے وہ دونوں جیسے ایک دوسرے کا خون پی جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت خاموشی میں ہی مصلحت تھی، سو دونوں خاموش تھے۔۔۔ بظاہر۔
"میں مر جاؤں گی۔ لیکن تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔" کسی تصویر کے لیے مسکراتے ہوئے ثمر نے دانت کچکچا کر اچانک، بہت دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی آواز سمیر نے سنی تھی اور تاثرات کیمرے نے کیچ کیے تھے۔

"فکر نہ کرو۔ تم سے شادی کر کے مجھے بھی اپنی زندگی برباد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" جواب پر مارنے سے وہ بھی نہیں چوکا۔ تقی تو تھا نہیں۔ اپنی شوٹنگز کی وجہ سے آ نہیں سکا تھا۔ ہوتا تو کوئی اچھا مشورہ دیتا۔ ناچار اس نے سارا قصہ روحیل سے کر سنایا اور روحیل نے اپنی عقل کے حساب سے مشورہ بھی دے دیا۔ سمیر صاحب کو ہر کام کی جلدی رہتی تھی، سو گھر آتے ہی اس کے مشورے پر عمل کر ڈالا۔
"ابو! میں اس لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ میں نے بتا دیا ہے بس۔"
"یہ بات مجھے نہ بتاؤ۔ ہال میں موجود ہر بندہ تمہاری شکل دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ تمہارے دل میں کیا چل رہا ہے۔" اس کی بات سن کر ابو کے اندر کا جلاد جاگ اٹھا تھا۔ انہوں نے اتنی مروت بھی نہ کی کہ روحیل بھی اس کے ساتھ انکار کی عرضی لے کر آیا تھا۔
"اتنی اچھی لڑکی ہے ثمر۔۔۔۔ شکیل سے میری کتنی پرانی دوستی ہے۔ ایک ایک فرد کو جانتا ہوں میں اس کے گھر میں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں یہ کیا سوجھی کہ انکار کرنا ہے۔"
"وہ۔۔۔ میں دراصل۔۔۔" وہ بوکھلا گیا۔ بے شک ابو سے اس کی دوستی تھی۔ لیکن تھے تو وہ ابو ہی نا۔ انکار کے پس پردہ اس کی حرکت کا سن کر بھڑک جانا لازمی امر تھا اور سچ بات ہے کہ یہی بات اسے زیادہ بوکھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔
"ایکچوئلی انکل! سمیر کسی اور کو پسند کرتا ہے۔" معاً" روحیل نے کہا۔ ابو تو ابو، سمیر نے بھی اسے حیرانی سے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔
"کیا یہ سچ ہے سمیر!" ابو نے چند منٹ بعد سرد مہری سے پوچھا۔ سمیر نے اثبات میں گردن ہلا دی کہ شاید اسی طرح جان چھوٹ جائے۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔
"انکل سمیر نے یہ بھی کہا ہے، اگر آپ نے اس کی بات نہ مانی تو وہ کھانا کھانا چھوڑ دے گا۔ پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیے گا۔" یہ بیان بھی روحیل

۔۔۔ صاحب کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ سمیر نے اسے ۔۔۔ کر دیکھا۔ اب ایسی سخت دھمکیاں تو نہیں دی تھیں اس نے۔
"تو پہلے کیوں نہیں کہا۔" ابو اتنے غصے سے بولے کہ سمیر کو لگا کمرے کی دیواریں بھی ضرور ہلی ہوں گی۔ "میں نے سو دفعہ پوچھا، سمیر! کہیں اور انٹرسٹڈ ہو تو بتاؤ۔ میں وہاں رشتہ طے کر دوں گا۔ میرا اتنا لائق فائق بیٹا ہے۔ کوئی انکار کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن تم۔۔۔ تم کو میری ناک کٹوانا لازمی تھا۔ اب میں کس منہ سے شکیل کو انکار کروں گا۔" وہ ازحد پریشان ہو گئے۔
"ابو! آپ میری بات تو سنیں۔" وہ منمنایا۔
"نہیں! سننا کچھ بھی۔ فوراً" چلے جاؤ یہاں سے اور اگلا ایک مہینہ مجھے اپنی شکل بھی نہ دکھانا۔ ورنہ تمہاری جگہ میں خودکشی کر لوں گا۔"
سمیر کو اپنا سا منہ لے کر باہر آنا پڑا۔ ساری رات وہ سوچتا رہا۔ آخر کس دیوار سے جا کر سر پھوڑے کہ معاملہ سلجھ جائے اور اس کو کسی کے سامنے شرمندہ بھی نہ ہونا پڑے۔
"اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ ثمر ہی کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے۔ اس کا کسی کے ساتھ اتنا اسٹرانگ افیئر چل رہا ہے کہ وہ مجھ سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن نہیں۔۔۔ یہ بڑی معیوب بات ہو جائے گی۔" اس نے اپنی سوچ کو خود ہی مسترد کر دیا۔
"پھر میں یہ ثابت کر دیتا ہوں کہ میرا کسی کے ساتھ افیئر ہے، اوہو۔۔۔ نہیں نا یار۔" وہ دیر تک الجھا رہا اور سوچتا رہا۔
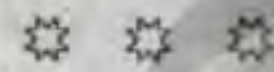
☼ ☼ ☼

"سمیر۔۔۔ سمیر! اٹھو۔" اس کا بھائی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔
"کیا ہوا؟" وہ گہری نیند میں تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
"ابو کہہ رہے ہیں۔ وہ شکیل انکل کو انکار نہیں کریں گے۔ بلکہ تمہیں ذبح کر دیں گے۔" سمیر پہلے تو گہری نیند سے جگایا گیا تھا۔ اس بات پر دل تھام کر

دوبارہ گر گیا۔ چند لمحہ بعد احساس ہوا اس کا بھائی مذاق کر رہا تھا۔
"اگر اتنی صبح تم مذاق کر رہے ہو تو مذاق کرنے کے لیے تم نے انتہائی برا وقت چنا ہے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ جواب میں اس کا بھائی ہنسنے لگا۔
"میں تمہیں گھنٹہ بھر سے جگا رہا ہوں۔ لیکن تم تو مُردوں سے شرط لگا کر سو رہے تھے۔ اسی لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ خیر! پرسوں تم نے مجھ سے جو یو ایس بی لی تھی، وہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دو اور آئندہ مانگنے کی غلطی بھی مت کرنا۔ تم جیسے وعدہ خلاف آدمی کو کوئی چیز ادھار دینے سے اچھا ہے۔ انسان اپنی چیز کنویں میں ڈال آئے۔ لیکن تمہیں ادھار نہ دے۔" وہ جو تابڑ توڑ لگا رہا تھا۔ سمیر کو آگ ہی لگ گئی۔
"یہ پکڑو اپنی یو ایس بی۔" اس نے اٹھ کر اسٹڈی ٹیبل کی دراز سے یو ایس بی نکال کر اس کے ہاتھ پر پٹخی۔ "اور اب میرے جوتوں کی طرف بھول کر بھی نظر نہ ڈالنا۔" اس نے بھی فوراً" حساب برابر کر دیا۔ اس کا بھائی ناک سے مکھی اڑاتا باہر نکل گیا۔ پھر واپس آیا۔
"ہائے داوے ابو واقعی تمہیں ذبح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" اس کی لگائی ہوئی آگ کی چنگاریاں تیزی سے سمیر کی طرف آئی تھیں۔ وہ سر پکڑ کر بیڈ پر گر گیا۔
"یہ ابو کو کیا ہو گیا ہے۔ میرے ابو کم، تقی کے ابا زیادہ لگ رہے ہیں۔" اس نے سوچا۔ پھر غصے سے روحیل کے کانوں میں لگائے ہیڈ فون کا تار کھینچ دیا۔
"کیا تکلیف ہے تمہیں؟" وہ لیپ ٹاپ پر کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ ہڑبڑا گیا۔
"یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ نہ میں تمہاری بات مانتا۔ نہ ابو مجھ سے اتنا خفا ہوتے۔" وہ رو دینے کو تھا۔
"تم عجیب آدمی ہو سمیر! کیا تم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے کہ کوئی کچھ بھی کہتا ہے اور تم مان لیتے ہو۔۔۔ پہلے تم نے اپنے دوست کی بات مان کر ری

ایکٹ کیا اور مار کھائی۔ اب تم ہر بات کا الزام مجھ پر ڈال رہے ہو۔ بڑے ہی عجیب آدمی ہو بھئی تم تو۔" روحیل کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ ثابت ہو رہا تھا۔

سمیر دل ہی دل میں کھسیا گیا۔

"میں نے سوچ لیا ہے، اب کیا کرنا ہے۔ مجھے تم جیسے کسی نالائق دوست کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس نے بھی خود کو منہ پھٹ ثابت کیا اور کروٹ بدل لی۔

پھر اس نے عقل مندی کی حد کر دی۔ ساری بات جا کر اماں کے گوش گزار کر دی۔

وہ کھانے پینے کی شوقین تھیں۔ اس روز وہ دو چرغے اور نان لے آیا۔ ساتھ میں رائتہ، سلاد، میٹھے میں فالودہ... دونوں ماں بیٹا نے کمرے میں بند ہو کر خوب سیر ہو کر کھایا۔ اماں خوب خوش ہو چکیں تو مدعا بیان کیا۔ اماں ہکا بکا رہ گئیں۔

"کیا؟ شادی شدہ ہے؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اور اپنے ابا کی مانو۔ میں تو ساری زندگی یہی دیکھتی آرہی ہوں کہ انہوں نے ایک بھی ڈھنگ کا دوست نہیں بنایا۔ یہ شکیل تو کالج کے زمانے سے ہی جھوٹا مشہور ہو چکا تھا۔ تمہارے ابو خود ہی مجھے ہنس ہنس کر اس کے قصے سنایا کرتے تھے۔ بتاؤ... اتنا جھوٹا دوست اور وہیں بیٹے کا رشتہ جوڑ دیا، جو اپنی پہلے سے بیاہی بیٹی ہمارے سر منڈھ رہا ہے۔" وہ تو لال پیلی ہوئی جا رہی تھیں۔

"اماں! اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی کہی ہوئی ہر بات ہمیشہ ہی سچ ثابت ہوتی ہے۔" سمیر نے ان کی ولایت پر سر دھنتے ہوئے کہا۔

"مجھے یاد ہے، کئی سال پہلے ابو نے ان ہی شکیل انکل کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار شروع کیا تھا اور آپ نے اس وقت بھی بہت مخالفت کی تھی۔ لیکن ابو نے آپ کی ایک نہیں مانی تھی اور بعد میں اسی کاروبار کی وجہ سے ان دونوں دوستوں میں کھٹ پٹ بھی ہو گئی تھی۔" وہ سوچ سوچ کر اور اماں کے تاثرات کن اکھیوں سے دیکھ دیکھ کر بول رہا تھا۔

"ہاں تو تمہارے ابو نے کبھی میری کوئی بات مانی تھی، جو اس وقت مانتے۔ وہ تو اب تک نہیں مانتے لیکن خیر... مجھے پروا نہیں ہے۔ آخر کب تک [illegible] پروا کرتی۔ اسی لیے چھوڑ دی۔"

"مجھے تو لگتا ہے اماں! ابو میرا رشتہ بھی شکیل [illegible] کی بیٹی سے اسی لیے کر رہے ہیں۔ تاکہ اپنی ٹوٹی [illegible] دوستی کو دوبارہ جوڑ سکیں۔" وہ بڑی محبت سے ان کے گھٹنے دبانے لگا۔

"ائے ہئے... اب ایسا اندھیر بھی نہیں مچا کہ کسی کی دوستیاں جوڑنے کے لیے میں اپنے بیٹے کو صدقہ [illegible] بن جانے دوں۔" اماں نے تڑپ کر کہا۔ ساتھ ہی اپنی بائیں ٹانگ بھی اس کے آگے کر دی۔ "مجھے ذرا سوچنے دو مجھے اب کیا کرنا ہے۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ سمیر جانتا تھا اب وہ کچھ نہ کچھ کر کے اس مصیبت کو اس کے سر سے ٹال ہی دیں گی (اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ بہت دیر تک ان کی ٹانگیں دبا سکتا تھا) اور اس کا گمان کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اماں نے اگلے دن کو چڑھنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ شام کو ہی ثمر کے گھر پہنچ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دوسری جانب ثمر بھی اپنی امی کو سمیر کے متعلق [illegible] چکی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ لیکن فوری طور پر انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ ثمر کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اپنے بابا سے اس بارے میں کوئی ذکر نہ کرے۔ ثمر کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے وہ اسے خاموش رہنے کی تاکید کیوں کر رہی ہیں۔ لیکن اس کی امی نے اس کے اعتراض کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے اسے باور کروایا تھا کہ اس کو [illegible] خاموش رہنا چاہیے اور یہ کہ وہ اس کی دشمن نہیں ہیں۔ جو بھی کریں گی، اس کی بھلائی کے ہر پہلو کو مدنظر رکھ کر کریں گی۔ لیکن اسی شام سمیر کی اماں آ پہنچیں۔

فطرتاً بھی ذرا اکھڑ مزاج خاتون تھیں۔ پھر ثمر سے رشتہ پر دل سے راضی بھی نہیں تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اتنے حساس موضوع پر کچھ اس طرح بات کی کہ ثمر کی امی تحمل کا مظاہرہ کرتے کرتے بھی بھڑک اٹھیں۔

"میری بیٹی کے کردار پر انگلی اٹھانے سے پہلے آپ کو اپنے بیٹے کی حرکتوں کا نوٹس لینا چاہیے تھا۔" ثمر کی امی نے غصے سے کہہ دیا۔

"کن حرکتوں کی بات کر رہی ہیں؟" سمیر کی اماں نے تیکھے انداز میں پوچھا۔ جواب میں ثمر کی امی نے انہیں ساری بات بتا دی۔ بیٹوں کی مائیں ویسے ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ سمیر کی اماں کچھ زیادہ ہی تھیں۔

نتیجتاً "ایک نہ ختم ہونے والی بحث کا آغاز ہو گیا۔ جس کا اختتام سمیر کی اماں کی جانب سے انفرادی طور پر رشتہ ختم کر دینے کی بات پر ہوا۔

"اپنی بیٹی کے طلاق یافتہ ہونے کی بات چھپانے کے لیے میرے بیٹے پر انگلی اٹھا دی۔ یہ تو میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔"

انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔ اس وقت تک ثمر کے بابا بھی آچکے تھے۔ سمیر کی اماں کے جاتے ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"وہ اتنی باتیں سنا کر چلی گئیں اور آپ خاموش رہے؟"

"تو میں کیا کرتا؟ ان کا سر پھاڑ دیتا؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔ لیکن آپ کو کچھ تو کہنا چاہیے تھا۔"

"مجھے اب جو بھی کہنا ہے، فاروق سے کہوں گا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ آخر ان لوگوں کو اتنی بڑی غلط فہمی ہو کیسے گئی۔ کسی نے تو ان تک یہ بات پہنچائی ہوگی نا۔"

"ہاں! وہ کہہ رہی ہیں کہ ثمر کی کسی شفا نامی سہیلی نے بتایا ہے کہ ثمر طلاق یافتہ ہے۔" ثمر کی امی نے غصے سے کہا تھا۔ "سوال یہ نہیں کہ کس نے بتایا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک من گھڑت کہانی بنا رہی ہیں۔ آپ فاروق بھائی سے بات ضرور کریں، لیکن کسی مصالحت کے لیے نہیں بلکہ رشتہ ختم کرنے کے لیے... میں ایسے تھڑدلے لوگوں میں اپنی بیٹی ہرگز نہیں دوں گی۔"

"مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ شفا نے ایسی بات کہی ہوگی۔ وہ اتنی اچھی سہیلی ہے ثمر کی۔ ایسی بات کس طرح کر سکتی ہے ان لوگوں نے ضرور اپنی طرف سے من گھڑت کہانی بنائی ہوگی۔" شکیل صاحب نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

"میں فاروق سے بات کرتا ہوں۔ اس نے خود آکر مجھ سے ثمر کے رشتے کی بات کی تھی، میں اس کے پاس نہیں گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی ثمر سے کرے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ اتفاق ہی تھا کہ جس وقت ثمر کے گھر میں یہ بحث چل رہی تھی۔ اسی وقت ساہر کسی کام کے سلسلے میں ان کے گھر آئی تھی۔ ثمر اس وقت چاہتی تھی۔ ساہر کسی بھی طرح اس کے گھر سے چلی جائے اور یہ گفتگو نہ سن سکے جو اس کے ماں باپ اور سمیر کی ماں کے درمیان ہو رہی ہے، لیکن ساہر وہاں سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

"اوہ مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ شفا کوئی الٹی حرکت نہ کر دے۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں ثمر کی امی سے کہا۔

"ساہر بھابھی! اب پلیز آپ کوئی الٹی بات مت کیجیے گا۔" ثمر چڑ گئی۔

"ثمر! تھوڑی تمیز سیکھو۔ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔ اس کی امی نے فوراً "ڈپٹا۔

"اس کو مت ڈانٹیں آنٹی! دراصل اسے شفا پر اتنا بھروسا ہے کہ یہ اس کے خلاف کوئی بات سنتی ہی نہیں ہے۔" ساہر نے جتایا۔

"آخر بات کیا ہے؟" ثمر کی امی نے کڑی نظروں سے ثمر کو گھورا۔

"میں نے ثمر کو منع بھی کیا تھا آنٹی! کہ یہ اپنی منگنی

کے بارے میں شفا کو زیادہ نہ بتایا کرے۔۔۔ یہ عمر ایسی ہے کہ لڑکیاں جلدی جیلس ہو جاتی ہیں پھر آپ شفا کی عادت سے واقف بھی ہیں۔ یاد ہی ہو گا جو وہ میرے ساتھ کیا کرتی تھی۔۔۔ اب دیکھ لیں طلاق والی بات کر کے اس نے غلط فہمی تو پیدا کر دی نا۔"

بہت معصوم اور ہمدرد بن کر اس نے اپنا داؤ چلا دیا تھا۔ ثمر کی امی سوچ میں پڑ گئیں۔

جتنی شفا اور ثمر کی دوستی تھی اتنی تو نہیں، لیکن تھوڑی بہت ساہر اور ثمر کی امی کی آپس میں بنتی تھی۔ وہ تو ایک بات کہہ کر چلی گئی، لیکن ثمر کی امی کے دل میں بات گڑی رہ گئی تھی۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ ایک زبان سے نکلی ہوئی بات جب کسی دوسرے کے کانوں تک پہنچتی ہے تو وہ اسے اپنی مرضی کے مطالب پہنا کر آگے منتقل کرتا ہے۔ سمیر کی بات کو اس کی اماں نے اپنے حساب سے سمجھا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ ثمر کی شادی کے بعد طلاق ہو گئی ہو گی جسے اس کے گھر والے چھپا کر اپنی طلاق یافتہ بیٹی کو ان کے بیٹے کے سر منڈھ رہے ہیں۔ انہوں نے جو سمجھا سو سمجھا، ساہر نے اس بات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ یعنی اس نے ثمر پر تو نہ سہی، لیکن اس کی امی پر یہ ضرور ثابت کر دیا تھا کہ شفا ان کی بیٹی کی خیر خواہ ہرگز نہیں ہے۔

"امی! پلیز۔ اب آپ ساہر بھابھی کی باتوں میں آکر شفا سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ کو پتا نہیں، وہ کتنی جھوٹی ہیں۔" ثمر نے ساہر کے جانے کے بعد ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"خاموش رہو تم۔ ساہر میں لاکھ خامیاں سہی، لیکن کچھ باتیں اس کی ٹھیک ہی ہوتی ہیں۔۔۔ تمہاری منگنی کی خبر سن کر شفا حسد کا شکار ہوئی ہے اور اسی چکر میں اس نے اتنی فضول بات کی۔ حسد نہ کر رہی ہوتی تو ذرا خود سوچو، تمہاری اتنی اچھی دوست ہے تو آخر منگنی میں کیوں نہیں آئی؟"

"وہ بیمار تھی امی!"

"آئے ہائے! اب ایسی بھی کیا بیماری۔ دیوار سے دیوار جڑی ہے ذرا دیر کو آجاتی تو کون سا قیامت آجاتا تھی۔" وہ کچھ سننے کو راضی نہ تھیں گویا ساہر انہیں شفا سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی، بلکہ ایک پل کے لیے تو ثمر نے بھی سوچا کہ شاید ساہر بھابھی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ چونکہ۔۔۔ اسے ساہر سے پرخاش تھی اس لیے اس نے سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا چھڑا لیا تھا ہاں یہ احساس ضرور تھا کہ اس کے بارے میں ایک غلط بات پھیلائی گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

"میں کب سے ثمر کو فون کر رہی ہوں، پتا نہیں کہاں مصروف ہے۔ فون اٹھا ہی نہیں رہی۔" شفا نے جھنجلا کر کہا۔

ساہر آئرن اسٹینڈ کے پاس کھڑی کپڑے استری کر رہی تھی جب اس نے شفا کو کہتے سنا۔ اس نے مڑ کر دیکھا شفا ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی ایک ہاتھ میں ٹی وی ریموٹ تھا دوسرے میں موبائل۔ آج کل یوں بھی موبائل اس کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا تھا۔ ساہر مسکرائی۔

"نئے گھر میں سو مصروفیات ہوتی ہیں۔ ثمر بھی مصروف ہو گی۔"

"نیا گھر؟" شفا نے تعجب سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"ہاں نیا گھر۔۔۔ تمہیں نہیں پتا۔ ثمر کی فیملی ماڈل ٹاؤن شفٹ ہو گئی ہے۔"

"ہیں؟" وہ اپنی جگہ سے دو فٹ اچھلی تھی۔ "ثمر لوگ ماڈل ٹاؤن کب شفٹ ہوئے؟ اور اس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"اچھا۔۔۔ نہیں بتایا۔۔۔ تعجب ہے۔" ساہر نے کہا۔ "کالج کی چھٹیاں ہیں۔۔۔۔ میرا خیال تھا۔ تمہارا موبائل پر اس سے رابطہ ہو گا۔" ساہر نے کہا تو سادگی سے ہی تھا، لیکن شفا خفیف سی ہو گئی۔ اس نے لاشعوری طور پر موبائل والا ہاتھ پیچھے کیا تھا۔

"ہاں بتایا تو تھا شاید، میں ہی بھول گئی۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ ساہر نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ کیونکہ جانتی تھی ہر انسان دھڑلے سے جھوٹ نہیں بول پاتا۔

"اب وہ لوگ تو چلے گئے، ثمر کی امی اچھی خاتون تھیں۔ میری اچھی بات چیت رہتی تھی ان سے۔ اب اس گھر میں ان کی دیورانی آگئی ہیں کیونکہ ثمر کی دادی نے آبائی گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔ میں کسی دن چکر لگاؤں گی ان کی طرف۔" وہ کہہ رہی تھی اسی دوران شفا کے موبائل کی بپ بجی تھی۔

"تمہیں پتا ہے شفا! ثمر کی منگنی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ لڑکے والوں کو کسی نے کہہ دیا کہ ثمر طلاق یافتہ ہے۔"

ساہر نے گویا اطلاع دی تھی، لیکن شفا نے سنا نہیں وہ اپنے موبائل پر میسج کھیلنے میں مصروف ہو گئی تھی اس بات سے بے خبر کہ اس کا بھلائی میں بولا جھوٹ ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے کیا سے کیا ہو چکا ہے۔ ساہر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی چلی ہوئی چالیں ہمیشہ ہی کامیاب ہوتی تھیں ہاں آخر میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ اس کی ساری بساط الٹی جاتی۔ اس بار اس نے بہت بڑا رسک لے لیا تھا اور وہ پر یقین بھی تھی کہ اس بار اسے ناکام نہیں ہونا پڑے گا۔ کہتے ہیں آدھا فاتح تو انسان کو اس کا باحوصلہ ہونا ہی بنا دیتا ہے وہ بھی فتح یاب سمجھنے لگی تھی خود کو اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر پتے بھی چلا دیے تھے۔ اس نے وشمہ کی دوستی سے پورا فائدہ حاصل کیا تھا۔

باقی بچی شفا۔۔۔ تو آج کل وہ نئی اڑان بھر رہی تھی چند تعریفی جملوں اور مختصر لگاوٹ بھری باتوں نے جو اسے اعتماد کے خوشنما پر لگائے تھے ان کے بھروسے نئی دنیا کی سیر کرنے نکلی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا جس طرح پر اچانک مل جاتے ہیں اسی طرح غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایک دم۔۔۔ بس اچانک۔۔۔ ایسے جیسے کاغذ پر لکھی تحریر کسی نے مٹا دی ہو پھر انسان منہ کے بل گرتا ہے اور چور چور ہو جاتا ہے۔ جب انسان اڑنے کے لیے بنا نہیں تو کوشش کیوں کرتا ہے؟ ناسمجھ ہوتا ہے اس لیے۔

☼ ☼ ☼

"ماضی کا عظیم فنکار بنفس نفیس تم سے معذرت کرنے آیا ہے کہ تمہاری پہلی پہلی منگنی میں شریک بھی نہ ہو سکا۔ حالانکہ میرے نہ آنے سے تمہارا فائدہ ہی ہوا، میں آجاتا تو تمہارے فنکشن کو چار چاند تو لگ جانے تھے، لیکن پھر دولہا کو کسی نے نہیں پوچھنا تھا۔ سب نے تو میرے ہی ارد گرد ہونا تھا۔"

تقی شوٹنگز کی وجہ سے بہت مصروف رہا تھا فرصت ملتے ہی پہلی ملاقات سمیر سے کی۔

"اگلا بندہ چاہے مرنے والا ہو، تم اپنی تعریفوں کا قصیدہ اسے ضرور سنانا۔" سمیر جل کر بولا۔

"تم مرنے والے ہو۔۔۔ آ۔۔۔ کس پہ؟" سادہ سے لہجے میں شرارت تھی۔

"مر ہی گیا ہوں یار! میرے ساتھ تو اتنی بری ہوئی ہے کہ کیا کسی دشمن کے ساتھ ہوتی ہو گی۔" اس نے بے زاری سے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا تھا اور پھر ساری بات تقی کو کہہ سنائی۔

"اماں کی انوالومنٹ کے بعد بات اور بھی بگڑ گئی۔ شکیل انکل نے ابو سے بات کی اور انہیں وہ سب بتایا جو مری میں ہوا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے خود انکار کر دیا کہ وہ ثمر کی شادی مجھ جیسے لڑکے سے نہیں کریں گے۔ ابو نے میری بڑی بے عزتی کی۔"

"صبر کر بھائی! ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔" تقی نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"مصلحت۔۔۔" اس نے سلگ کر تقی کو دیکھا۔ "جو بھی ہوا اس میں تمہاری غلطی ہے سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔"

"خیر۔۔۔ اب تم اتنے بھی کاکے نہیں ہو کہ تمہیں کچھ کہا ہی نہ جائے۔ وہاں تو مصیبت پڑی ہوئی تھی کہ کسی طرح پتا چل جائے۔ یہ وہی ثمر ہے یا نہیں، لیکن خیر تم فکر نہ کرو میں انکل سے بات کرتا ہوں۔ بتاتا ہوں انہیں کہ جو بھی ہوا اس میں ہم سب کی برابر کی غلطی

تھی۔ تم کو شرارت پر میں نے اکسایا تھا۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ان کے سامنے تم جیسے چالاک انسان کو بالکل معصوم ثابت کروں گا جو کہ تم ہو نہیں۔"
بڑا احسان جتانے والا انداز تھا۔
"نہیں تم کچھ مت کہو۔ جو ہوا وہ بس ٹھیک ہے۔ مجھے ثمر سے محبت ضرور ہوئی تھی' لیکن میں خود کو سمجھا لوں گا۔ سیلف ریسپکٹ سے زیادہ اہم اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کون سی دنیا کی آخری لڑکی تھی کہ مجھے اور کوئی ملے گی ہی نہیں۔ اب تم نے ابو سے کچھ کہا تو وہ تمہارے بھی خلاف ہو جائیں گے۔ ویسے بھی آج کل مجھے اپنے ابو تمہارے ابا زیادہ لگ رہے ہیں۔"
"یہ مت کہو ہمارے ابا تو ون اینڈ اونلی پیس ہیں۔ قدرت نے انہیں بنا کر سانچہ ہی توڑ دیا تھا۔" تقی بے ساختگی سے بولا۔ سمیر کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ تقی چاہتا بھی یہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"کدھر ہو میاں صاحب زادے! آج کل تو گھر میں ٹکتے ہی نہیں ہو؟" وہ بقول ابا بن ٹھن کر کہیں جانے کو تیار تھا جب ابا نے حسب سابق طنزیہ انداز میں پوچھا۔
"بس ابا! پاپی پیٹ کے سارے جھمیلے ہیں۔ بندہ یا نوکری کر لے یا گھر میں ٹک جائے۔" وہ بھی تقی تھا جس نے سیدھا جواب دینا نہیں سیکھا تھا۔
"تم نوکری کر رہے ہو؟" ابا سے اپنی حیرانی بھی چھپائی نہیں گئی۔ تقی کو اندر ہی اندر بڑی گدگدی ہوئی۔
"ہاں جی۔۔۔ کب کی۔" بے نیازی سی بے نیازی تھی۔
"بتایا ہی نہیں کسی نے۔ کہاں کر رہے ہو؟"
تقی نے ایک فرضی نام بتا دیا۔
"ہمم۔۔۔" ابا نے اسے دیکھتے ہوئے ایک پر سوچ ہنکارا بھرا۔ "چلو پہلی تاریخ آنے ہی والی ہے جب تنخواہ ہاتھ پر رکھو گے تب ہی پتا چلے گا۔" شاید انہیں یقین نہیں آیا تھا۔
"میں پہلی تاریخ سے بھی پہلے تنخواہ آپ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور ٹھیک دو روز بعد وہ ان کے سامنے کھڑا پہلے سے بھی بھرپور طریقے سے مسکرا رہا تھا۔
ابا مسکرائے نہیں' لیکن ان کی آنکھوں میں کچھ اس نے نرمی دیکھی تھی۔
"اچھی بات ہے کہ تم نے اپنی ذمہ داری سمجھی۔ عورت باورچی خانے میں اور مرد کماتا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔" انہوں نے گویا سمجھایا۔ تقی نے گردن موڑ کر امی کو دیکھا وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔
وہ جیسے اندر تک خوشی سے بھر گیا ہو۔
میوزک ویڈیو ان سب کی توقع سے بھی زیادہ پسند کی گئی تھی۔ گانا تو جو ہٹ ہوا سو ہوا تنقیدی حلقے تقی کو سراہ رہے تھے اور اس کی آمد کو شوبز میں خوش آئند قرار دیا جا رہا تھا۔
اسے دھڑا دھڑ کام کی آفرز آنے لگی تھیں۔ یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کس کے لیے حامی بھرے اور کسے انکار کردے۔ ابا کو چھوڑ کر باقی گھر والوں کے ساتھ اس نے اس خوشی کو خوب سیلیبریٹ کیا۔ مہک کو بھی بلوا لیا۔ امی مل کر بہت خوش ہوئیں پھر رضی نے چکر چلایا اور مہک کے پاپا سے ابا کو ملوا دیا۔ بتایا یہ کہ وہ اس کے حلقہ احباب میں سے تھے۔
ابا تقی کی جانب سے مطمئن ہو چلے تھے۔ لوگ بھی پسند آئے رضی کی ٹرک کام کر گئی۔

☼ ☼ ☼

جری کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوا تو ابا نے گھر میں فنکشن رکھ لیا۔ سارا خاندان مدعو کیا مہک کے گھر والوں نے معذرت کر لی ان کے اپنے خاندان میں کوئی تقریب تھی۔ سب گھر والے بے حد خوش تھے۔ جری بھی گردن اکڑائے گھوم رہا تھا۔ تقی اسے دیکھتا اور بار بار افسوس سے سر ہلاتا۔
"کیسا دور آگیا ہے۔ شکل سے عطائی بھی نہ لگنے والے اب ڈاکٹر کہلائیں گے۔ گورکھ دھندا ہے بھئی!

گورکھ دھندا!" جری خوش تھا سو ہنس کر ٹال دیتا۔

"میرے بہت سے دوست بھی آ رہے ہیں۔ آپ نے ان سب سے خوش اخلاقی سے ملنا ہے اور اچھے اچھے آٹو گراف بھی دینے ہیں کیونکہ ان میں سے آدھے تو اسی شوق میں آ رہے ہیں کہ آپ سے ملاقات کا موقع ملے گا۔" اس نے تقی سے کہا۔

"ٹھیک ہے اب میں اپنے بھائی کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔ ویسے تو ریٹ پچاس ہزار ہے، لیکن تم میرے بھائی ہو تو دس ہزار دے دینا۔" اس نے سیدھے سیدھے کہا۔

"ہیں۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"بھئی سیدھی سی بات ہے، میں تو اب سیلیبرٹی بن گیا ہوں کوئی للو پنجو تو ہوں نہیں کہ منہ اٹھا کر کوئی بھی ملنے آئے اور میں ہنس ہنس کر ملتا رہوں۔ ہاں اگر تم پے منٹ کر دو تو بات دوسری ہو گی۔"

"اوہو۔۔۔ سیلیبرٹی تو دیکھو۔ میرے دوستوں سے تو ملنا ہی پڑے گا ورنہ یاد رکھنا جب ایک دن جیو کے ساتھ کی ٹیم آپ کا انٹرویو لینے آئے گی تو میں بھائی بن کر آپ کے سارے راز فاش کر دوں گا اور اس وقت آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"آئے بڑے تم میرے راز فاش کرنے والے۔۔۔ میں نے تمہارے بچپن کے سارے کارناموں کو راز بنا کر اپنے سینے میں چھپا رکھا ہے۔ اتنا بوجھ ہے ان رازوں کا کہ بعض دفعہ مجھے سانس لینا تک مشکل لگتا ہے۔"

"اللہ۔۔۔ ایسے کون سے ونی راز ہیں؟" بھابھی نے بھی دلچسپی لی۔ تقی جری کو چڑا رہا تھا۔ انہیں پتا تھا، گفتگو دلچسپ ہی ہو گی۔

"چلو جی۔۔۔ آپ لیں دلچسپی۔۔۔ تقی بھائی نے خود سے بنا کر ایسے قصے سنانے ہیں کہ آپ کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔" جری آج کل کچھ زیادہ ہی پر اعتماد تھا۔

"او میرے منے لاڈلے بھائی! میں کیوں خود سے قصے بناؤں گا تمہارے ہی کھلائے ہوئے گلوں کی خوشبو ہے۔ جس نے میرے ذہن کو معطر کیا ہوا ہے۔" تقی مسکرایا۔

"آپ کو پتا ہے بھابھی! یہ جواب شکل سے اتنا معصوم بنا پھرتا ہے بچپن سے ہی اندر سے پورا ہے یعنی میسنا گھنا۔۔۔ پہلا عشق چار سال کی عمر میں کر لیا تھا وہ بھی پڑوس کی منزہ سے۔ جس کی ناک چوبیس گھنٹے بہتی رہتی تھی اور یہ اپنی شرٹ کے دامن سے اس کی ناک پونچھا کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں ایک بار تو امی کی انگوٹھی چوری کر کے اسے پروپوز کرنے بھی پہنچ گیا تھا۔ وہ تو میں نے عین وقت پر چھاپہ مار کر ابا کی عزت کو داغ دار ہونے سے بچا لیا۔" وہ نان اسٹاپ بول رہا تھا۔ جری ساری بات پر مسکراتا رہا، لیکن اس بات پر بلبلا گیا۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے بھائی! تم ایک کو چار سے ضرب دے کر نہ سناؤ۔"

"اس میں شرمانے کی کیا بات ہے جری! محبت ہی کی تھی تم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا اور بچپن میں تو ایسے چھوٹے موٹے عشق سب کو ہو جایا کرتے ہیں۔" تقی نے ناصحانہ انداز میں کہا تھا۔

"میں نہ شرما رہا ہوں نہ مکر رہا ہوں۔" جری نے تیزی سے کہا تھا پھر جھجک کر بولا۔ "ہاں اچھی لگتی تھی وہ مجھے، لیکن میں کوئی اس کی ناک نہیں پونچھتا تھا اور نہ ہی میں نے امی کی انگوٹھی چرائی تھی۔" وہ بیبن کو وضاحتیں دینے لگا۔

"تو اس دوپہر کیا درخت کے نیچے بیٹھ کر اسے گرامر سمجھا رہے تھے جب میں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔" تقی آنکھیں مٹکا کر بولا تھا۔

"وہ تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" اس سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ ایک تو تقی کی باتیں اوپر سے بیبن ہنس ہنس کر بیچ بیچ دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ تقی نے تو اپنی بات سچ ثابت کر کے چھوڑی۔ جری جب اسے جھوٹا ثابت نہ کر سکا تو واک آؤٹ کر گیا۔

"اس کی باتوں میں نہ آنا بیبن! جانتی ہو نا، جری کو چڑانے کے لیے اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہے۔" امی بھی مسکرا رہی تھیں۔

"آپ رہنے بھی دیں امی! اپنے لاڈلے چھوٹے بیٹے کی حرکتوں پر پردہ نہ ڈالیں۔" تقی باز نہ آیا۔

"جری کو رہنے دو۔ وہ میرا بڑا بیبا بچہ ہے۔ پردے تو تمہاری حرکتوں پر ڈالنے پڑتے تھے۔ کیا بتاؤں میں تمہیں کس قدر شرارتی ہوا کرتا تھا یہ۔ پڑوسیوں نے مرغیاں پالیں تو جا کر ان کے انڈے چرا لاتا۔ سامنے والوں نے آسٹریلین طوطے پالے ہوئے تھے۔ یہ ایک روز پنجرہ کھول کر سارے اڑا آیا وہ لوگ شکایت لے کر آئے تو میں نے کتنی دقتوں سے بات سنبھالی پھر بھی تمہارے خالو جان کے کان میں بات پڑ گئی۔ وہ ناراض تو ہوئے سو ہوئے مجھے بھی غلط تربیت کے طعنے دے ڈالے۔ یہ جری بے چارہ تو میری انگوٹھی سے کھیلتا پھر رہا تھا۔ منزہ سے اس کی دوستی تو بہت تھی تقی کی نظر پڑ گئی تو کہانی بنا لی۔ وہ دن اور آج کا دن ہے اسے چڑاتا رہتا ہے۔" وہ بیبن کو بتا رہی تھیں۔

"آپ دیکھیے گا امی! میں تو عین اس جری کی شادی والے روز اس کی بیگم کو بھی یہی قصہ سناتا ہوا پایا جاؤں گا۔" تقی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تقریب اچھی تھی۔ جری ویسے کا دولہا بنا پھر رہا تھا اس نے بڑے شوق اور فخر کے ساتھ تقی کو اپنے دوستوں سے ملوایا تھا، لیکن ابھی کھانا بھی شروع نہیں ہوا تھا کہ لودھی صاحب کا سویا ہوا جلال جاگ اٹھا۔ انہیں کہیں سے تقی کے شوبز جوائن کرنے کی خبر مل گئی تھی۔ پھر انہوں نے مہمانوں کا لحاظ نہیں کیا۔ تقی کو بھری محفل میں وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ محفل میں موجود اکثر احباب کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

تقی کا سر جھکا ہوا تھا۔ بہت سارے اعتراضات کے باوجود وہ خاموش رہا اور ابا کو بھڑاس نکال لینے دی، لیکن پھر اس کی برداشت اس وقت بالکل ختم ہو گئی۔ جب ابا نے امی کی تربیت کو بھی الزام دیا، کچھ نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے۔

"آخر ایسا کیا کر دیا میں نے جو آپ اس قدر واویلا کر رہے ہیں۔" اس کی آواز دھیمی تھی لہجہ سخت۔

لودھی صاحب کی پیشانی پر بڑے بل پڑ گئے۔ غصے سے کنپٹی کی رگ اس قدر پھڑکنے لگی کہ گمان گزرا، ابھی پھٹ ہی جائے گی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی پر گرفت مضبوط کر لی۔ مبادا ہاتھ اٹھ ہی نہ جائے، لیکن کئی بار پیش بندی بھی بے سود رہتی ہے۔ غصے نے کچھ اس طرح سے حواس پر غلبہ پایا کہ وہ تقی پر ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ چھڑی کی پے در پے ضربیں اس کے کندھوں اور سر پر پڑ رہی تھیں۔ شدید طیش کے عالم میں وہ اسے مار رہے تھے اور زور زور سے گالیاں بک رہے تھے۔ بھری محفل میں سناٹا چھا چکا تھا۔ صرف ان کی زبان اور چھڑی کے چلنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ تقی منہ سر کے گرد بازو لپیٹے پٹ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سب ان کے غصے سے خائف تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ انہیں روکے حتیٰ کہ ان کے سگے بھائی میں بھی نہیں پھر رضی نے ہمت کی۔

"بس کر دیں ابا! وہ مر جائے گا۔" اس نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

"مر جانے دو، ایسی نافرمان اولاد کا مر جانا ہی اچھا ہے۔" وہ بری طرح ہانپتے ہوئے بولے۔

"دنیا کیا کہے گی۔۔۔ باقر لودھی کا بیٹا، عبدالباری لودھی کا پوتا، میراثی بنا گھوم رہا ہے۔ اس کے شوق کے لیے میں اپنی خاندانی شان و شوکت پر حرف نہیں آنے دوں گا۔"

"اس نافرمان سے کہو ابھی کے ابھی اس گھر سے دفع ہو جائے اور پھر ساری زندگی مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔ اس کے بعد میراثی بن کر ناچتا پھرے یا ڈرامے کرے۔ اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔"

وہ زور دار لہجے میں حکم سنا کر خاموش ہو گئے۔ محفل میں ایسی خاموشی تھی جیسے کسی کی موت کی خبر آ گئی ہو اور تقی جس طرح مار کھا کر زمین پر پڑا تھا یوں لگ رہا تھا کہ اس کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنونِ لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے۔ تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرونِ ملک مقیم ہے۔

۱۹

انیسویں قسط

شہزاد سلیم 'بلال سلطان کا پرسنل سیکریٹری تھا 'شہزاد کے اپنے باس سے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے کسی باس کے اپنے ماتحت سے ہوتے ہیں۔ وہ بلال سلطان کی شخصیت کو کام کی حد تک خوب سمجھتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ کون سی صورت حال باس کے موڈ پر کیسا اثر کرے گی اور صورت حال سے مراد کاروباری صورت حال تھی۔

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ کس قسم کے کاروباری دوستوں اور پارٹنرز کے ساتھ باس کا رویہ کیسا ہو سکتا ہے۔ بلال سلطان کاروبار کے معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا اور شہزاد کا خیال تھا کہ یہی خوبی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔ بڑے سے بڑے نقصان اور بڑے سے بڑے نفع کی خبر سنتے ہوئے بھی بلال کے رد عمل ایک سے ہوتے تھے۔ نقصان کی خبر سن کر بھی وہ سرہلاتے ہوئے کہتا۔

"Now we have to see how to reverse it"

(اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس صورت حال کو ہم فائدے کی طرف کیسے موڑ سکتے ہیں)

اور بڑے سے بڑے فائدے کی خبر سن کر بھی وہ سرہلاتے ہوئے کہتا۔

"Now we have to see how to double it"

(اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اسے دگنا کیسے کر سکتے ہیں)

شہزاد نے کبھی بھی بلال کو کسی بڑے فائدے کے دوران ترنگ میں آکر بڑی بڑی باتیں کرتے اور نقصان کے دوران ڈپریشن کے دورے پڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے باس کا یہ انداز بہت پسند تھا اور وہ کوشش کرتا کہ وہ اپنے مزاج کو بھی اسی مزاج میں ڈھال لے اور بلال کی شخصیت کی تقلید کرے۔

اتنے برسوں میں صرف ان دنوں اس نے باس کو آپے میں نہ رہتے ہوئے پایا تھا جب سعد سلطان اچانک منظر سے غائب ہوگیا۔ اس صورت حال میں بھی شاید ایک دو دن اس نے انتظار میں گزارے۔ تیسرے دن وہ کسی نامعلوم اغواکار کی فون کال کا انتظار کرتا رہا جو اس سے تاوان میں بڑی رقم مانگنے والا تھا۔ چوتھے دن تشویش اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہوئی اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ شہزاد 'باس کا ایک نیا روپ دیکھتا رہا۔ باس کے "لوگ" حرکت میں آنا شروع ہوئے اور پھر جیسے کنوؤں میں بانس ڈالنے کا عمل شروع ہوگیا۔ پل پل کی رپورٹیں مختلف کونوں سے آنے لگیں 'تمام بزنس میٹنگز کینسل ہوئیں 'کاروبار کا پہیہ ایک دم رک سا گیا۔

ان دنوں پہلی بار شہزاد کو محسوس ہوا کہ بلال سلطان ایک میکانکی روبوٹ نہیں 'گوشت پوست کا ایک ایسا انسان ہے جس کے سینے میں دل بھی ہے اور وہ دل دنیا میں موجود اتنے سارے لوگوں میں سے صرف ایک شخص کے لیے دھڑکتا ہے۔ شہزاد کو بلال کا یہ روپ دیکھ کر اچنبھا بھی ہوا 'خوشی بھی ہوئی اور شاید ہلکی سی مایوسی بھی۔ میکانکی کھلونے سے کون توقع کر سکتا ہے کہ وہ انسانوں جیسے جذبات کا اظہار کرنے لگیں گے 'لیکن باس کی یہ صورت حال زیادہ دن نہیں چلی 'سعد سلطان کی گاڑی وصول کرنے کے بعد وہ یوں سکون پذیر ہوا جیسے کبھی اس کے لیے پریشان ہوا ہی نہیں تھا۔

"کمال ہے یار! گاڑی ہی ملی ہے 'سعد سلطان تو نہیں ملا۔ باس اس پر ہی مطمئن ہوگیا 'بھلے سعد سلطان کو کسی نے قتل کرکے پھینک دیا ہو اور گاڑی وہاں کھڑی کرکے چلا گیا ہو۔" شہزاد بھی اس طرح کی چہ میگوئیاں کرنے والوں میں شامل نہیں ہو سکتا تھا 'بلال سلطان کا پرسنل سیکریٹری تھا اور مرکزی دفتر میں بیٹھا روبوٹ 'انسانی چولا اتار کر تہہ کرنے کے بعد اسے واپس رکھ چکا تھا۔

"اب وہ صرف اور صرف بزنس کرے گا۔" یہی تختی اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی کے پیچھے چھپی نظر آرہی تھی۔

شہزاد وہ "یوسف نبیل" چھوڑ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔ اس روز باس کی آفس آمد کے بعد خوش گوار حیرتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ باس نے آفس آتے ہی شہزاد کو اپنے پاس بلا کر اس دفتر میں موجود تمام عملہ کی اگلی تنخواہوں کے ساتھ ایک صحت مند اضافی رقم بونس کے طور پر لگا کر بھجوانے کی ہدایت کی تھی۔ دفتر عرب ریاستوں کے کاروباری اداروں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اتوار کو تعطیل کے لیے بند ہو سکتا تھا نہ ہی یورپی ممالک میں کاروباری تعلق ہونے کی وجہ سے جمعہ کو بند رکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس مرکزی دفتر میں مرکزی کام ہوتا تھا 'یہاں کا عملہ محدود 'لیکن سب کا سب اعلا تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھا جس کے ہر رکن کی تنخواہ لاکھوں میں جاتی تھی۔

بے وقت 'غیر متوقع بونس عملے کے ہر رکن کا کتنے کلو خون بڑھانے والا تھا 'شہزاد کو بخوبی اندازہ تھا 'اسی لیے وہ جلد سے جلد اسٹاف کو یہ خبر سنانے کے لیے بے چین تھا۔ دوپہر بارہ بجے تک وہ مسلسل باس کے ساتھ مصروف رہا اور اس دوران اس نے محسوس کیا کہ باس نے پہلو بدلتے ہوئے دو سے تین بار آفس میں لگے وال کلاک 'اپنے فون کی اسکرین آن کرکے اور اپنی کلائی پر بندھی بیش قیمت رسٹ واچ پر نظر دوڑائی تھی۔ یقیناً "وہ وقت کے کسی حصے کے معاملے میں بے چین تھے۔

"شہزاد! کافی منگوالو 'کچھ دیر میں ہی سعد یہاں پہنچتا ہے۔" ایک فائل پر سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے انہوں نے اچانک رک کر کہا تھا۔

"س... سعد!" شہزاد نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔ "مطلب سعد سلطان؟"

"ہاں!" انہوں نے سرہلایا اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیوں کوئی اور سعد بھی ہے کیا ہمارے یہاں کے اسٹاف میں؟"

"نن... نہیں سر!" شہزاد نے اپنی ہکلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دراصل سعد صاحب کافی دنوں سے آ نہیں رہے تھے نا۔"

"ہاں 'نہیں آرہا تھا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے پھر ان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھری۔ "لیکن آج سے اس کی وہی پرانی والی روٹین شروع ہو جائے گی۔" انہوں نے شہزاد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اوہ اچھا!" شہزاد اپنی بوکھلاہٹ پر قابو ہی نہیں پا رہا تھا۔ "میں ابھی کافی کا کہہ کر آتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ انٹرکام پر کافی کا کہنے کے بجائے خود دفتر سے اٹھ کر باہر آنے کا مقصد صرف اور صرف اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانا تھا۔

شہزاد کی منگوائی کافی آئی 'گوئین این کی قیمتی طشتری میں رکھے سفید کافی کپس میں موجود بلیک کافی کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی تھی اور اس کی بھاپ اپنے ساتھ اس کی خوشبو بھی سارے میں بکھیرتی تھی 'لیکن پھر شہزاد نے دیکھا اس کے اپنے کپ کے علاوہ دوسرے دونوں کپ یونہی بھرے بھرے پڑے ٹھنڈے ہونے لگے 'بھاپ معدوم ہوئی اور پھر اٹھنا بند ہوگئی 'کپ کی اوپری سطح پر تیرتے کافی آرٹ کے شاہکاروں کی ہیئت بگڑتی اور پھیلتی چلی گئی اور اس سارے عمل کے دوران باس کے چہرے پر موجود تاثرات نے بھی کئی رنگ بدلے۔

سعد سلطان کو دن کے گیارہ بجے تک آفس پہنچنا تھا۔ گیارہ سے بارہ بجے تک باس گاہے بگاہے وقت پر نظر ڈالتا رہا اور اس کے بعد ہی کافی کی رنگت 'خوشبو 'بھاپ۔ باس کی کیفیات کی طرح بدلنے لگے تھے۔

ایک کے بعد ایک فون کال 'باس کے چہرے کی تشویش اور زاویے بڑھاتی اور بدلتی چلی گئی۔ سعد سلطان کو گھر سے ڈرائیور کے ساتھ نکلنا تھا 'وہ ڈرائیور کو گھر پر بیٹھا چھوڑ کر اکیلے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر سے نکلا تھا۔ اس کو آفس کے راستے میں سرجن ڈاکٹر عبداللطیف کے کلینک پر رکنا تھا 'جہاں اس کے لیے خصوصی اپائنٹمنٹ لی

گئی تھی' وہ وہاں مقررہ وقت پر نہیں پہنچا تھا۔ اس کی وہ گاڑی جس پر وہ گھر سے نکلا تھا' کمپنی کے ایک نسبتاً چھوٹے ذیلی دفتر کے باہر کھڑی تھی' دفتر کے باہر کھڑے گارڈ نے سعد سلطان کو وہاں گاڑی لاتے نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد سعد سلطان ایک بار پھر غائب تھا۔ شام تک ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کر لینے کے بعد بھی اس کا کوئی سراغ نہیں مل پایا تھا۔

"بونس کی نیوز تو بریک ہونے سے پہلے ہی واپس لے لی گئی شاید۔"

اس رات بلال سلطان کی ذہنی کیفیت سے بے خبر شہزاد نے سونے سے پہلے آخری بات سوچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں۔ بدقسمتی سے وہ ایک بار پھر غائب ہو گیا۔"

ماہ نور کو یہ بات بتاتے ہوئے ابراہیم کا لہجہ اور انداز ایک ایسے مجرم کا سا تھا جو اعتراف کر رہا ہو کہ سارا جرم صرف اسی کا تھا۔

"کمال ہے۔" ماہ نور کے تیور بگڑ گئے۔ "پانچ دس منٹ میں ہی وہ پھر سے غائب ہو گیا جیسے ہی تم نے بتایا کہ وہ مل گیا ہے اور اس کا فون آن ہے' میں نے اسے کال کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا' اس وقت بھی اس کا فون بند جا رہا تھا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں؟ کیا اس کی گم شدگی کے بعد اس کے مل جانے کا وقفہ اس کی دوبارہ گم شدگی سے پہلے صرف تمہارا خواب تو نہیں۔"

"اب تو مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" ابراہیم نے سر جھکا کر کہا۔ "جیسے وہ خواب ہی تھا' مگر۔" اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "مگر وہ خواب نہیں تھا' یقین جانو' میں نے خود تین گھنٹے تک اس کے ساتھ مغز ماری کی تب جا کر وہ میرے ساتھ اپنے گھر آنے پر رضامند ہوا۔ میں نے اس سے غلط بیانیاں کیں اور یقین دہانیاں بھی اور میں بڑا خوش تھا کہ سعد جیسے چھلاوے کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا' گھر پہنچنے کے بعد وہ مجھ پر گرم ہوا' ناراض ہو گیا' آئندہ کبھی بات نہ کرنے کی دھمکی بھی دی' لیکن میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ میں اسے پکڑنے میں اور انکل کے سامنے لانے میں کامیاب ہو چکا تھا' میں اس کی گم شدگی کے دوران انکل کی حالت دیکھ چکا تھا اور اسے ڈھونڈ لینے کے بعد خود اس کی اپنی حالت بھی میری نظروں کے سامنے تھی۔ وہ صدیوں کا تھکا ہارا' شکست خوردہ اور پریشان حال نظر آ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ زخمی تھا' لباس شکنوں سے بھرپور جس پر گرد کے آثار بھی تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے نہ جانے کب سے سویا نہ ہو۔"

ابراہیم نے کچھ یاد کرتے ہوئے سر جھٹکا اور پھر ماہ نور کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں اسی بات میں خوش تھا کہ میں جھوٹ بول کر' غلط بیانی کر کے ہی سہی' باپ بیٹے کو ایک دوسرے سے ملا چکا تھا' وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور میں ہنس رہا تھا پھر وہ نارمل ہو گیا' انکل سے باتیں بھی کرنے لگا۔ اس کے بعد میں وہاں سے آ گیا۔ اگلے روز جب میں نے تمہیں میسج کیا' اس روز اسے آفس جانا تھا' ڈاکٹر کے پاس جانا تھا مگر وہ دونوں جگہ ہی نہیں پہنچا۔"

ابراہیم نے رک کر لمبا سانس لیا۔

ماہ نور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے آگے سننے کی منتظر تھی۔

"وہ شاید چند سیکنڈز میں حساب لگا چکا تھا کہ اسے آئندہ کیا کرنا تھا' انکل اس کی آمد پر خوش تھے' اتنے خوش کہ فوری طور پر اس کی نقل و حرکت کو آبزرو کرنے کی ڈیوٹیاں لگانے کا ان کو خیال بھی نہیں آیا ہو گا' لیکن وہ جانتا تھا اور خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگلی صبح تک' وہ اپنا پلان مکمل کر چکا تھا۔ اس نے انکل کے ساتھ نارمل انداز میں

ناشتا کیا' ان سے گپ شپ لگاتا رہا' ہنسی مذاق کرتا رہا' یوں کہ ان کو اس کے انداز میں ذرا سا بھی کچھ انہونا لگا نہ ہی کوئی کھٹکا محسوس ہوا۔"

"لیکن پھر وہ گیا کہاں؟" ماہ نور کو اس تفصیل سے زیادہ اس سے آگے سننے میں دلچسپی تھی۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی تک پتا نہیں چل سکا۔" ابراہیم نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔

"پہلے تمہیں وہ کہاں ملا تھا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ۔" ابراہیم کچھ کہتے کہتے رکا اور ماہ نور پر ایک نظر ڈال کر نظر چراتے ہوئے بولا۔

"ایک ایسی جگہ جہاں کے بارے میں میرا اپنا خیال تھا کہ وہ وہاں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

"وہ کون سی جگہ ہے؟" ماہ نور نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ ایک معذور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون رہتی ہیں' مری سے ذرا سا آگے۔" ابراہیم یوں بولا جیسے اسے سعد کے اس فعل پر شرمندگی محسوس ہو رہی ہو۔

"میں نہیں جانتا کہ اس لڑکی سے سعد کا کیا تعلق ہے۔" "میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ وہاں جایا کرتا تھا' ہر طرف سے مایوس ہو کر محض ایک بار دیکھ لینے کی خاطر وہاں گیا تھا اور۔۔۔"

"اور وہ وہیں موجود تھا۔" ماہ نور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا' ابراہیم کو لگا جیسے ماہ نور ایک دم ٹرانس کی کیفیت میں چلی گئی تھی۔

"تم یوں ہی خوار ہوئے' تمہیں سب سے پہلے اسی جگہ جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے تھا۔" وہ یوں بولی جیسے کسی ناموجود شخص سے مخاطب ہو۔

"اور ابھی بھی۔۔۔" اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "ابھی بھی تمہیں وہیں جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے۔"

"نہیں۔۔۔" ابراہیم نے ماہ نور کی کیفیت دیکھ کر سکتے میں آتے ہوئے کہا۔ "وہ وہاں نہیں ہے' ہی ہیز لیفٹ دی کنٹری' وہ ملک چھوڑ چکا ہے۔"

"پھر وہ بھی ساتھ ہی ہو گی اس کے۔۔۔" ماہ نور نے یقین سے کہا۔ "اسی کی خاطر ملک چھوڑا ہو گا اس نے۔۔۔"

"نہیں۔" ابراہیم ابھی بھی ماہ نور کے اس بدلے ہوئے انداز پر بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکی اور خاتون یہیں ہیں اور اس کے بارے میں بے خبر ہیں۔" اس نے ماہ نور کو تسلی دینے کے سے انداز میں کہا۔

جواب میں ماہ نور نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا' آنسو بہنے سے روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ اس کوشش میں کپکپا رہے تھے اور ذہن میں کئی قسم کے خیال اٹھ رہے تھے۔ وہ دونوں اس وقت ابراہیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے' اوائل سرما کی وہ سہ پہر خاموش اور اداس تھی۔ اس نے شیشے کی دیوار کے پار سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا' یہ اس شخص کا شہر تھا جس کے لیے وہ اپنا شہر چھوڑ آئی تھی' مگر سیکڑوں' ہزاروں کے اس ہجوم میں وہ خود کہیں بھی نہیں تھا' اس کی آنکھوں سے چند آنسو لڑھکے اور اس کی گود میں جا گرے۔ وہ اپنے دل میں اسے ہر صورت کہیں ڈھونڈ نکالنے کا عزم کر کے آئی تھی' مگر وہ تو کہیں بھی نہیں تھا' جس کی خاطر اس نے اپنا شہر چھوڑا' وہ ملک ہی چھوڑ گیا تھا۔

"ایک معذور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون رہتی ہیں' مری سے ذرا آگے۔" رہ رہ کر اس کے کانوں میں ابراہیم کا یہ جملہ گونج رہا تھا۔

"اور یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے' پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا' بالکل

وہیں ملنا چاہیے تھا۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے جیسے خود کو یقین دلایا۔

"کبھی تمہیں یہ خیال بھی آیا ابراہیم کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے' وہ کیوں سب سے بھاگ اور چھپ رہا ہے۔" کچھ دیر بعد ماہ نور نے ابراہیم کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"جتنا میں اس کو جانتا ہوں' اس کے حساب سے تو یقیناً" اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہے' لیکن جو بھی وجہ ہے' اس سے اس معذور لڑکی سارہ کا کوئی تعلق نہیں ہے' یقین کرو۔" ابراہیم نے اپنے تئیں ماہ نور کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

"ہوں!" ماہ نور کے چہرے پر بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ "یہ تم کہہ رہے ہو نا جبکہ میں جانتی ہوں کہ اس لڑکی کا اس کی زندگی میں کیا مقام ہے۔" ابراہیم نے اس کی بات سن کر سر جھکا لیا۔

"جو بھی ہے۔" وہ ٹیبل پر رکھے چھری کانٹوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔ "جلد ہی پتا چل جائے گا' وہ کہاں ہے اور ایسا کیوں کر رہا ہے۔ تم جانتی ہو ماہ نور۔" پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "سعد کے فادر انکل بلال ویل کمپوزڈ (well composed) انسان ہیں۔ پچھلی بار سعد کے غائب ہو جانے پر وہ گھبرا گئے تھے' لیکن اس بار اگر وہ گھبرائے ہوئے بھی ہیں تو ظاہر نہیں ہونے دے رہے۔ وہ یقیناً" اس کے اس رویے کی وجہ جانتے ہیں کیونکہ اس بار اس کی تلاش کا ان کا اپنا انداز ہے' وہ مجھے بھی اس میں انوالو نہیں کر رہے' میں جو کوشش کر رہا ہوں' اسے تم اپنی سی کوشش کہہ سکتی ہو۔"

ماہ نور ابراہیم کی بات سن کر جواب دینے کے بجائے خاموشی سے شیشے کے باہر سڑک پر نظر آنے والے لوگوں اور گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اوائل سرما کے وہ دن چھوٹے ہو چکے تھے' دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی پھیلنے لگی تھی اور برقی قمقمے جابجا روشن ہو رہے تھے۔

"وہ ایسی ہی ایک شام تھی جب تم نے مجھے چیٹو باکس میں ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔" اس نے روشنی کی اس لکیر پر نظریں جماتے ہوئے یاد کیا جو لیمپ پوسٹ سے اتر کر سڑک پر بچھ گئی تھی۔

"اور یہ وہ جگہ ہے جہاں تم نے کہا تھا کہ اگر تم کسی بات کے بارے میں شیور نہیں ہوتے تو اس کی طرف جاتے ہی نہیں اور یہ بھی کہ اگر تم مجھے ایک اچھی دوست مان لینے کے بارے میں پر یقین نہ ہوتے تو کبھی اپنے پرسنلز مجھ سے شیئر نہ کرتے۔" نجانے اسے کیوں ایسا لگا جیسے بلیک ڈریس پینٹ اور اسکائی بلو ڈریس شرٹ میں ملبوس سعد وہیں سامنے کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"التباس" اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی سسکی روکی۔ "مجھے التباس کیوں نظر آتے ہیں جبکہ مجھے معلوم بھی ہے کہ تم میری رسائی سے' بہت دور ہو۔"

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو' جتنی بار میں نے تم کو دیکھا ہے ان سے' بہت مختلف' بہت اچھی' خاصی sane لگ ہے آج تو۔" اس کے کانوں میں سرگوشی کی طرح آواز گونجی۔

"جھوٹ" اس نے پہلے کی طرح سر ہلایا۔

"میرے دل میں جو بات ہوتی ہے' میں کہہ دیتا ہوں' میں نے تم سے کہا تھا' میری یہ عادت نوٹ کر کے رکھ لو۔" پھر وہی سرگوشی جیسی آواز۔

"میری نوٹ بک کے تمام صفحے بھر گئے تمہاری عادتیں نوٹ کرتے کرتے' لیکن تم ابھی بھی التباس ہی ہو' یوں کہ ہاتھ بڑھانے پر بھی ہاتھ نہ آؤ۔" وہ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"او کے ماہ نور سی یو سم اور ٹائم See you some other time" ابراہیم نے پارکنگ میں کھڑی اس کی گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔

"ہوں!" اس نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔ لاک اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے وہ ایک خیال آنے پر مڑی اور ابراہیم سے مخاطب ہوئی۔

"ابراہیم! کیا کسی وقت میں سعد کے والد سے مل سکتی ہوں؟" اسے محسوس ہوا' اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"دیکھو۔" ابراہیم نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں فوری طور پر یقین سے ہاں نہیں کہہ سکتا' میں کوشش کروں گا کہ ان سے تمہاری ملاقات کرا سکوں۔"

"ہاں پلیز۔ کوشش کرنا اور اگر ایسا ممکن ہوا تو فوراً" مجھے انفارم کرنا' میں فی الحال ادھر ہی ہوں اسلام آباد میں۔" اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا اور ابراہیم کو خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو کپ آف ہیملاک سے ہی چونک گئی تھی۔" ضوفی نے اپنی جینز سے نادیدہ گرد جھاڑنے کے بعد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

"کپ آف ہیملاک جانتے ہو کیا مطلب؟" اس نے دانش مندوں کی طرح رازی کی طرف دیکھا جو صوفے پر پھیل کر بیٹھا منہ پر ہاتھ رکھے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"مجھے بھی پتا نہیں تھا۔" رازی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ضوفی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور جب مجھے پتا نہیں تھا تو تمہیں تو خیر کیا علم ہو گا۔" اس کے لہجے میں اپنی معلومات کے بارے میں یقین اور فخر اتر آیا۔

"میں نے گوگل پر سرچ کیا تو معلوم ہوا' ایک قسم کا زہر کہلاتا ہے ہیملاک۔" اس نے رازی کی طرف دیکھ کر سرگوشی سی کی۔

"کیا کہا؟" اب کے رازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یعنی کہ زہر...."

"یعنی کہ زہر...." ضوفی نے رازی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کی بات کی تائید کی۔

"اور وہ سعد سلطان' زہر کو ڈنر مینیو میں شامل کرا رہا تھا۔" رازی کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ "اور ڈنر سرو کرنے سے پہلے تم یا میں اسے چکھتے اور کوچ کر جاتے۔ اسے فٹ ٹو ایٹ کا سرٹیفکیٹ دیتے دیتے۔ اوہ خدایا!" وہ جیسے کسی انجانے خطرے کی زد سے باہر نکل آنے پر شکر کرتے ہوئے بولا۔ "شکر ہماری جانیں بچ گئیں۔"

"اور اگر ہم حسب معمول ڈنڈی مارتے ہوئے اسے چکھے بغیر فٹ ٹو ایٹ کا سرٹیفکیٹ دے دیتے تو بلال سلطان اور ابراہیم دونوں کا قتل ہماری گردنوں پر آجاتا۔" اگلے لمحے دوسری سوچ پر خیال آرائی کرتے کرتے اس کی آواز گھٹ سی گئی۔

"احمق ہو تم تو۔" ضوفی نے اسے ڈپٹا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کپ آف ہیملاک یوں مارکیٹ میں کھلے عام ملتا ہو گا کہ طلب کرنے پر فوراً" سیلڈ پیکنگ میں دستیاب ہو جائے گا۔"

"تو پھر؟" رازی نے ڈپٹے جانے پر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ صرف ایک " metaphorical phrase " تھی محترم۔" ضوفی نے ایک بار پھر دانش مندوں والا انداز اپنایا۔ "جس کا مقصد یہ اشارہ دینا تھا کہ سعد سلطان' باس اور ابراہیم کو ختم کرنا چاہتا تھا' اب ختم کرنے سے مطلب ان کی وہ خوشی ختم کرنا تھی جو اس کی گمشدگی کے بعد مل جانے پر پیدا ہوئی تھی یا کچھ اور' اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"لیکن کچھ مرنے مارنے کا سلسلہ تو تھا نا یار۔" رازی خوف زدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بہت ہی پیچیدہ اور پراسرار

ہوتے جا رہے ہیں' اس فیملی کے معاملات بھئی۔"

"فیملی!" ضوفی ہنسی۔ "ایک باپ اور ایک بیٹا۔۔۔ اسے فیملی کہتے ہو تم؟"

"باپ' بیٹا ہی سہی' پوری ایمپائر بنا رکھی ہے دونوں نے بزنس میں اور یہ گھر۔" رازی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسٹیٹ ود ان اسٹیٹ' لیکن حالات دیکھو' بیٹا' باپ سے دور بھاگتا ہے اور باپ بھاگے ہوئے بیٹے کو پکڑنے کے لیے اپنے بندوں کو بھگاتا ہے۔ یہ بھی اپنی طرز کی انوکھی میراتھن ہے۔ ان کی میراتھن میں ہم بے چاروں کی مفت میں سانس پھول پڑتی ہے۔ کل سے اب تک مواصلاتی رابطوں پر لگا ہوا ہوں۔ پل کا چین نہیں۔" رازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پھر کچھ کامیابی بھی ہوئی کہ نہیں۔" ضوفی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے پوچھا۔

"بس اتنی ہی کہ وہ اس دن گیارہ بجے کسی ایک فلائٹ سے دبئی اڑ گیا۔ دبئی میں کہاں ہے' فی الحال' پتا نہیں۔" رازی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ اور تیز قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یقیناً" سعد سلطان۔۔۔ کو دماغی دورے پڑنے لگے ہیں۔ جب ہی گھر سے بھاگتا ہے۔" ضوفی نے رازی کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ "بڑے لوگوں کے دماغی دورے بھی خوب ہوتے ہیں۔ گھر سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پہنچا دیتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"تو بھئی۔۔۔ اس دن کا ڈنر جب سے سبوتاژ ہوا ہے۔ ڈنر' لنچ کا جھنجٹ ہی ختم ہوا۔ کچن اسٹاف اور باقی عملے کا کیا ہے۔ آلو انڈے' آلو بینگن اور ایک سادہ سا چکن بنوالو۔ گزارہ ہو جائے گا۔ باس تو گیا اپنی ملٹی وٹامن گولیوں پر واپس۔ کھانا وانا فی الحال موقوف' باس کو چاہیے بیٹے کی واپسی تک "مرن بھرت" کا اعلان کر دے۔ خوب نام کما جائے گا۔" وہ خود کلامی کرتی اٹھی اور کچن کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

"میرا دل ایک نکے (چھوٹے) جئے کٹورے کی طرح ہو گیا ہے۔ بھائی رضوان الحق! بات بات پر بھر آتا ہے۔ کٹورا بھر جاتا ہے تو وگن (بہنے) لگتا ہے۔ میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ہو گیا ہوں۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ چاہتا ہوں سارا دن ہتھ تے ہتھ (ہاتھ پر ہاتھ) رکھ کے بیٹھا رہواں۔ اکھاں سامنے (نظروں کے سامنے) کج (کچھ) بھی نہ ہووے پر میں تکدا رہواں (دیکھتا رہوں۔)"

رضوان الحق منہ پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کھاری کی باتیں سن رہا تھا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا' وہ جس کھاری کو جانتا تھا' یہ وہ کھاری نہیں تھا۔ کھاری کی معصوم باتیں جن میں بعض اوقات وہ انجانے میں ہی بہت گہری بات کر جایا کرتا تھا۔ اس کا بات بات پر ہنس دینا۔ اس کی بے نیازی' سب یک دم کہیں غائب ہو چکی تھیں۔ یہ کھاری جو اس کے سامنے تھا بہت الجھا ہوا' تھکا ہوا' شکست خوردہ اور غم زدہ تھا۔ یوں جیسے اس کے ساتھ کوئی بڑا حادثہ گزر چکا ہو۔

اپنی شادی سے اگلے دن تو یہ بہت خوش تھا۔ پھر اب اسے کیا ہوا۔" اس نے سوچا۔ اس کی کال میں کوئی ایسی ہی بات محسوس ہوئی تھی۔ جیسے یہ بہت مشکل میں ہے۔ جب ہی تو میں فوراً" اس کی طرف بھاگا آیا۔ مگر جو یہ دیکھ رہا ہوں' اس کا اندازہ تو نہیں تھا مجھے۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے افتخار؟" اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ اپنے رستے سیدھے کرنے گئی ہے۔ ساڈے جئے (ہمارے جیسے) لوکاں (لوگوں) کے ساتھ بھی عجیب ہی ہوئی گزرتی ہے بھائی رضوان الحق! پہلے ہمیں انگلی سے پکڑ کر ایک راستے پر چلایا جاتا ہے۔ چلتے جاتے ہیں چلتے

جاتے ہیں' کوئی موڑ آتا ہے تو آسے پاسے (اِدھر اُدھر) دیکھتے ہیں۔ راستے پر چلانے والا کدھر گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تو غائب ہے۔ اب کیا کریں۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے کی طرف اشارہ کیا۔ جب کتنا ہی آسے پاسے کوئی نہیں ملتا تو خود ہی موڑ مڑ جاتے ہیں۔ پتا ہوتا نہیں کہ کھبے (بائیں) مڑنا ہے کہ سجے (دائیں) موڑ مڑ کر۔۔۔ جب کتنا ہی آگے پہنچ جاتے ہیں تو رستے پر چلانے والے کہیں سے نکل آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اوہو ہو' یہ کدھر نکل آئے تم۔ یہ تو تمہارا راستہ نہیں تھا۔ چلو واپس' پھر سے شروع کرو۔" کھاری کے چہرے پر دکھ پھیل رہا تھا۔

"تسی دسو۔" بھائی رضوان الحق' پھر سے شروع کرنا آسان کام ہے کیا۔ جو راستے تسی لنگ آئے (جو عبور کر چکے ہو۔) ان پر سے گزر کر واپس شروع ہو جانا سوکھا (آسان) کام ہے کیا؟" اس نے رضوان الحق کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

رضوان الحق نے جھرجھری لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"کتنا اوکھا کام ہے جی یہ۔" کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ آج کل یہ ہی اوکھا کام کر رہی ہے۔ پھر سے اسٹارٹ (اسٹارٹ) اپنے راستے سیدھے کرنے پر لگی ہوئی ہے جی۔"

"چلو' یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے رہنمائی ملنے لگی ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔" اگرچہ رضوان کو کھاری کی اس مہمل سی بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تھی۔ پھر بھی وہ اسے تسلی دینے کی خاطر بولا۔

"اس کی اچھی بات میں کھاری تو مفتے میں مارا گیا ناجی!" کھاری نے سر جھکایا۔

"نہ میں نہیں رہا نہ اس دا (اس کا) بندہ (شوہر)" ایک اور مہمل بات۔

"کیوں۔۔۔ خیر تو ہے نا؟" رضوان گھبرا کر بولا۔ "کیا وہ تمہیں چھوڑ گئی ہے؟"

"نہیں۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "ابھی تے نہیں چھوڑا پر لگتا ہے چھوڑ جائے گی۔ میں کل بھی اس کے قابل نہیں تھا۔ آج تو ہور بھی ناقابل ہو گیا ہوں گا۔ وہ بھل بھلیکھے (انجانے میں) میرے سینے نال آ لگی تھی۔ اب جب اسے اپنا راستہ سیدھا نظر آیا تو میرا سینہ اور اینٹ گارے کی دیوار ایک برابر ہو جائے گی۔ آپ ہی بتاؤ بھلا اینٹ روڑے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کوئی کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔" کھاری نے سوال کیا۔

"جنہیں تحفظ اور سایہ درکار ہوتا ہے۔ ان کو بعض اوقات دیوار بھی کافی ہوتی ہے سہارا لینے کے لیے میرے بھائی۔" رضوان نے کہا۔

"نہیں بھائی رضوان الحق!" کھاری نے سر ہلایا۔ "یہ بس کہنے کی باتیں ہیں۔"

"دیکھو' جب تک تم مجھے تفصیل سے سیدھی اور مکمل بات نہیں بتاؤ گے۔ مجھے شاید سمجھ نہ آئے کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہوا ہے؟" رضوان نے کہا۔

"میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسئلہ ہوا کیا ہے' پر مسئلہ ہے ضرور۔" کھاری نے فلسفیوں کے سے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "اصل میں بھائی رضوان الحق۔۔۔ کنفیوژن بڑا ہے۔" اس نے رضوان کی طرف دیکھا۔ "میں پہلے سمجھتا تھا کلا (اکیلا) میں ہی کنفیوژ ہوں۔ پر اب لگتا ہے' ہر بندہ ہی کنفیوژ ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ "آپ کو سعد باؤ صاب یاد ہے؟" اس نے رضوان سے پوچھا۔

"وہ جو تمہاری شادی پر آئے تھے اور جن کی آواز بہت اچھی تھی۔" رضوان نے کہا۔

"ہاں وہی۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "کتنے اچے (بڑے) بندے ہیں وہ۔ پیسہ بھی ہے۔ عزت' نام سب کچھ' مجھے لگتا تھا اچے (اونچے) ہی نہیں سچے (صاف) بندے بھی ہیں وہ۔ نہ غم' نہ کوئی فکر' نہ فاقہ' پر نا۔" اس نے ایک دفعہ پھر سر ہلایا۔ "میں نے کہا نا ہر بندہ ہی کنفیوژ ہے۔ مہ نور باجی نے بھین جی نوں دسیا کہ سعد صاب کی والدہ کدھرے

گواچ (گم) گئی ہیں۔ وہ ہر طرف اپنی ماں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔" اس نے رک کر اپنی بات پر رضوان کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔

"پر کنفیوژن اتنا زیادہ ہے کہ شادی کے دنوں میں کتنی بار بھین جی کو انہوں نے دیکھا اور سمجھ نہ سکے کہ کس کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں جو جنگلوں بیابانوں میں، میلوں ٹھیلوں میں، بازاروں میں، پہاڑوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ جہاں ملنے کی آس ہوتی ہے وہاں پوچھتا پھرتا ہوں۔ میری منزل تو میرے سامنے کھڑی ہے۔ بس ایک قدم آگے بڑھاؤں تو سراغ تو سامنے ہے۔ پر ستیاناس جائے اس کنفیوژن کا۔ عقل کا پردہ اپنی جگہ سے ادھی انچی (آدھا انچ) بھی نہ ہٹا۔ ادھر بھین جی تڑپتی رہ گئیں۔ ادھر سعد باؤ صاحب گڈی کا اسٹیرنگ (اسٹیئرنگ) سنبھال کر یہ جا وہ جا۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو بھائی افتخار؟" اب کے رضوان الحق کو لگا جیسے کھاری کے دماغ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی جو وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔

"او ٹھہرو جی۔ میں آپ کو سناتا ہوں ساری تفصیل۔" کھاری کو خود بھی محسوس ہوا کہ وہ رضوان کو کوئی راز کی بات بتانے کے بجائے کنفیوژ کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رضوان کے قریب بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼
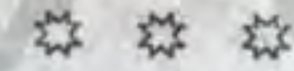
وہ کمرے کے درمیان۔ اکیلے کھڑے تھے۔ اس کمرے میں آنے سے پہلے وہ دو دن اس شش و پنج میں رہے تھے کہ انہیں ادھر آنا بھی چاہیے یا نہیں۔ شش و پنج کی یہ کیفیت بھی نہ جانے کتنے عرصے کے بعد ان پر وارد ہوئی تھی۔ ورنہ وہ اپنے معاملات میں پر یقین اور اٹل رہتے تھے کہ ایک کے علاوہ کوئی دوسری سوچ ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی تھی۔

"چاہے انسان اعلان کرتا پھرے یا عمر بھر اسے راز رکھے۔ جو بھی چیز اس کی کمزوری بن جائے۔ مات وہ اسی کے ہاتھوں کھاتا ہے۔" کمرے کے درمیان کھڑے کھڑے انہوں نے سوچا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی اشارے، کسی سراغ، کسی سبز بتی کو ڈھونڈتے ہوں۔ جس کو پانے پر وہ اپنی تلاش میں آگے بڑھ سکیں۔

سامنے کی دیوار پر ایک پورٹریٹ سائز تصویر موجود تھی۔ لیکن وہ دانستہ اس تصویر سے نظریں چرا رہے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہی اس تصویر پر ان کی نظر پڑی۔ ان کا چڑھایا آہنی خول آن کی آن میں ٹوٹ جائے گا۔

"اور یہ بھی کتنی عجیب سی بات ہے کہ جب سے وہ بڑا ہوا ہے، میں پہلی بار اس کے کمرے میں آیا ہوں۔ مجھے علم ہی نہیں کہ اتنے برسوں میں اس کے کمرے کا انٹیریئر کتنی بار بدلا۔ کس نے انتخاب کیا اور جس نے انتخاب کیا اس کا ذوق کیسا ہے۔" انہوں نے سوچا۔

"جو دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔ وہی اتنے فاصلوں پر کھڑا رہا اور میں فاصلے کے اس طرف کھڑا ہی نظروں کی پیاس بجھاتا رہا کہ تعلق جیسا بھی ہے۔ وہ نظروں کے سامنے تو ہے نا۔" انہوں نے کھڑکی پر برابر کیے ہوئے پردے ہٹاتے ہوئے سوچا۔

"کتنی بار اس کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے باہر دیکھا ہو گا۔" انہیں خیال گزرا۔ شاید اکثر یا شاید کبھی بھی نہیں۔

"لیکن سوچنا تو یہ ہے کہ وہ آخر کیوں بھاگ رہا ہے؟ اور بھاگ کر گیا کہاں ہے؟" وہ واپس کمرے کی طرف مڑے۔ جہاں کھڑکی سے پردہ ہٹنے کے بعد روشنی سی پھیل گئی تھی۔ انہوں نے کمرے کے فرش، فلور میٹس، بیڈ، کرسیوں، اسٹڈی ٹیبل اور دیوار گیر وارڈ روب پر نظر دوڑائی۔

"خیر بھاگ تو وہ جتنا بھی لے۔ جائے گا کہاں۔ ایک وقت تو اسے ہاتھ آنا ہی ہے۔" وہ سعد کے غائب ہو جانے پر خود کو خود دلاسا دینے میں مشغول تھے۔ لیکن ان کا دل کسی انہونی کے ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کی اطلاع کے مطابق وہ دبئی سے اگلی فلائٹ پر اسپین چلا گیا تھا۔ اسپین میں ان کے چند بندے اس کا پیچھا کرنے کے لیے حرکت میں تو آ چکے تھے۔ لیکن وہ اس کے پلان پر ششدر تھے۔ اس نے انہیں محسوس بھی نہیں ہونے دیا اور ایک رات میں انہیں چکمہ دے گیا۔

انہیں رہ رہ کر ناشتے کی میز پر ہونے والی آخری گفتگو یاد آ رہی تھی۔ وہ معنی خیز باتیں کر رہا تھا اور وہ اسے جان بوجھ کر طرح دیے جا رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معنی خیز باتوں اور ایک دوسرے کے خلاف گفتگو کے پوائنٹ اسکور کرنے کا سلسلہ عرصے سے جاری تھا۔ اس روز بھی وہ اسے معمول کا حصہ جان کر محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، وہ ابراہیم کے ہاتھوں پکڑے جانے پر تپا ہوا تھا۔ اسی لیے ایسی باتیں کر رہا تھا جن سے اس کا غصہ اور رد عمل جھانک رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ وہ ان سے فرار حاصل کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ فرار حاصل کرنا چاہ رہا تھا اور حاصل کر چکا تھا۔

"کیسی غیر فطری زندگی گزاری ہم نے۔" وہ شل ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ قربت میں فاصلے، فاصلوں میں قربت، اوپر اوپر سے ایک دوسرے کو جاننا، کبھی دل کے اندر جھانکنے کی کوشش نہ اس نے کی، نہ میں نے۔

اور ایسا اس لیے ہوا کہ میں خوف زدہ تھا۔ میرا دل خوف زدہ تھا۔ میرا اندر نظریں چراتا تھا۔ جو کبھی اس خاص سطح سے آگے بڑھ کر اس نے کچھ پوچھ لیا تو کیا میں خود کو جسٹی فائی کر پاؤں گا۔ کیا میں اس کو وہ وضاحت دے پاؤں گا جو میں آج تک خود کو نہیں دے پایا۔ کیا میرے اقرار اور میرے انکار مجھے اس کے سامنے ایک کٹہرے میں نہ لا کھڑا کریں گے۔ جہاں جرح ہو گی اور اپنی صفائی میں کہنے کے دلائل، مگر کیا وہ دلائل قابل قبول ہوں گے۔ کیا وہ اس گہرائی تک جا سکے گا جو حالات کے رخ موڑ سکتی ہے۔"

انہوں نے گردن پیچھے کرتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔

"شاید نہیں۔" اس شاید نہیں کے خوف نے ہی تو فاصلوں کو قربتوں میں ڈھلنے نہیں دیا۔

انہوں نے سر اٹھا کر یوں جھٹکا جیسے اپنے ہی نظریے سے متفق نہ ہوں۔

"اور اب جو اس کی ناشتے کے ٹیبل والی گفتگو یاد کرتا ہوں تو وہم آتا ہے کہ اس کے فرار کا تعلق ان ہی باتوں سے ہے جو ایک خاص سطح سے پار کی ہیں۔ اگر صرف کسی ایک اشارے کا نتیجہ یہ فرار ہے تو پوری داستان کا رد عمل کیا ہو گا صاحبزادے کی طرف سے۔"

انہوں نے بے دھیانی میں اسٹڈی ٹیبل کی دراز کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوچا۔ بے دھیانی میں باہر نکلی دراز میں ان کے لیے کیا موجود تھا۔ اسے باہر نکالتے ہوئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اشارے تھے۔ سبز بتی تھی۔ وہ اس میں موجود سراغ، اشاروں اور سبز بتی کو دیکھنے میں یوں محو ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔

☼ ☼ ☼
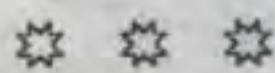
"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا، یہ کیا ہو رہا ہے؟" سیمی آنٹی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں آئے روز ہمیں تفتیش کے لیے سامنے بٹھالیا جاتا ہے۔ سعد سلطان کہاں چلا گیا ہے، جو ہم سے بار بار پوچھا جاتا ہے کہ بتائیں وہ کدھر ہے۔"

یسمی آنٹی کی آواز لرز رہی تھی اور اچھے خاصے خوش گوار موسم میں بھی ان کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے متوحش نظروں سے سارہ کو دیکھا جو چہرے کو ہاتھ پر ٹکائے خاموش بیٹھی خلا میں کچھ دیکھے چلی جارہی تھی۔

"سارہ!" انہوں نے سارہ کا بازو جھنجھوڑا۔ "کیا تمہیں کوئی فکر نہیں ہے؟ کیا تم ذرا سا بھی پریشان نہیں ہو رہیں؟"

"پریشان ہونے یا پریشانی دکھانے سے کیا فرق پڑے گا یسمی آنٹی۔" سارہ نے چہرہ ہاتھ کے اسٹینڈ سے ہٹاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ "مجھے تو صورت حال ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ کیا ہوا ہے، کیا ہونے والا ہے۔ کیا پتا ہے ہمیں۔"

"یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔" یسمی نے جھلا کر کہا۔ "تم نے اس روز اس سے کیوں کرید کر نہیں پوچھا کہ وہ جو تمہیں بینک اکاؤنٹس، کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کی تفصیل سنا رہا تھا تو کیوں سنا رہا تھا۔ تم نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس روز وہ اتنے رف حلیے میں کیوں تھا۔ میں نے ہاتھ کی چوٹ کا پوچھا تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔ اس کے ہر انداز میں اس روز کچھ غیر معمولی تھا۔ لیکن تم نے نوٹ کیا، نہ مجھے کچھ پوچھنے دیا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، وہ مجھے میرے کسی ایسے سوال کا جواب دیتا جو ہم سے باہر اس کی جنرل زندگی سے متعلق ہوتا۔" اس نے سوال کیا۔

"ہمارے لیے، ہمارے سامنے اس کا صرف ایک ہی روپ نمایاں ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "نیکی کے فرشتے کا روپ۔ اس سے آگے وہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کون ہے۔ میں اور آپ نہیں جانتے۔ پھر اس سے کیا سوال کرتے آخر ہم؟"

"تو پھر اتنا تو سوچو کہ آئندہ کیا ہوگا۔" یسمی آنٹی کے سامنے مستقبل کسی خوفناک بھتنے کی طرح ناچ رہا تھا۔ "ہمارا کیا ہوگا۔ یہ فلیٹ، یہ سامان۔" انہوں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ "زندگی گزارنے کے تمام وسائل۔" ان کے چہرے پر وحشت دوڑنے لگی۔ "سعد تو کہیں چلا گیا۔ وہ تو رابطے میں بھی نہیں ہے۔ سوچو ہم کیا کریں گے؟"

"حیرت ہے یسمی آنٹی! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔" سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ سعد کے یوں چلے جانے پر آپ کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔"

یسمی آنٹی اسی طرح وحشت زدہ چہرے کے ساتھ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کو وہ دن شاید بھول گیا۔" سارہ کے لہجے میں تلخی اتری۔ "وہ گفتگو بھول گئی۔ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ کیونکہ آپ کی اس گفتگو نے ہی مجھے باغ عدن سے دشت ظلمت میں لا پھینکا تھا۔ یاد کریں ذرا۔" اس کے لہجے کی تلخی بڑھی۔

"آپ نے کہا تھا، سعد تمہاری زندگی میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور جب وہ چلا گیا تو سوچو تم کیا کرو گی؟" سارہ کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا جارہا تھا۔

"مبارک ہو آپ کو۔" پھر اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "آپ کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ وہ مبارک وقت آن پہنچا جب سعد ہماری زندگیوں میں نہیں ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو روکنے کے لیے لمحہ بھر کو سر جھکایا۔

"مگر آپ کو کیا فکر۔" آپ کے تو دونوں ہاتھ سلامت ہیں اور ان دونوں ہاتھوں کو کام کرنے کی عادت بھی ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی اور ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "آپ جائیے، جا کر کروشیے اور اون سلائی کے شاہکار بنا کر بیچیے، سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کیجیے۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں کہ ہمارا کیا ہوگا۔ اس کے بجائے آپ کو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ سارہ اب تمہارا کیا ہوگا؟" اس نے بتانے کے سے انداز میں اس جملے کو ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے ہوئے کہا۔

"میرے ہاتھ۔" اس نے اپنے کمزور ہاتھ میز پر پھیلائے۔ جن پر نسیں ابھری ہوئی تھیں اور جن کی ہتھیلیوں کا رنگ زرد تھا۔ "اور میری ٹانگیں اس نے میز کے نیچے سے اپنی ٹانگیں باہر نکال کر پھیلائیں۔ "معذور ہیں، کمزور ہیں، کچھ کرنے کے قابل نہیں، لیکن پھر بھی مجھے سعد کے یوں چلے جانے پر یہ غم نہیں ستا رہا کہ آگے میرا کیا ہوگا۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"میرا دل یہ سوچ کر کٹا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا جو اس کے اپنے اس کو ڈھونڈنے یہاں چلے آئے۔ میرا ذہن یہ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا ہے کہ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا۔ اس روز جب وہ یہاں آیا تھا تو کتنا ٹوٹا ہوا اور دکھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی باتیں بے ربط تھیں اور معنی خیز بھی۔ مجھے ان کے معنی سمجھ میں نہیں آئے تھے اور اس روز سے ہی نہ جانے میرا دل کیوں اس خدشے میں تھا کہ اب شاید ہی کبھی میں اسے دیکھ پاؤں۔"

یمی آنٹی، سارہ کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پریشانی بھول گئیں۔

"مجھے اس وقت سوائے اس کے غم کے کوئی اور غم یاد نہیں یمی آنٹی!" اب اس کی آواز پست ہونے لگی۔ "وہ جو دنیا کے لیے پیسے والا آدمی ہے، جس کے پاس پیسہ ہے اور بہت ہے۔" اس نے یمی کو طنز سے دیکھا۔ "مگر مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ دل والا آدمی ہے۔ اس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا ہے۔ وہ ہے۔ جس کی آمد میرے لیے زندگی کا پیغام اور جس کی رخصت اس کی دوبارہ آمد کی امید دیتی رہی ہے۔ اب جس کے یوں چلے جانے سے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے زندگی رخصت ہوئی۔ صرف سانسیں باقی ہیں۔"

یمی آنٹی پھٹی پھٹی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"باقی رہا زندگی گزارنے کا معاملہ اور آئندہ آنے والے وقت کا انتظام۔" وہ سانس لینے کے وقفے کے بعد بولی۔ "تو میں نے کہا نا، وہ صرف پیسے والا نہیں دل والا آدمی ہے۔ پچھلے ایک عرصے سے وہ مجھے خود اپنے آپ پر انحصار کرنے کے سبق یوں ہی نہیں پڑھا رہا تھا۔" اس نے یمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ جس نے اس کے یوں دیکھنے پر شرمساری سے سر جھکا لیا۔

"یہ جو میرے ہاتھ کام کرنے لگے ہیں اور میری ٹانگیں چلنے لگی ہیں۔ ان کو کس نے کام کرنے اور چلنے کا حوصلہ دلایا۔ میں تصویروں میں رنگ بھرنے سے شروع ہو کر سوئی دھاگے کے کام تک کس کے کہنے پر پہنچی۔ اسی دل والے کے کہنے پر جس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا دل ہے۔ یوں ہی تو وہ اس روز مجھے بینک اکاؤنٹس، اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ کی تفصیل لکھ کر مجھے نہیں دے گیا۔" اس نے سر جھکا۔

"لیکن ان بے حقیقت چیزوں کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی حقیقت مجھ سے نظریں ملانے کو میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ وہ نہیں ہے یمی آنٹی۔ وہ کہیں نہیں ہے۔" اس نے اب اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں، نہیں بہنے دیا۔

"آپ لے لیں وہ سب، وہ سب تفصیلات آپ لے لیں۔ اکاؤنٹ، کارڈز، پیسہ سب آپ لے لیں۔ یہ جانے بغیر کہ وہ پیسہ اس نے مجھے کس مد میں دیا۔ زکوٰۃ کی مد میں یا خیرات کی مد میں۔ اسے اس وقت تک استعمال کر لیں یمی آنٹی! جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا۔" وہ بلند آواز میں روتے ہوئے بولی۔

"روزگار کا غم میرا روگ نہیں ہے۔ اس کی جدائی کا غم منانے دیں مجھے۔ وہ جو کہیں نہیں ہے۔ وہ جو کہیں گم ہو گیا ہے۔"

یمی آنٹی، سارہ کو روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی وقتی پریشانی بھول بیٹھی تھیں۔

"ابھی یہ صرف اس کے نہ ہونے کا غم منا رہی ہے۔ یہ اس بات سے بے خبر ہے کہ سعد کے لواحقین جو اسے ڈھونڈتے ہم تک آ پہنچے ہیں، وہ ہمارے اس کے ساتھ تعلق کی نوعیت کے بارے میں کتنے مشکوک ہو رہے ہیں۔"

جہاندیدہ یمی آنٹی کی سوچ سارہ سے بالکل مختلف سمت میں سفر کر رہی تھی۔ انہیں رہ رہ کر سعد کے متعلق سوال کرتا وہ گول مٹول لڑکا یاد آ رہا تھا جو یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ وہ دونوں یقیناً" جانتی تھیں کہ سعد کیوں اور کہاں گیا تھا۔ کیونکہ آخری بار اس نے سعد کو ان ہی کے فلیٹ کے نیچے پکڑا تھا۔

"اور اگر وہ ہمارے پیچھے پڑ گئے تو یہ فلیٹ، یہ اکاؤنٹ اور یہ پلاسٹک منی سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ پھر کھلا آسمان ہوگا اور ہم ہوں گے۔ یہ تو سو فیصد درست بات ہے کہ میں اپنے جینے کا سامان کر سکتی ہوں۔ مگر تم۔ تمہارا کیا ہوگا سارہ!" یمی کے دل میں سوال اٹھ رہے تھے۔ "کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ کسی کے سہارے کے بغیر تمہارا بوجھ اٹھا سکوں؟" وہ سوچ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
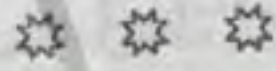
اس نے کمرے میں روشنی کا کوئی ذریعہ آن نہیں کیا تھا۔ وہ دوپہر سے صوفے پر ٹانگیں سمیٹے اپنے سامنے میز پر رکھی ان چیزوں کو دیکھے چلی جا رہی تھی جو اسے کوریر کے ذریعے موصول ہوئی تھیں۔ دوپہر گزری، سہ پہر نے سورج کا رخ بدل دیا۔ پھر شام کے سائے اترنے لگے اور کمرے میں روشنی کم ہونے لگی۔ روشنی کم ہوتے ہوئے تاریکی میں بدلنے لگی۔ لیکن اس کی ساکت نظریں میز پر رکھی ان چیزوں سے نہیں ہٹیں، پھر کمرے کے دروازے کے اوپر لگی اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی اس آواز نے اس کے ذہن کو چونکایا، لیکن یوں ہی بیٹھی رہی۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور اس کی آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی تھی۔ مجبوراً" اسے اپنی نظریں اس جگہ سے ہٹانی پڑیں اور اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔

"اُفوہ! کیا مصیبت ہے۔" وہ بلند آواز میں چلائی اور تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔

"کون ہے؟" بلند اور غصیلی آواز ساکت فضا میں پھیلی۔

"دودھ لے لیں میڈم! اور دودھ کا بل بھی دے دیں۔ آج ڈیو ڈیٹ ہے بل کی۔" باہر سے آواز آئی۔

"اگر تم آج بل نہ لیتے تو کیا قیامت آ جاتی؟" اس نے گیٹ کھول کر اسی درشتی سے کہا۔

"ملک شاپ پر پیسے جمع کروانے ہوتے ہیں میڈم! وہ انتظار نہیں کرتے۔" سامنے کھڑے لڑکے نے جواب دیا۔ وہ ان میڈم صاحبہ کے غصے اور درشتی سے واقف تھا۔ لہٰذا اس رویے سے بالکل بھی نہیں گھبرایا۔

"اس وقت میرے پاس گھر میں کیش بالکل نہیں ہے۔ کل لے لینا۔" اس نے دودھ کے پیکٹ پکڑتے ہوئے اسی درشتی سے کہا جو اس کی عمومی شخصیت کا خاصا تھی۔

"میں معذرت خواہ ہوں میڈم! پیسے تو مجھے لے کر ہی جانے ہیں۔" لڑکا تحمل سے بولا۔ اس کے لیے ایسے بہانے روزمرہ کا معمول تھے۔

وہ کچھ دیر غصے میں پھنکارتی شعلہ بار نظروں سے لڑکے کو گھورتی رہی اور پھر زور سے فرش پر پاؤں مارتے ہوئے واپس مڑ گئی۔ سات منٹ کے بعد گیٹ پر واپس آ کر اس نے پیسے بچ بچ لڑکے کے منہ پر مارتے ہوئے بلند آواز میں

اسے دفع ہو جانے کو کہا تھا۔

"تھینک یو میڈم! ہیو اے نائس ایوننگ!" لڑکے نے اپنی پی کیپ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور واپس مڑ کر اپنی موٹر بائیک اسٹارٹ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ٹھاہ کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ میڈم کے گیٹ بند کرنے کا انداز تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر مسکرایا اور بائیک کی سیٹ پر بیٹھ کر اسے سڑک کی طرف موڑتا اپنی اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔

"اُفوہ دنیا' انسان کو تنہا رہنے اور تنہا ہی زندگی کیوں گزارنے نہیں دیتی۔" اس نے بلند آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ جس پر ننھے ننھے ستارے جا بجا بکھرے پڑے تھے۔

"اسی لیے تو میں اپنی ذات کے دروازے بند کیے سب سے چھپ چھپا کر بیٹھی تھی کہ نہ کسی کو میرا پتا معلوم ہو نہ کوئی آئے اور دستک دے۔" اس کے چہرے کے نقوش غصے کے مارے بگڑنے لگے تھے۔

"برا ہو اس دوستی کا' جس نے لوگوں کو میرے راستے دکھا دیے۔" اس کا دماغ الٹنے لگا۔

"ہو گیا نا سب پھر سے درہم برہم۔" میز پر رکھی چیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔

"لگ گئے سراغ۔ اوپن ہو گئے سب کلوزڈ چیپٹرز' جیسے میں نے اپنی پہیلی انعامی معمے میں چھپوائی تھی کہ جو بوجھ لے گا اسے انعام ملے گا۔" اس نے شعلہ بار نظروں سے ان چیزوں کو گھورا۔

"نہیں چاہیے مجھے کوئی کلیو' نہیں چاہئیں مجھے کی ورڈز' نہیں چاہئیں مجھے گمشدہ پتے اور ان پتوں پر موجود حقیقتوں کا سامنا۔" آگے بڑھ کر میز پر رکھی چیزوں کو ہاتھ مار کر ادھر ادھر گراتے ہوئے وہ بلند آواز میں چلائی تھی۔ اس کے ہاتھ مارنے سے کچھ چیزیں قریب ہی اور کچھ دور جا گری تھیں۔ گرنے والی چیزوں میں دیسی باداموں کا ایک پیکٹ بھی تھا جو فرش پر گرنے کی چوٹ کھاتے ہی پھٹ گیا تھا اور اس میں موجود بادام ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ اس پیکٹ پر چسپاں پرچی پر سیاہ روشنائی میں ایک دلچسپ عبارت درج تھی۔

"آپ کی بے لوث میزبانی کا عوضانہ دیسی بادام' یقین جانیے بادام گو دیسی ہیں' کوتاہ قامت اور ناقابل اعتنا' لیکن اصلی ہیں۔ اس لیے کہ اپنے ہیں' خالص اپنے۔"

وہ اس عبارت کو پڑھ چکی تھی اور شاید اس کا مفہوم بھی سمجھ چکی تھی۔ لیکن وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنے سفید اور سیاہ امتزاج والے گھنگھریالے بالوں والا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
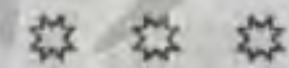
"میں نے تمہیں اپنی کہانی سنائی بھائی افتخار! اور تمہاری کہانی تم سے سنی۔ اب بتاؤ' کس کا بوجھ زیادہ ہے' کون زیادہ خوار ہوا؟"

"اسبغول تے کج نہ پھول۔" کھاری نے تاسف سے سر ہلایا۔ "جس کو پھولو' وہی دکھی' جس نوں سنو' وہی سچا بھائی رضوان الحق! میں نے کہا تھا نا بڑا ہی کنفیوژن ہے۔"

"ہر کوئی کسی دوسرے کی تلاش میں لگتا ہے۔ میری اور تمہاری کہانیوں کے سب کردار بھٹکتے پھرتے اور خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔" رضوان نے سر اٹھا کر خود پر جھکی درخت کی شاخوں کے چھدرے پتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ دن بھر کے حبس کے بعد آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ جس کے ساتھ درخت کے پتے بھی آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"سچ آکھیا بھائی رضوان الحق! کس کا سرا کس سے جا کر ملتا ہے' کون جانے۔" کھاری نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے تئیں اپنی ذات کے دکھ بیان کرنے بیٹھا تھا۔ مگر رضوان کی داستان سن کر اسے لگ رہا تھا۔ وہ اس سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ کم از کم اس کے سر پر اور کسی کا نہ سہی' چوہدری سردار کا سایہ تو تھا ہی۔

"تم ایک کام کرو بھائی افتخار۔" رضوان نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چنگے ہی رہتے ہیں یہ جپانی اور چینی گڈے۔" کھاری کو اس کی چھوٹی آنکھیں اور چھوٹی سی چپٹی ناک دیکھ کر خیال آیا۔ "شکلوں سے بہت معصوم لگتے ہیں۔ بھانویں (چاہے) اندر سے کتنے مکار ہی کیوں نہ ہوں۔" اسے اپنے ہی خیال پر ہنسی آنے لگی۔

"ہاں جی! کیا کام؟" وہ اس بے اختیار ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے رضوان سے پوچھنے لگا۔ "لگدا اے پتا نہیں کتنے سالوں بعد ہنسا ہوں۔" اسے خیال آ رہا تھا۔

"فوراً" سے پہلے اپنی بہن جی اور سعد صاحب کی ملاقات کا انتظام کرو۔ یہ بہت ضروری ہے بھائی! کوئی بچھڑا ہو تو کسی سے ملے نا' ہماری داستانوں میں۔" رضوان نے سنجیدگی سے کہا۔

"کتنے چھوٹے چھوٹے بال ہیں اس کے۔" کھاری بے دھیانی سے رضوان کی بات سنتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "مشین ہی پھیروا رکھی ہے بے چارے نے۔ لگتا ہے گھاس اگی ہوئی ہے نکی نکی۔"

"میری بات غور سے سن رہے ہو بھائی افتخار؟" رضوان کو اس کی غائب دماغی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"آہو جی!" کھاری چونکتے ہوئے بولا۔ "آپ کو بتایا تو ہے کہ مہ نور باجی اسی ویلے واپس چلی گئی تھیں' سعد باؤ صاب سے بات کرنے۔"

"تو پھر اب تک ان کی کوئی اطلاع تو نہیں آئی نا۔" رضوان نے کہا۔ "ان سے کسی نے پوچھا کہ سعد صاحب کی کیا خبر ہے؟ بہن جی کے بارے میں سن کر ان کا کیا رد عمل تھا؟"

"نہیں جی۔" کھاری نے کان کھجاتے ہوئے سر جھکا لیا۔ "آپ نوں بتایا تو ہے میں نے سعدیہ والی بات۔ مجھے تو اپنی پڑ گئی تھی جی۔ میں نمانا بڑا برا پھنسا بھائی رضوان! سپنے دیکھنے کی عمر تھی' پر کبھی دیکھے نہیں تھے۔ چوہدری صاحب انگل سے پکڑ کر سپنوں کی دنیا میں لے گئے۔ ابھی پوری طرح دیکھے وی نئیں تھے کہ دھکے نال جگا دیا کسی نے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"ضروری نہیں کہ بھیانک خوابوں کی تعبیر بھی بھیانک ہی ہو بھائی افتخار! کبھی کبھار خوابوں کی تعبیریں ان سے الٹ بھی ہوتی ہیں۔" رضوان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی بیگم کی واپسی کا انتظار کرو۔ واپس نہ آئے تو ہمت کرو اور جا کر اس سے پوچھو کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ گومگو میں پڑے رہنے سے بہتر ہے' انسان حقیقت سے نظریں چار کر لے۔"

"کوئی آسان کام بتاؤ رضوان بھائی! حقیقت نال نظریں چار کر لو۔ واہ جی واہ!" کھاری نے اس کی بات دہرا کر کہا۔ "پہاڑ تے چڑھ کر دوسرے پاسے اترنا آسان کام ہے۔ حقیقت نال نظراں ملانا بڑا اوکھا کام ہے میرے بھائی۔"

"تو کیا' پھر یوں ہی ادھر ادھر چھپتے پھرو گے' خود سے بھی اور لوگوں سے بھی؟" رضوان نے اب کے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "کیا فائدہ ہو گا اس چھپن چھپائی کا؟ ایک نہ ایک روز تو حقیقت تمہارے سامنے کسی کونے سے نکل کر آ کھڑی ہی ہو گی۔" کھاری خاموشی سے سر جھکائے زمین پر اگے سبزے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"اتنے بزدل ہو تو اسے کس برتے پر ہلا شیری دے رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر بننے کی تیاری کرے۔ تم اس کے ہونکیدار بن جاؤ گے۔"

کھاری نے کچھ کہے بغیر کچھ سوکھی زمین سے چند بوٹیاں نوچ کر اکھاڑیں۔

"خزانے کا چوکیدار بننا آسان کام ہے کیا؟" رضوان نے اس کا بازو ہلا کر کہا۔ "دس دفعہ دل بے ایمان ہوتا ہے بندے کا۔ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ چرانا نہیں تو خزانے کو ہاتھ لگا کر ہی دیکھ لیا جائے کہ یہ ہوتا کیسا ہے۔"
"بس ہتھ لگانے سے پہلے ہی خزانہ 'خزانہ' ہوتا ہے بھائی رضوان! ہتھ لگا لو تو خزانے کی ڈھیری بھی مٹی ہو جاتی ہے۔" پیروں کے بل اکڑوں بیٹھے کھاری نے خودرو بوٹیوں کا ایک اور گچھا اکھاڑتے ہوئے کہا۔
"خیر! ایسا بھی نہیں ہے۔" رضوان نے کہا۔ "سونے کے کچھ ڈھیر ہاتھ لگانے سے کندن بھی بن جاتے ہیں۔"
"بڑیاں اچیاں باتیں نہ کرو بھائی صاحب! میری سمجھ وچ کتابوں کی باتیں کہاں آتی ہیں۔"
"سمجھنے کی کوشش نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ بس بھابھی کی واپسی کا انتظار کرو۔" رضوان نے کہا۔
"یہ راستہ دیکھ رہے ہو آپ؟" کھاری نے نظر کے سامنے پھیلے ایک راستے کی طرف اشارہ کیا' جو کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں کی شکل میں بل کھاتا' سیدھا ہوتا' مڑتا پھیلا تھا۔
"ایہو ای راستہ آگے جا کر مسجد کے پاس سے گزر کر کھبے مڑتا ہے اور پھر مولوی جی کے گھر تک چلا جاتا ہے۔" اس نے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بڑا لمبا راستہ نہیں ہے جی' پر آج کل لگدا رستہ نہیں اے بندہ چلنے لگے تو ختم ہی نہیں ہوگا۔ ساہ چڑھ جائے رستہ نہ مکے۔"
"یہ راستہ نہیں ہے بھائی افتخار' انتظار کی کیفیت ہے' جو تمہیں تھوڑا سا فاصلہ میلوں پر پھیلا نظر آرہا ہے۔" رضوان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"میں اس کیفیت سے واقف ہوں۔ کیونکہ میں انتظار ہی نہیں کر رہا۔ معجزے کا بھی منتظر ہوں اور میرے سامنے تو نہ کوئی راستہ ہے' نہ منزل۔ بس سراب ہی سراب ہے۔" وہ شاید خود سے مخاطب تھا۔ اسی لیے کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔
"مگر تم فکر مت کرو۔ تمہارے پاس راستہ بھی ہے۔ منزل بھی۔ بس مقدر کو نظروں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آنا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم جیسے نیک نیت لوگوں کے مقدر ایک عرصے کے انتظار کے بعد جب یاوری کرتے ہیں تو اگلے پچھلے کئی ریکارڈ ٹوٹ جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔
"ٹپ۔" آسمان پر جمع ہوئے گہرے بادلوں سے ٹپکی پہلی بوند کھاری کے چہرے پر گری۔
"اوئے! اندر چلو۔ بادل برسنے لگا ہے۔"
پہلی بوند کے احساس نے کھاری کے اندر ایک عجیب سی سرشاری بھر دی۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح چیخ کر بولا اور رضوان کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتا ہوا فارم ہاؤس کی طرف آگیا۔
"جے تے میرا مقدر اچھا ہوا تو پھر بھائی رضوان الحق! ہم مل کر تمہارا معجزہ بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ ویسے اس کا نام بڑا عجیب سا ہے بھئی۔" فارم ہاؤس تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں اچھے خاصے بھیگ چکے تھے۔ کھاری نے اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے ہنس کر رضوان کو یقین دلایا۔
"تم سعد صاحب اور بہن جی کی فکر کرو پہلے۔" رضوان نے اپنے سر پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔
"چلو ٹھیک ہے۔" کھاری نے سر ہلایا اور سر جھکا کر مسکرایا۔ "ہو دسو بھلا' پریا رانی بھی کسی لڑکی کا نام ہوتا ہے؟" وہ دل میں محظوظ ہو رہا تھا۔ "جپانی گڈے بھی پیار کے نام جپانی زبان میں ہی نکالتے ہیں۔ نام بھانویں پرو دین اختر ہو اس کا' پیار نال بلاؤ پریا رانی۔" اسے بلاوجہ ہنسی آئے چلی جا رہی تھی۔
"چلو! شکر ہے تم مسکرائے تو۔" رضوان نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "میرا خیال ہے موسم بھی موڈ بدل ڈالتا ہے انسان کا۔"
"میرے جیسے بندے کا تو دل کا بوجھ نکل جائے' تے وہ مسکرانے لگتا ہے۔" کھاری مسکرایا۔ "آپ میرے بلانے پر آگئے' میرے دل کی سن لی' میں بھلا چنگا ہو گیا۔"
"بڑے خوش قسمت ہو بھائی! اتنی جلدی بھلے چنگے ہو جاتے ہو۔"
"چلو! آپ کہتے ہو تو ہوں گے خوش قسمت۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "آؤ' آپ نوں سٹڈ دکھاؤں۔"
"سٹڈ؟" رضوان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"سٹڈ نہیں سمجھدے۔" کھاری نے بے یقینی سے کہا اور پھر ہاتھوں میں فرضی باگیں پکڑ کر بازو ہلاتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ "ٹگا ٹگ ٹگا ٹگ... گھوڑے والا فارم۔"
"او! اچھا۔" رضوان نے سمجھ میں آنے پر کہا۔ "تمہارے چوہدری صاحب کو چاہیے' دو تین شیر بھالو چیتے بھی رکھ لیں اور اپنا سرکس کھول لیں۔"
"سرکس ہی تے لگا ہے چار طرف۔" کھاری نے ہنس کر کہا۔ "کوئی دیکھے تے تالیاں بجائے نا۔"
"کبھی کبھی تم سادگی میں بھی بڑی گہری بات کر جاتے ہو بھائی افتخار!" رضوان نے کہا اور کھاری کے پیچھے چل دیا۔

☼ ☼ ☼
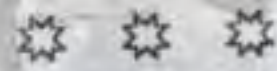
"طیفے نے سنا ہے' قسم کھائی ہے۔"
"اچھا! کس بات کی بھلا؟"
"میرے منہ میں خاک بڑے' سنا ہے' کہتا ہے' اس بن بارات کے دولہے کی گردن اتار کر رکھ دوں گا۔"
"ہاہاہا... ارے واہ! لیکن گردن اتار کر رکھے گا کہاں؟"
"آپ مذاق سمجھ رہے ہو جی! طیفے نے سنا ہے' کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی۔ جو کہتا ہے' پورا کر کے رہتا ہے۔"
"تو گردن میری اترنے جا رہی ہے۔ آنسو تمہارے بہنے لگے۔ ٹانگیں بھی لگتا ہے' کانپ رہی ہیں۔"
"تو ایسی باتیں سن کر میں جھومر گانے لگوں اور لڈی ڈالوں کیا؟ ٹانگیں تو دہشت کے مارے کانپ رہی ہیں۔"
"اچھا تو پھر تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟"
"آپ ادھر زیادہ آنا جانا بند کر دیں جی۔ دشمن کے ارادوں پر آگ برسے' پر آپ کی جان کی سلامتی چاہیے۔"
"ارے بھئی! میں آنا جانا کیسے بند کر دوں... یہاں میری بی بی رہتی ہے۔ جو آج کل دوسرے جی سے ہے اور..."
"اور کیا؟"
"اور یہاں تم رہتی ہو' جو مجھے جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی ہو۔ تم کہتی ہو کہ مجھے بھاگ لگیں تو پھر دیکھ لو کیسے بھاگ لگے مجھے۔ کاروبار ایک دم اوپر جا رہا ہے۔ بس وہ فارغ ہو جائے خیر سے تو یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔"
"اللہ آپ کے شملے کو اور بھی اونچا کرے' اللہ اونچے دروازوں اور کڑی دیواروں والے محل عطا کرے۔ اللہ تے خیراں رکھے جی' لیکن مجھے بڑی فکر ہے۔ اس کی تو حالت ہی ایسی ہے۔ اس کے سامنے میں یہ باتیں نہیں کر سکتی۔ لیکن آپ کو سمجھاتی ہوں' اپنی جان کی سلامتی کا لحاظ کریں۔ نہ آیا کریں ادھر زیادہ۔"
"اچھا! اگر اتنا ہی خطرہ ہے اور حفاظت کا تردد ہو نہیں سکتا تو یہ پہلوان سراج سرفراز کیا کر رہا ہے ادھر؟ اس کی جیب میں دو ڈھائی سو روپے کیوں جھونکے جاتے ہیں ہر مہینے؟"
"اگ لگے اس ناس پیٹے کو تو جی۔ مشٹنڈا چار چار روٹیاں کھا کر بس ڈکار مارنے اور اپنے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں

پھیلا کر لیٹے لیٹے چارپائی توڑنے کو ادھر پڑا رہتا ہے۔"

"استغفر اللہ توبہ کرو۔ نمازی پرہیزگار بندہ ہے۔ اتنے برے برے الفاظ مت بولا کرو اس کے لیے۔"

"بولا نہ کروں تو اور کیا کروں۔ طیفا لاٹر سامنے والے چوبارے پر کھڑا لال لال آنکھیں نکالے گریبان کھولے ادھر جھانکتا رہتا ہے دن بھر اور یہ کم بخت سرنیچا کیے وضو کے لیے پانی اور کھانے کے لیے روٹی سالن مانگنے کے سوا کچھ کر نہیں سکتا۔ آپ کی زوجہ محترمہ بھی اپنے نام کی ایک خاتون ہیں۔ دل کی تسلی کو یہ مشٹنڈا ادھر بٹھا چھوڑا ہے۔۔۔ اناج کا دشمن۔۔۔ ہمیں تو گھر سے پڑ رہا ہے کم بخت۔"

"ہوں۔ سنا ہے، محلے والوں کو بھی اس کے ادھر پڑے رہنے پر اعتراض ہے؟"

"اعتراض نہ ہو تو اور کیا ہو۔ وہ تو کہیں گے ہی اور ٹھیک ہی کہیں گے کہ دو جوان جہان لڑکیوں کے گھر میں یہ باہر کا مشٹنڈا کیا کر رہا ہے۔۔۔ نامحرم آگ لگنا۔"

"ہاں! یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔"

"آپ سمجھائیے اپنی زوجہ کو۔ اسے تو انگلی سے پکڑ کر نکال باہر کریں اور خود آپ کے سامنے تو۔۔۔ یہ لیں میرے ہاتھ جڑے ہوئے ہیں۔۔۔ ادھر آنا کم کردیں۔"

"نہ بھئی! میں ادھر آنا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہفتے کے شروع میں جب تک تمہاری دعاؤں کا کوٹہ نہ سمیٹ لوں مجھ سے کاروبار نہیں ہوتا۔"

"میری دعاؤں کا تو بہانہ ہی ہے۔ اصل میں تو سرکار اپنی زوجہ کی من موہنی صورت اور میٹھی آواز سننے تشریف لاتے ہیں۔"

"کیا سولے آنے سیانی بات کی ہے تم نے۔ یاد کرو، جب میں پہلے پہل یہاں آنا شروع ہوا تھا تو مجھ سے دس، بیس روپیہ بخشش لے کر تم کتنی دعائیں دیتی تھیں مجھے۔ اونچی شان، اونچے بھاگوں کی۔ دیکھ لو! تمہاری دعائیں لگ گئیں مجھے۔ جس کی خاطر طیفا لاٹر گردنیں اتارنے کو باؤلا ہوا پھرتا ہے وہ میرے عقد میں آگئی۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔ مگر ہے بڑا خونی فیصلہ۔ طیفے جیسے بندے کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک چھوڑ۔۔۔ دس گردنیں اتار سکتا ہے وہ۔ پہلے بھی کتنی ہی اتار چکا ہے اور پھر بھی کھلا پھرتا ہے۔"

"چلو! تم دعا کرو۔ یہ خیر سے فارغ ہو جائیں۔ پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔"

"میں نہ کروں گی دعا، تو اور کون کرے گا۔۔۔ یہاں سے نکل چلیں گے تو اس مولواتوں کے لمڈے سے تو نجات ملے گی کم از کم۔"

"بھئی! تمہاری کیٹگریز سمجھ میں نہیں آتیں مجھے۔۔۔ تمہیں طیفا لاٹر زیادہ برا لگتا ہے یا یہ سراج سرفراز؟"

"طیفا برا نہیں لگتا۔ اس سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ لیکن اس سراج سے تو ایک عجیب سی چڑ ہے مجھے۔ مگر آپ مجھے اس بار طیفوں اور سراجوں کی باتوں میں الجھا کر بچ نہیں سکتے۔ خیر سے لڑکا ہوا تو سچے سونے کے کنگن لوں گی میں۔"

"سچے سونے کے نہیں، سچی چاندی کے۔"

"ارے جائیں صاحب! بڑے کاروباری بنتے ہیں۔ سونے کو چاندی میں بدل دیا۔ جائیں، جائیں ہم کچھ بھی نہیں لیتے۔ میرے لیے چاند جیسا لڑکا ہی بہت ہو گا۔"

"اوہو! تم تو برا مان گئیں۔ اچھا چلو، سونے کے کنگن فائنل ہو گئے اور بتاؤ۔"

"اور کچھ نہیں بتانا۔۔۔ شش۔۔۔ اب خاموش ہو جائیں۔ آرہی ہے آپ کی زوجہ۔۔۔ جو سن لی نا اس نے طیفے والی بات تو مار جوتوں کے فرش کردے گی مجھے۔"

"تمہاری بولتی بھی اسی کے سامنے بند ہوتی ہے۔"

"بھاگ لگے رہیں اسے۔ سلامتی ہو اس کی۔ اللہ شان اونچی رکھے اس کی۔ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں۔"

"ہاہا۔۔۔ بھئی تمہارے اندر کی میراثن نہیں مرتی۔ جتنی مرضی کوشش کرلو تم ریفائن ہونے کی۔ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ میرا بچہ تم پالو گی تو یہ جراثیم اس میں بھی ٹرانسفر کردو گی۔"

"دیکھ لینا صاحب جی! وہ ماں باپ سے زیادہ مجھ پر پڑے گا۔ دن رات تو میں ہی ساتھ ہوں آپ کی زوجہ کے۔"

"جب ہی مجھے ڈر ہے کہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی "بھاگ لگے رہیں" کے نعرے نہ مارنے لگے۔"

"میراثیوں کی سنگت میں بیٹھنے والے میراثی نہ بنیں تو بھی میراثی پن آہی جاتا ہے ان میں بچ کر رہیے گا سرکار۔"

"بچ نہیں سکتا نا، تمہارے تیر دعا کا شکار ہو چکا ہوں، جب تک لے نہ لوں چین نہیں آتا۔"

"شش ششش۔۔۔ چپ۔۔۔ آرہی ہے وہ۔ مار نہ کھا لینا کہیں۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے ایک شکایت ہے ابراہیم!" انہوں نے میز پر رکھا کرسٹل کا پیپر ویٹ اٹھا کر ہاتھ میں گھماتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میں اس پر پیشگی معذرت خواہ ہوں انکل!"

"پوچھو گے نہیں کیوں؟" انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"یقیناً" اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہو گی۔" ابراہیم نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ ان کی طرف دیکھنا چاہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس روز ان کے سامنے آکر ان پر نظر پڑتے ہی اسے فوری طور پر ایک ہی خیال آیا تھا۔ وہ ان چند دنوں میں ہی اچانک بوڑھے اور کمزور لگنے لگے تھے۔

"شاید انہوں نے بال ڈائی نہیں کیے۔۔۔ یا شاید انہوں نے صحت مند خوراک لینا چھوڑ دی۔" اس نے سوچا۔ لیکن نجانے کیوں اس پہلی بار کے بعد وہ ان پر دوبارہ نظر ڈال نہیں پایا۔ اسے لگا، وہ جس بلال سلطان کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اگر وہ بلال سلطان اسے دکھائی نہیں دے رہے تھے تو وہ اس شخص کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔"

"تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی لڑکی ہے، جسے وہ بہت چاہتا ہے۔" وہ پوچھ رہے تھے اور وہ ایک ایسی بات پوچھ رہے تھے، جو ابراہیم کے لیے غیر متوقع تھی۔

"میں آپ کو یہ بات کیسے بتاتا انکل! جبکہ میں خود ایسی کوئی بات نہیں جانتا تھا۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"غلط بیانی مت کرو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "کم از کم اب تو مت کرو اور اس لیے مت کرو کہ مجھے تم سے غلط بیانی کی امید نہیں ہے۔"

"میں بہت سوچوں۔۔۔ بہت یاد کروں۔ تب بھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس کی زندگی میں ایسی کسی لڑکی کی موجودگی کے بارے میں میں جانتا ہوں۔" ابراہیم کو ان کے لہجے کے تیقن پر حیرت ہو رہی تھی۔

"جہاں سے آخری بار تم اسے لے کر آئے تھے، وہاں اس کے علاوہ کون تھا۔"

"وہ۔۔۔" ابراہیم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں! اب بھی کہو۔ تم نہیں جانتے تھے۔"

"اس نے اس وقت ایسی کوئی بات مانی نہیں تھی' اس کا کہنا تھا' وہ ان لوگوں سے یوں ہی واقف تھا۔"

"خیر! میں اس سے زیادہ اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔" انہوں نے گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انکل! وہ بارسلونا میں ہے۔ اس نے تین دن پہلے وہاں ایک ٹورسٹ کمپنی سے رابطہ کیا ہے۔ شاید وہ کاروبا جانا چاہ رہا تھا۔" ابراہیم نے تیزی سے کہا۔

"ہم اس کے پیچھے جا سکتے ہیں۔ آپ اجازت دیں۔ میں جاتا ہوں اس کے پیچھے... ہم ابھی اسی وقت اس کو ٹریس کر سکتے ہیں۔"

ابراہیم کے خاموش ہونے کے بعد کمرے میں سوئی گرنے کی آواز تک سنائی دینے جیسے خاموشی چھا گئی۔ ابراہیم کے کان ان کے جواب کے منتظر تھے۔ وہ جانتا تھا وہ اسے اپنے ذہن میں ترتیب دیا کوئی ایسا منصوبہ سنانے والے تھے۔ جس کے ذریعے سعد کی پھرتیاں اور قرار ایک بار پھر دھرا کا دھرا رہ جانے والا تھا۔ وہ اس ان سنے منصوبے پر دل ہی دل میں پرجوش بھی ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بلال سلطان کا ذہن کیسا پختہ منصوبہ بنانے کا اہل تھا۔

"نہیں۔" اپنی توقع کے خلاف لفظ کان میں پڑنے پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ ان کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"نہیں۔" ابراہیم سے نظریں چار ہونے پر انہوں نے وہ ہی لفظ دہرایا۔

"کوئی بھی اس کے پیچھے جائے گا۔ نہ ہی اس سے رابطہ کرے گا۔ نہ ہی اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے گا۔"

"مم... مگر۔" ابراہیم ان کی اس بات پر ششدر رہ گیا۔ الفاظ اس کے منہ سے ٹھیک سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

"لوگ چلے جاتے ہیں۔ ان کے چلے جانے سے زندگیاں رک نہیں جاتیں۔ زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے کیونکہ اس کے لیے کسی کا اس میں سے منفی ہو جانا یا کسی کا اس میں جمع ہو جانا معمول کی بات ہے۔"

"مم... مگر انکل... ہم لوگوں کی بات تو نہیں کر رہے۔ ہم سعد کی بات کر رہے ہیں۔"

ابراہیم کے منہ سے الفاظ ابھی بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہے تھے۔ وہ شاک میں تھا۔

"میں بھی اسی کی بات کر رہا ہوں صاحب زادے۔" ان کے لہجے میں وہی تیقن تھا' جو ان کے لہجے کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

"لیکن وہ..." ابراہیم سٹپٹا گیا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ اس کے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔"

"میں سمجھتا تھا کہ تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا' لیکن اس نے ایسا کر لیا۔" وہ پیپر ویٹ میز پر رکھ کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس پر انگلی پھیر رہے تھے۔

"اور یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے... اور ظاہر ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا اس نے یہ فیصلہ۔" ان کے چہرے پر ایک بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ "اسے اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔" انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

"مگر وہ غلط کر رہا ہے۔" ابراہیم نے تیزی سے کہا۔ "وہ کنویں میں چھلانگ لگانے جائے گا تو کیا آپ اور میں اسے لگانے دیں گے؟"

"اس کا کینوس کنویں سے بڑا ہے مائی ڈیر سن۔" وہ اسی بے بس مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائے۔ "اس کے سامنے سمندر ہے اور وہ خود کو ایک ماہر تیراک سمجھتا ہے۔ اسے اپنے بازو آزمانے دو۔" انہوں نے یوں کہا جیسے بات ختم کرنا چاہتے ہوں۔

ابراہیم جانتا تھا' اس سے آگے وہ اس موضوع پر ایک بھی بات نہیں کریں گے' سو جواب میں انہیں صرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ انٹرکام اور فون پر اپنے کاروباری رابطوں کے ساتھ مصروف تھے۔

☼ ☼ ☼
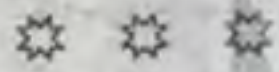
وودن زادے' ایرانی النسل تھا' لیکن اس نے آنکھ امریکا میں کھولی تھی۔ انقلاب ایران کے زمانے میں اس کے دادا' دادی ترک وطن کے بعد پہلے ہالینڈ اور پھر امریکا کی ریاست نیویارک میں جا بسے تھے۔ وودن زادے کے باپ نے اپنی ہی طرح ترک وطن کر کے نیویارک پہنچی ایک ایرانی خاندان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ایک نکتہ مشترک تھا۔ دونوں ہی خاندان شاہ کے وفادار تھے۔ شاہ کے ساتھ جلاوطنی میں کیا بیتی' پیچھے وطن میں بچ رہے خاندان کے ساتھ کیا گزری' دونوں ہی خاندانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی نئی دنیا پرکشش تھی اور وہ اس میں رہتے ہوئے آزاد زندگی کے مزے لے رہے تھے۔

وودن زادے پیدائشی امریکی تھا۔ اس کی زبان' رہن سہن' تہذیب' ثقافت سب امریکیوں کی سی تھی' مگر وودن زادے اپنے ماں' باپ سے زیادہ اپنے دادا' دادی اور نانا سے مانوس تھا۔ ویک اینڈز اور لمبی تعطیلات کے دوران وہ اپنے دادا یا نانا کے پاس جا کر رہا کرتا تھا' جو اس وقت اس عمر کو پہنچ چکے تھے۔ جب ترک وطن کر کے آئے لوگوں کو وطن کی یاد ستانے لگتی تھی۔ دادا اور نانا اس کو "ہوم" کی کہانیاں سناتے اور وہ ایک ان دیکھے وطن کی رومان پرور کہانیوں کا اسیر ہوتا رہا۔ اس کے دادا کا انتقال اس وقت ہوا' جب وہ تئیس برس کا تھا۔ دادا کو وطن کی یاد کے علاوہ ایک اور چیز بہت مرغوب تھی۔ وہ چیز "سکی انگ" (Skieng) کہلاتی تھی۔ دادا کا یہ شوق بھی وودن زادے کو منتقل ہوا۔ جس وقت دادا کا انتقال ہوا' وہ ایک انٹر اسٹیٹ سکی ڈائیونگ مقابلے میں شرکت کر رہا تھا۔ دادا کی آخری رسومات میں تو وہ شریک نہیں ہو سکا۔ لیکن اس نے وہ مقابلہ جیت کر اس جیت کو دادا کے نام معنون کرتے ہوئے انہیں ایک طرح کا خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

دادا کے جانے کے کچھ عرصہ بعد نانا اور دادی بھی دنیا سے چلی گئیں۔ وودن کے ماں اور باپ میں شادی کے ستائیس برس بعد علیحدگی ہو گئی۔ وودن اس کے دو بھائی اور ایک بہن ہائی اسکولز' کالجز سے نکل کر غم روزگار میں مصروف ہو گئے۔ دادا کا "ہوم" اور "سکی ڈائیونگ کا خبط" ایک خوب صورت خواب بنتے چلے گئے۔

وودن کو ایک مقامی سافٹ ویر کمپنی میں معمولی سی نوکری ملی۔ اپنی محنت پسند مزاج کی وجہ سے اگلے پانچ سالوں میں وہ اسی کمپنی میں ترقی کرتا کرتا ایک اچھے عہدے پر پہنچ گیا۔ زندگی میں ذرا سی سہولت آنے کے بعد اسے دادا کا "ہوم" کم' لیکن "سکی ڈائیونگ" پھر سے یاد آنے لگے۔ کسی زمانے میں وہ ایک پیشہ ور سکی ڈائیور بننا چاہتا تھا۔ مگر مالی مسائل نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔ جب مالی آسودگی آنے لگی تو اس کا وقت آگے جا چکا تھا۔ وہ مشق نہ ہونے کے باعث مہارت کی حد سے باہر جا چکا تھا اور اب یہ جنون صرف شوق کی حد تک ہی پالا جا سکتا تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر سال موسم سرما میں کسی ایک ایسے ٹرپ کا اہتمام ضرور کرتا' جس میں مختلف یورپین ملکوں میں اسے سکی ڈائیونگ کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔ اس سال وہ اسی سلسلے میں انگلینڈ میں تھا اور اس بار ڈرہم سکی ڈائیونگ ایونٹ اس کے شوق کی منزل تھا۔ ڈرہم میں اس کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی' جو دادا کے "ہوم" کے ہمسایہ ملک سے آیا تھا اور پہلی بار کسی سکی ڈائیونگ ایونٹ میں شامل ہو رہا تھا۔

"میں وودن زادے ہوں نیویارک سے۔" موٹیل میں ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے اس نوجوان سے وودن نے اپنا تعارف کرایا۔

"وودن زادے اور نیو پارک۔" جواب میں اس نوجوان نے ایک چمکتی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ "دونوں ناموں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔"

"اس لیے کہ میرے آباؤ اجداد کا وطن ایران تھا۔" وودن زادے اس کی بات پر بلند آواز میں ہنستا ہوا بولا۔

"وہ! خوشبوؤں اور پھولوں کا ملک ایران۔" اس کے مخاطب نے بے اختیار کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے۔" وودن نے شانے اچکائے۔ "میں اس کے بارے میں جو جانتا ہوں وہ بہت کم ہے۔"

"لیکن میں اس کے بارے میں جو جانتا ہوں وہ کافی زیادہ ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ایران میرے وطن کا ہمسایہ ہے۔ میں پاکستان سے سعد سلطان ہوں۔"

پاکستان اور سعد سلطان سے وودن کا یہ پہلا تعارف تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں ابھی یہاں کے سب ایسے انسٹی ٹیوٹ دیکھ رہی ہوں جہاں سے مجھے واقعی کچھ سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ابھی میں نے باقاعدہ کوئی انسٹی ٹیوٹ جوائن نہیں کیا ہے ممی۔" ماہ نور کان سے فون لگائے فائزہ کو بتا رہی تھی۔

"نہیں! مجھے نہیں لگتا میرا یہاں قیام زیادہ لمبا رہے گا۔ جس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے میں یہاں آئی تھی، وہ پراجیکٹ کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔ میں تو بس اب رہی سہی معلومات ہی حاصل کر رہی ہوں اس کے متعلق۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں آپ کو میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہوگی۔ دراصل یہ ساری ٹیکنیکل باتیں ہیں۔ آپ کے واقعی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں سمسٹر شروع ہونے سے پہلے آجاؤں گی۔ باقی میں یہاں بہت مزے میں ہوں۔ مامی امریکا گئی ہوئی ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے، فرقان ماموں نے مجھے ہر طرح کا کمفوٹ دیا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی گاڑی انہوں نے مجھے دے دی ہے۔ تاکہ مجھے آنے جانے میں آسانی رہے۔ کھانا وانا سب ٹائم پر ملتا ہے۔ آپ فکر مت کیا کریں۔"

اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابراہیم کے دیے ہوئے ٹائم پر اس کے جم میں پہنچ گئی تھی اور یہاں پہنچتے ہی فائزہ کا فون آنے پر اسے ان سے تسلی بھری گفتگو کرنی پڑی تھی۔ سامنے سے آتے ابراہیم کو دیکھ کر اس نے فائزہ کو خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

"ہیلو!" ابراہیم نے اس کے قریب آکر کہا۔ "تم وقت کی خاصی پابند لگتی ہو۔"

"ہاں! شاید۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ اور بات ہے کہ وقت پھر بھی میرے ہاتھ نہیں آتا۔ آگے نکل جاتا ہے۔"

"اچھا!" ابراہیم کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ اس لیے وہ بس مروّت ہی میں ہنسنے لگا تھا۔

"آؤ! کوئی کولڈ ڈرنک، جوس وغیرہ لیتے ہیں۔ پھر چلتے ہیں۔" وہ مین ہال سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"نہیں! کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس چلتے ہیں۔" وہ بھاگتی ہوئی ٹریڈ مل پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"یہ ٹریڈ مل جو تم دیکھ رہی ہو۔ یہ سعد کے لیے ریزرو تھی۔" ابراہیم کو یاد آیا۔ "وہ ہمیشہ اسے ہی استعمال کرتا تھا۔"

"چلیں؟" ماہ نور نے اس کی بات سن کر دل کی تیز ہوتی دھڑکن کو نظر انداز کر کے کہا۔

"ہاں! چلو، چلتے ہیں۔" ابراہیم اس سے آگے چلتا ہوا جم سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

"اللہ اللہ بھائی کے۔ کان کاٹوں نائی کے۔"

"ہاہا۔ بھئی! بچے کو بہلاتے بہلاتے نائی کے کان کیوں کاٹنے لگیں؟"

"نائی کم بخت نے ہی تو سر کے پہلے بال اتارتے اتارتے لگتا ہے زخم لگا دیا ہمارے شہزادے کو۔ جب ہی روئے چلا جا رہا ہے۔"

"نہیں! جب سے تم نے اسے گود میں لیا ہے۔ تب سے روئے چلا جا رہا ہے۔"

"پھر تو نائی کے نہیں میراثی کے کان کٹنے چاہئیں۔"

"اڑالو اڑا لو مذاق تم دونوں میراثیوں کا... ایک دن دیکھنا! یہ میراثی ہی ہوں گے۔ تمہاری طرف بڑھتے وار اپنے سینے پر لینے والے۔"

"سن لو۔ بہادری اور وفاداری کے دعوے کر رہی ہیں محترمہ۔"

"اس کی باتیں رہنے دیں۔ اسے اپنے علاوہ ساری دنیا کم بخت ہی لگتی ہے۔ ہر وقت مولوانوں کے بے چارے لمڈے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ وہ کم بخت، نائی کم بخت، دکان والے کم بخت، مہترانی کم بخت، اللہ جانے کوئی بلند بخت بھی ہے اس کے نزدیک کہ نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں بلند بخت... ہمارا یہ شہزادہ ہے نا بلند بخت... اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ اس کی شان اونچی کرے۔"

"جس دن سے یہ پیدا ہوا ہے، اٹھائے اٹھائے پھرتی رہتی ہو۔ اسے گود کی عادت ہو گئی نا تو بستر پر ڈالنا دشوار ہو جائے گا۔"

"اچھا! ابھی تو اسے مجھے دے دو۔ میں دو گھڑی اٹھالوں گود میں۔ پھر میرے جانے کا ٹائم ہو جائے گا۔"

"یہ لیں بھئی عجیب والد پائے ہیں ہمارے شہزادے نے۔ بے چارہ دنیا میں جس وقت آیا ابا اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے کان میں اذان دینے کی سعادت بھی اس حبشی پہلوان سراج سرفراز کو ہی ملنی تھی۔"

"ابا موجود ہوتے... ضرور موجود ہوتے... تم ہی نے بھگایا تھا اسی شام طفیلے لاڑکی سناؤنیاں سنا کر..."

"ہاں تو ٹھیک ہی کیا تھا نا... خود اپنی آنکھوں سے اسے ننگا خنجر لیے بڑھکیں مارتے سنا تھا۔"

"آ نہیں گیا پھر وہ کسی کی گردن کاٹنے... تم خوامخواہ ہی میرے معصوم سے شوہر کو یہاں سے بھگانے کے چکر میں رہتی ہو۔"

"احتیاط لازم ہے بیگم صاحب..." "اور آپ نئے نویلے ابا جان! صرف باتوں پر نہ ٹرخایئے، روکڑا نکالیے روکڑا... میں بوندی کے لڈو منگواؤں شیریں محل سے۔ منہ تو میٹھا کرایئے۔ کنگن کی بات بعد میں کروں گی۔"

"ہاں، ہاں! جتنے چاہے لڈو کھاؤ۔ یہ لو پیسے... اب بتاؤ بھلا لڈو منگوانے کے لیے سراج سرفراز کے سوا کوئی دوسرا ہے تمہارے پاس؟"

"اتنا بھی نہیں کرے گا تو صبح سے شام پڑا چارپائی ہی توڑے گا کیا؟ چلیں جی! میں چلی لڈو منگوانے... تم دونوں میاں، بی بی محبت، اخلاص کی باتیں کر لو چند گھڑیاں... اور میرا شہزادہ مجھے دے دو۔" اس نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نگہت سیما

مکمل ناول

۱۴

چودھویں قسط

کچھ دیر یوں ہی متذبذب سا کھڑا رہا۔
"دو سنت، دو فرض۔"
وہ دل ہی دل میں دہرا رہا تھا
اسے یاد تھا۔ پانچ سال کوئی زیادہ لمبا عرصہ تو نہیں ہوتا۔ پانچ سال پہلے وہ پوری پانچ تو نہیں۔ لیکن تین نمازیں تو باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور جو رہ جاتیں ان کے لیے شرمندہ ہوتا رہتا تھا اور ہر روز عہد کرتا تھا کہ کل سے پوری نمازیں پڑھے گا۔ لیکن پھر سستی ہو جاتی تھی۔

اس نے پھر نیت کے لیے ہاتھ اٹھائے اور یونہی چند لمحے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔
"اور کیا میں ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔"
اس نے ہاتھ پھر نیچے گرا دیے۔ لیکن پھر فوراً" ہی اٹھا لیے۔

"اور کون ہے اُسے ہدایت دے۔ سوائے اللہ کے۔"
اس کے کانوں میں آواز آئی تو دل ہی دل میں اس نے کہا۔ "ہاں! اللہ"
"اور اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کو ہدایت دیتا ہے اور ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیتا ہے۔ اس وقت جب وہ گمراہی کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں۔"
"تو کیا اللہ مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر اس گڑھے سے نکال لے گا، جس میں میں گر گیا ہوں؟"
اس نے سوچا اور آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ لیکن اس نے پلکیں جھپک کر اس نمی کو باہر نکلنے سے روکا اور نیت کرنے لگا۔

اور پھر نہایت یکسوئی سے نماز پڑھ کر وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی کارپٹ پر بیٹھا رہا۔
کیا دعا مانگے؟ امی ابو سے ملاقات کی دعا۔ جو اس دنیا میں نہیں.... اپنے گناہوں کی معافی.... لیکن کیا اللہ اسے معاف کر دے گا۔ اس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اپنے والدین کا دل دکھایا۔
اس نے ہاتھ اٹھائے۔
"یا اللہ! مجھے معاف کر دے ان غلطیوں پر، جو مجھ سے جانے انجانے میں سرزد ہوئیں اور ان ملعونوں کو تباہ و برباد کر دے، جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو جو رخساروں سے پھسل کر ہونٹوں پر لحہ بھر رکنے کے بعد ٹھوڑی سے ہوتے اس کی گردن کو بھگو رہے تھے۔

"یا اللہ! وہ انگلیاں مفلوج ہو جائیں۔ جنہوں نے وہ خاکے بنائے تھے۔"

اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی اور دعا کے لفظ اندر ہی کہیں چکرا کر رہ گئے۔

اس نے ایک دم ہاتھ نیچے گرا دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نہ دعا مانگنے کے قابل ہوں، نہ معافی کے۔ پھر کیوں ہاتھ اٹھائے بیٹھا ہوں۔"

کچھ دیر وہ مضطرب سا ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ پھر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔ شاید اس طرح اندر کی بے چینی ختم ہو جائے اور دھیان بٹ جائے۔ ٹی وی پر سحری کے پروگرام چل رہے تھے۔ ایک قاری صاحب سورۃ النساء کی تلاوت کر رہے تھے۔ چند آیات پڑھ کر انہوں نے ترجمہ کیا۔

"اور جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا پھر اپنے حق میں ظلم کر لے اور پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔"

"بے شک۔" اس کے لبوں سے نکلا۔ "لیکن میں... میں نے تو..."

اس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت میں چینل بدل رہا تھا۔

"دیکھو! شیطان کا کہنا نہ ماننا۔" ایک مولوی صاحب کہہ رہے تھے۔

"وہ تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے۔ اور اللہ نے تم سے بخشش اور رحمت کا وعدہ کیا ہے، اس مبارک مہینے میں۔"

اس نے غیر ارادی طور پر ——— ریموٹ پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔

"در قبولیت ہر اس کے لیے کھل جاتا ہے، جو سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔"

"کیا میرے لیے بھی؟ میں جو مرتدوں کا ساتھی تھا۔ کیا میری توبہ بھی قبول ہو گی۔"

"سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 268 میں ہے اور اللہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

"اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ میری توبہ ضرور قبول کرے گا۔"

دل میں امید کی لو چمکی تو وہ پھر اٹھا اور زمین پر دو زانو بیٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیے۔

"یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ توحید اور شرک کے بیچ مجھ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، معاف کر دے۔"

آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے اور وہ بہت جذب سے دعا مانگ رہا تھا۔

"اے اللہ! تو بہت رحیم و کریم ہے۔ مجھ پر بھی رحم کر۔ مجھ پر ترس کھا۔ مجھے معاف کر دے۔ میری گناہ بہت زیادہ ہیں۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو برف کے پانی سے اور اولوں سے دھو دے اور میرے دل کو گناہوں سے پاک کر دے۔ جیسے میلا کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ یا اللہ! مجھ پر ترس کھا۔ مجھ پر رحم کر مجھے معاف کر دے۔"

اب وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کے حلق سے ایک ہی جملہ نکل رہا تھا۔

"یا اللہ! مجھ پر رحم کر۔ مجھے معاف کر دے۔"

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہاتھ نیچے گر گئے اور سر سجدے میں جھک گیا۔

"رب اغفرلی۔ ربی اغفرلی۔"

اس کی زبان پر ایک ہی تکرار تھی۔

پتا نہیں کتنی ہی دیر تک وہ یوں ہی سر سجدے میں رکھے روتا رہا۔ معافی مانگتا رہا۔ پھر اسے لگا، جیسے اس کے حلق میں کانٹے پھنس گئے ہوں۔ سر میں جسم کا سارا خون اکٹھا ہو رہا ہو۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ اٹھا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ رات بھر وہ بہت بے چین رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ خود کو پر سکون محسوس

کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمیرا کے متعلق سوچنے لگا۔

"پتا نہیں ابو نے اس کی شادی اتنی جلدی کیوں کر دی۔ اسے تو ڈاکٹر بننا تھا۔ ڈاکٹر سمیرا رضا۔"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن بند آنکھوں میں نمی پھیلتی گئی۔

اور اسے بھی تو انجینئر بننا تھا۔ وہ یوں ہی سوچتے سوچتے سو گیا۔ پھر اس کی آنکھ صبح گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی۔ وہ تیار ہو کر رات کے لکھے ہوئے صفحات لے کر باہر نکلا تو ثمینہ حیدر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"سر! ناشتے میں کیا لیں گے۔"

"کچھ نہیں۔ میرا روزہ ہے۔"

اس نے ثمینہ حیدر اور ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کی آنکھوں میں حیرت کو بہت واضح طور پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اور گاڑی کی چابی لے کر باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ثمینہ حیدر کو بتا دیا تھا کہ وہ اخبار کے دفتر جا رہا ہے اور وہاں سے جنید کی طرف چلا جائے گا۔ اگر وہ نہ بتاتا تو ثمینہ حیدر خود پوچھ لیتی۔ اب تو اسے عادت ہو گئی تھی۔ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے ثمینہ حیدر کو بتا دیتا تھا۔ اپنا آرٹیکل میل کرنے کے بجائے اس نے خود لے کر جانا مناسب سمجھا تھا۔ اخبار کے دفتر سے وہ جنید کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ جنازہ عصر کے بعد ہے اور جنید چند عزیزوں کے ساتھ میت وصول کرنے ایئر پورٹ گیا ہوا ہے۔ جنید آیا تو جنازے تک وہ اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ جنید نے دو تین بار اسے متشکر نظروں سے دیکھا تھا۔ گھر کے اندر کہرام مچا تھا۔ پتا نہیں جنید کی فیملی میں کون کون تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ جنید نے صرف اپنے بڑے بھائی کا ذکر کیا تھا، جو پیسہ کمانے کا خواب لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ایجنٹ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور وہ جیل چلا گیا۔ یہ انسانوں کے اسمگلر نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ گل کر چکے تھے اور کتنے لوگ جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے اور ایک دن جنید کے بھائی کی طرح وہیں زندگی ہار بیٹھیں گے۔ اس نے کتنی تکالیف اٹھائیں۔ کیسے گرفتار ہوا۔ اس پر کیا بیتی۔ وہ دل میں ہی لے کر چلا گیا تھا۔ اور یہ جنید علی یہ بھی شاید ایسا ہی کوئی خواب لے کر ان لوگوں کے جال میں پھنسا تھا۔

اپنے گھر والوں کو خوش حال دیکھنے کا خواب۔ لیکن اس کا تو ایسا کوئی خواب نہیں تھا۔ وہ تو ٹھیک ٹھاک خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ حسن رضا نے کبھی کوئی تنگی نہیں ہونے دی تھی۔ اس کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا۔ پھر وہ کیوں ان کے جال میں پھنسا۔ مزید کی طمع۔ لالچ۔ ہوس۔

جنازے کے بعد افطاری کا انتظار کیا جا رہا تھا اور یہ سب انتظام آس پاس کے گھروں کے لڑکے کر رہے تھے۔ بزرگ ہدایات دے رہے تھے۔ جانے والوں کو روک رہے تھے۔

"ابھی اس ملک میں پاس، محبت اور مروت باقی ہے۔"

اس نے سوچا اور معذرت کر کے گھر آ گیا۔ وہ بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے روزہ افطار کر کے وہ مغرب کی نماز کے لیے کھڑا ہوا تو جی چاہ رہا تھا نماز نہ پڑھے اور سو جائے۔ اس کے کانوں میں جنید کے گھر کی عورتوں کے رونے کی اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے فجر پڑھی تھی۔ لیکن پھر ظہر نہیں پڑھ سکا تھا اور پہلے کی طرح دل میں کہتا رہا تھا۔ "کل ضرور پڑھوں گا۔ آج نہیں پڑھ سکا تو کل ضرور۔"

عصر کی نماز جنید علی کے گھر کی قریبی مسجد میں سب لوگوں کے ساتھ پڑھی تھی۔ لیکن میکانکی انداز میں وہ ہاتھ اٹھاتا، رکوع اور سجدے میں جاتا رہا تھا۔ مغرب کی نماز بھی اس نے اسی انداز میں پڑھی اور پھر بیڈ پر گر گیا۔ تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ بیل کی آواز سے کھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے کلاک پر نظر ڈالی دس بج رہے تھے۔

"اوہ۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سونے سے پہلے وہ

عہد کررہا تھا کہ اب کوئی نماز مس نہیں کرے گا۔ لیکن پھر عشاء رہ گئی اور اب فجر بھی۔

بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف الوینا تھی اور بہت غصے میں بول رہی تھی۔

"یہ کیا لکھا ہے تم نے احمق آدمی! کیا تمہیں فری ہینڈ اس لیے دیا تھا کہ تم۔۔۔ ہمارا خیال تھا کہ تم پوری طرح ہمارے سانچے میں ڈھل چکے ہو۔ لیکن تم تو اندر سے وہ ہی ہو دقیانوسی خیالات کے مالک۔۔۔ اپنے باپ کی طرح۔ روایت پسند ٔ احمق ٔ بےوقوف۔"

احمد رضا حیران سا اس کی بات سن رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"تم نے ان کی شخصی آزادی پر حملہ کیا ہے۔ یہ ان کا رائٹ تھا احمد رضا! ہر شخص کو دوسروں کے متعلق آزادی رائے کا حق ہے۔"

"وہ دوسرے نہیں ٔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں۔ جن کی سیرت طیبہ پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔"

احمد رضا کو بہت دیر بعد اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ لیکن الوینا نے اس کی بات سنی نہیں وہ بدستور اس پر چلا رہی تھی۔ الوینا جو چند دن پہلے اس سے محبت کا دعوا کر رہی تھی اور ابھی تین دن پہلے کی ہی بات تھی رات کو اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے الوینا کی مہربانیوں کو یاد کرتے ہوئے سوچا تھا۔ الوینا اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے۔ اگر وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس نے واقعی طلاق لے لی ہے تو پھر وہ کیوں نہ اس سے ہی شادی کر لے۔

"ٹھیک ہے! یہ آج کا ایشو ہے۔ تمہیں اس پر ضرور لکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ ان میں شامل رہو۔" الوینا کہہ رہی تھی۔

"یہود و نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے" وہ سوچ رہا تھا۔

"تمہیں اتنے جارحانہ انداز میں نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ بلکہ ہلکے ہاتھ سے۔۔۔ لائٹ سا۔" اب وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

وہ خاموشی سے سن رہا تھا کہ ارباب حیدر نے الوینا سے فون لے لیا۔

"الوینا صحیح کہہ رہی ہے۔ تمہیں ہلکا پھلکا لکھنا چاہیے تھا۔ جیسے کئی اور کالم نگاروں نے لکھا ہے۔ لیکن تم نے تو یوں لکھا۔ جیسے تم نے ہاتھ میں قلم کے بجائے بندوق تھام رکھی ہے۔ رچی اور چیف بہت ناراض ہوں گے۔ تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"تم تو مسلمان ہو ارباب حیدر! تم بھی کہہ رہے ہو؟"

احمد رضا نے آہستگی سے کہا تو ایک لمحہ کے لیے ارباب حیدر خاموش ہو گیا اور پھر سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں ایک ایمپلائی (ملازم) ہوں اور مجھے وہ ہی کرنا ہے جو میرے باس کا حکم ہے اور تمہیں بھی وہ ہی کرنا ہے جو تمہارے باس چاہتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ ارباب حیدر نے بات ختم کر کے فون رکھ دیا۔ مگر وہ کتنی ہی دیر تک ریسیور ہاتھ میں پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔

"میں نے بھی اپنی روح شیطان کے پاس گروی رکھ دی ہے اور میں غلام ہوں ان کا۔ کس لیے۔ کس لیے کیا میں نے۔۔۔ کس کے لیے؟"

"یہ" اس نے ہاتھ میں بندھی گھڑی کو حقارت سے دیکھا۔

"یہ کرسچن ڈائر کی۔۔۔" اور اسے اتار کر نیچے پھینکا۔

"یہ مونٹ بلیک کا والٹ۔۔۔" اس نے تکیے کے پاس پڑا والٹ اٹھا کر کمرے کے وسط میں پھینکا۔

"یہ جارج ارمانی اور پلے بوائے لومانی کے پرفیومز" اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ایک پرفیوم کی شیشی اٹھاتا اور ایک ایک کر کے انہیں پھینکتا جا رہا تھا۔ "یہ جوتے۔۔۔ یہ سینٹ مائیکل کے" اب وہ جوتوں کے ریک کے پاس کھڑا تھا اور اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔

پھر اس نے وارڈ روب کھولا۔

"یہ جارج ارمانی کے گلاسز۔" دائیں طرف گلے گلاسز پھینکنے کے بعد کپڑوں کی باری آئی تھی۔ "یہ شرٹ Gucci کی۔۔۔ یہ رالف لورین کے ڈریسز۔۔۔" وہ ہینگر اتارتا ٔ ایک ایک کپڑے کو دیکھتا اور اچھال کر پھینک دیتا۔

"ان کے لیے۔ ان کے لیے کیا میں نے سب۔۔۔ یہ سب میری خواہش تھی۔ من میں چھپی خواہش۔۔۔ اور ان حقیر چیزوں کے لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا۔۔۔ جو میرے تھے۔۔۔ میرے اپنے۔۔۔ اور مرتد کہلوانا پسند کیا۔ میں نے سوچا کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر کوئی مجھے مرتد سمجھ رہا ہے میں مرتد ہوں تو نہیں۔ میں پورے دل و جان سے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہی آخری نبی مانتا ہوں۔" اس نے سر جھٹکا۔

"لیکن فرق پڑتا تھا۔ بہت فرق پڑتا تھا۔۔۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا۔ میں کبھی نہیں سمجھ سکا اور ان حقیر چیزوں پر خوش ہوتا رہا۔"

اس نے پاؤں سے سامنے پڑے جوتے کو ٹھوکر ماری۔

"کیا میرے پاس جوتے نہیں تھے؟ کیا میرے پاس گھڑی نہیں تھی؟ کیا میں لباس سے محروم تھا۔ پھر کیوں میرے اندر ان برانڈڈ کپڑوں کی ہوس تھی۔ گہرائی میں چھپی ہوئی؟"

وہ پھر وارڈ روب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور باقی ماندہ کپڑے نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شرٹ کو حقارت سے دیکھا اور نیچے پھینک کر ذرا سا دروازہ کھولا۔ باہر ثمینہ حیدر تھی۔ جس نے ادھ کھلے دروازے سے زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو حیرت سے دیکھا۔

"مجھے ناشتا نہیں کرنا۔"

احمد رضا نے اس کی بات سنے بغیر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر دروازے سے ٹیک لگا کر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

"Die When Life Demands Too Much"

پتا نہیں کب کا پڑھا ہوا جملہ اس کی زبان پر آیا۔

"مجھے بھی مر جانا چاہیے تھا اس وقت۔ جب میں رچی سے وہ بریف کیس لے رہا تھا۔ اس وقت جب اس نے مجھے بی۔ ایم۔ ڈبلیو کی چابیاں دی تھیں۔۔۔ یا پھر اس وقت جب الوینا کی قربت کی خواہش میرے اندر جوش مارتی تھی اور میرا دل کسی آگ پر چڑھی ہانڈی کی طرح ابلتا تھا۔ اس وقت جب میں نے مزید کی چاہ کی۔" پھر اسے پرانا وقت یاد آیا۔

"وہ سب کتنا قیمتی تھا۔ کتنا انمول۔ وہ چھوٹی چھوٹی ننھی منی خوشیاں۔۔۔ وہ خوبصورت لمحے۔ وہ ان سب سے زیادہ قیمتی تھے۔"

اس نے ایک بار پھر زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو حقارت سے دیکھا۔

اس کا سیل فون پتا نہیں کب سے بج رہا تھا۔ اس نے بیڈ پر پڑا ہوا فون اٹھایا۔ دوسری طرف جنید علی تھا وہ اسے ہدایات دے رہا تھا۔

آئندہ کوئی بھی کالم ٔ کوئی بھی آرٹیکل چھپوانے سے پہلے وہ اسے چیک کرنے کے لیے دے گا۔

اس نے حیرت سے جنید علی کی بات سنی۔

یہ جنید علی تھا ٔ جو رات بھائی کے غم میں نڈھال تھا۔

جس نے برسوں بھائی کی واپسی کا انتظار کیا تھا۔ وہ واپس آیا۔ لیکن تابوت میں بند اور وہ کبھی جان نہیں سکے گا کہ اس کے بھائی پر کیا بیتی۔ کیا ایک ہی رات میں اس کا غم ختم ہو گیا۔ نہیں ابھی تو اس کے بھائی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہو گی۔

"لیکن ارباب حیدر کہتا ہے۔ ہم صرف ملازم ہیں۔۔۔ اور جنید علی نے بھی میری طرح اپنی روح ان کے پاس گروی رکھ دی ہے۔ وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی رات ہی تو اس نے برسوں سے بچھڑے بھائی کو دفنایا ہے۔ ابھی تو۔۔۔ لیکن شاید ہم کبھی آزاد نہیں ہوں گے۔" مایوسی نے اس کے دل میں پنجے

گاڑے۔ "تمہاری روحیں ہمیشہ کے لئے ان کی غلام ہوئیں۔"

"ایسا کیا لکھ دیا ہے تم نے جس پر سب اتنے خفا ہیں؟ طیب خان کا بھی فون آیا تھا بہت بول رہا تھا۔" جنید علی پوچھ رہا تھا۔

اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے ریسور کو دیکھا۔

"میں نے وہ لکھا ہے جنید علی! جو ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ لیکن میں بھول گیا تھا کہ جب میں نے ان کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا تو مجھ سے میرے مسلمان ہونے کا اعزاز چھن گیا۔ خیر! تم اسے چھوڑو مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔ کیا تم میرے والدین۔۔۔"

"سوری احمد رضا!" حیدر علی نے اس کی بات کاٹی اور شرمندگی سے کہا۔ "میں پتا نہیں کروا سکا تھا۔ دراصل رچی کو نہ جانے کیسے پتا چل گیا تھا کہ میں تمہارے والدین کے متعلق پتا کروا رہا ہوں۔ اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور میں رچی کی حکم عدولی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو نا۔"

"تو۔۔۔ تو تم نے رچی کو نہیں بتایا کہ وہ۔۔۔" احمد رضا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ مایوسی کے اندھیرے میں ایک دم امید کی کرن چمکی تھی۔

"او کے جنید علی!" میں اب کچھ بھی تمہیں دکھائے بغیر نہیں چھپواؤں گا۔" اس نے بات مکمل کرتے ہی فون بند کر دیا۔

"تو رچی نے میرے ساتھ جھوٹ بولا۔ بالکل ایسا ہی جھوٹ جیسا میری موت کی خبر چھپوا کر بولا تھا۔۔۔ میں خود تلاشوں گا انہیں۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ مجھے ان سے ملا دے اور اللہ ضرور میری دعا سنے گا۔ مجھے ایک بار پھر سمن آباد جانا چاہیے۔ کیا پتا ان پانچ سالوں میں ابو وہاں کسی سے ملنے آئے ہوں اور انہیں اپنی موجودہ رہائش کے متعلق بتایا ہو۔ اور پھر قاضی صاحب اور ملک صاحب کی بیٹیاں بھی تو سمیرا کی سہیلیاں تھیں۔ کیا خبر سمیرا کا ان سے رابطہ ہو۔ کمال ہے مجھے پہلے کیوں اس کا خیال نہیں آیا۔"

وہ ایک دم اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسی رات کے لباس میں۔ اس کی گھڑی اور والٹ یوں ہی کمرے کے وسط میں پڑا تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی بھی نہیں لی تھی۔ اس کے پاؤں میں سلیپر تھے۔ ثمر حیدر نے اسے اندرونی گیٹ کھول کر بہت حیرت سے باہر جاتے دیکھا اور موبائل پر تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

وہ گیٹ سے نکل کر بے دھیانی میں چلنے لگا تھا۔ اسے سمن آباد جانا تھا اس کا والٹ کمرے میں رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔

"Die When Life Demands Too Much"

اس کے کانوں میں کوئی مسلسل کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ چل رہا تھا وہ یہاں سے پیدل سمن آباد نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن وہ چلا جا رہا تھا۔

"احمد رضا۔۔۔ احمد رضا۔۔۔ احمد رضا رکو پلیز۔"

کسی نے اسے پکارا تو وہ چونک کر رک گیا اور مڑ کر دیکھا۔ احمد رضا کو اسے پہچاننے میں چند لمحے لگے تھے۔

وہ ابراہیم تھا۔

"ابراہیم" اس کے لبوں سے نکلا اور وہ اسے قریب آتے دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

رابیل دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کل مائرہ نے جو کچھ کہا تھا اس کے بعد وہ گھنٹوں روتی رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ نے ایسا کہا۔ بھلا مما ایسے کیسے کہہ سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے کہا تھا اور صرف اس کی ہی نہیں امیک کی بھی توہین کی تھی۔ حفصہ، مریم، منیبہ سب ہی ایمک سے بے تکلفی سے بات کرتی تھیں۔ لیکن کبھی ثنا چچی، اسما یا راحت چچی نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن مائرہ مطمئن ایمک سے رات بات کر کے اگرچہ وہ کچھ

ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی تھی۔ بار بار اسے خیال آتا کہ "ایمک کیا سوچتا ہو گا کہ کیسی لڑکی ہوں میں کہ میری ماں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ میں نے ضرور کچھ ایسا کیا ہے کہ ایمک کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر وہ بھڑک اٹھیں۔"

پھر خود ہی خود کو تسلی دیتی۔ "نہیں! ایمک ایسا نہیں ہے۔ ایسی سطحی سوچ رکھنے والا۔ وہ اس کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ مما کو اس سے انکل اور عمارہ پھپھو سے چڑ ہے۔"

وہ رات کھانے کے لیے بھی نیچے نہیں آئی۔ عمر اسے بلانے آیا اور اسے بری طرح روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ تب اس کے بار بار پوچھنے پر وہ ضبط نہ کر سکی اور اسے سب کچھ بتا دیا۔

عمر خود بھی شاکڈ رہ گیا کیونکہ وہ اس گھر میں ایمک کا سب سے بڑا قدر دان تھا۔

"مما نے ایسا کیوں کیا رابی آپی؟ ایمک بھائی ایسے نہیں ہیں۔" وہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"یہ تو تم جا کر مما سے ہی پوچھو۔" اس نے کہا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اور وہ شاید مما سے ناراض بھی ہوا تھا۔ لڑا بھی تھا۔ لیکن مائرہ کا موقف ایک ہی تھا کہ اس نے کچھ غلط نہیں کیا اور یہ بات عمر نے ہی اسے بتائی تھی۔ عمر کے بے حد اصرار پر بھی رات وہ کھانے کے لیے نیچے نہیں گئی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مونی اور ریتا نے بھی تو سنا ہو گا۔ مونی تو کچن میں ہی تھی اور مما اتنے زور زور سے بول رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تب ہی مائرہ دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ رابیل نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ مائرہ اس کے بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

"تم ناشتے کے لیے نہیں آئیں۔ رات بھی تم نے کھانا نہیں کھایا۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

رابیل نے مائرہ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور یونہی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیڈ شیٹ کو دیکھتی رہی۔

"میں نے جو کچھ بھی کہا۔ تمہارے بھلے کے لیے ہی کہا تھا رابی۔"

مائرہ کا لہجہ نرم تھا۔

"میرے بھلے کے لیے" رابیل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "نہیں مما! میری انسلٹ کے لیے۔" اس کی آنکھیں نم تھیں۔ مائرہ نے تڑپ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"میں تمہاری ماں ہوں۔ دشمن نہیں ہوں رابی میں تمہاری انسلٹ کیوں کرنا چاہوں گی؟ تم جانتی ہو میں تم سے عمر اور زبیر سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ شادی کے کتنے سالوں بعد تم پیدا ہوئی تھیں۔ تم میری دعاؤں کا حاصل ہو۔ میں تمہارا برا کبھی نہیں چاہ سکتی رابی!"

"نہیں! آپ نے بہت غلط کیا مما۔۔۔ بہت برا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "وہ کوئی غیر نہیں تھا۔ دشمن نہیں تھا۔ عمارہ پھپھو کا بیٹا تھا مما! جیسے ہمدان ہے۔ جیسے عادل ہے۔ اگر میں نے اس سے بات کر لی تھی تو کیا حرج تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"دشمن ہی تو ہے۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی تھیں لیکن رابیل نے سن لیا۔

"کیا صرف اس لیے کہ وہ عمارہ پھپھو کا یعنی آپ کی نند کا بیٹا ہے۔ مما آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ پھر آپ کیوں روایتی نند بھاوج کا جلاپا دل میں لیے بیٹھی ہیں۔ اور پھر عمارہ پھپھو تو اپنے گھر میں رہتی ہیں۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہ "الریان" نہیں آئیں۔ پھر بھی۔۔۔؟"

"ہاں! پھر بھی۔۔۔ میں وہ سب کچھ نہیں بھول سکتی جو تمہاری عمارہ پھپھو نے میرے ساتھ کیا۔ میں روایتی بھابھی نہیں تھی۔ لیکن وہ روایتی نند تھی۔ جتنا عرصہ بھی وہ یہاں رہی۔ اس نے مجھے بہت زچ کیا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ دونوں تو اتنے شفیق اور محبت کرنے والے ہیں۔۔۔ لیکن ہو سکتا ہے پھپھو پاپا کی محبت کو تقسیم ہوتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پاپا سے سب بھائیوں سے زیادہ قریب تھیں۔" رابیل نے ہاتھوں کی پشت سے

اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔
"مما! آپ وہ سب کچھ بھول نہیں سکتیں، جو عمارہ پھپھو نے آپ کے ساتھ کیا؟"
"نہیں۔" مائرہ کا لہجہ سخت تھا۔ رابیل نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔
"اب غصہ تھوک دو میری جان! اٹھو، منہ ہاتھ دھو لو۔ میں شمو سے کہتی ہوں۔ وہ تمہارا ناشتا اوپر ہی لے آئے۔" مائرہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔
"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے روٹھے انداز میں کہا۔
"مانا مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے اس طرح غصے سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ لیکن ایبک کو تم سے بات کرتے دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا نا، ایبک سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں؟"
"آخر اس میں برائی کیا ہے؟" رابیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
"یقیناً" اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن اس کا باپ ... وہ کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتا ... اور میں ... مجھے ڈر لگتا ہے رابی! کہ بیٹا بھی کہیں باپ جیسا نہ ہو۔"
"لیکن مما!" رابیل کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
"بس! اب اور کچھ نہیں۔ یہاں "الریان" میں سب لوگ اسے صرف عمارہ کی وجہ سے برداشت کرتے ہیں۔ ورنہ جیسا اس کا کریکٹر تھا۔ کوئی اسے "الریان" میں گھسنے ہی نہ دیتا۔"
"پھر بابا جان نے پھپھو کی شادی ان سے کیوں کی مما؟" رابیل کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
"یہ سب ... میرا مطلب ہے اس کے کردار کے متعلق شادی کے بعد پتا چلا تھا۔ اب اٹھو شاباش۔"
رابیل نے پاؤں بیڈ سے نیچے رکھے۔
"اور ہاں! آئندہ میں تمہیں ایبک سے بات کرتے نہ دیکھوں۔ وہ اتنا ڈھیٹ ہے کہ اس بے عزتی کے بعد بھی ضرور بابا جان سے ملنے کے بہانے "الریان" میں آتا رہے گا۔ تم خود ہی محتاط رہنا۔"
رابیل نے پھر پاؤں اوپر کر لیے۔
"مما پلیز! آپ جائیں۔ رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ میں کچھ دیر سوؤں گی۔ اٹھوں گی تو ناشتا کر لوں گی اور پلیز، آئندہ مجھے ایبک سے بات کرنے سے مت روکیے گا۔"
"کیوں نہ روکوں؟" مائرہ کو غصہ آیا۔ لیکن اس نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ "ماں ہوں میں تمہاری اور تمہیں برے بھلے کی پہچان سمجھانا میرا فرض ہے۔"
"میں اپنا برا بھلا سمجھتی ہوں۔ بچی نہیں ہوں۔ ماسٹرز کر چکی ہوں۔"
"اپنا برا بھلا سمجھتیں تو ہمدان سے شادی سے انکار نہ کرتیں۔ ساری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔ کتنی خواہش تھی ہماری کہ تمہاری شادی ہمدان سے ہوتی۔" مائرہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔
"ہم اس موضوع پر پہلے ہی بہت بات کر چکے ہیں مما!" وہ بے زار ہوئی۔
"لیکن موضوع ختم نہیں ہوا رابی! شادی تو ہونا ہی ہے ایک دن۔ ہمدان سے نہ سہی، کسی اور سے سہی۔ تمہاری ممانی نے طاہر کے لیے بھی کہا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ کوئی کمی نہیں ہے ماشاء اللہ۔ میں اور تمہارے پاپا اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔"
"لیکن مجھے شادی نہیں کرنا مما! نہ طاہر سے نہ ہمدان سے۔" اس کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں۔
"یہ کیا بچپنا ہے رابی؟" مائرہ نے اسے ڈپٹا۔ "شادی تو تمہاری کرنا ہی ہے اور طاہر دیکھا بھالا لڑکا ہے۔"
"مما پلیز۔" رابیل نے التجا کی "مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔"
مائرہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اسے خیال آیا کہ احسان شاہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ابھی اپ سیٹ ہے۔ دو تین روز بعد بات کرنا۔ میری بھی مت ماری گئی ہے۔ اس نے رابیل کی طرف دیکھا۔
"او کے! ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم سو جاؤ۔ نیند پوری ہو گی تو تم فریش ہو جاؤ گی۔"
رابیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ مائرہ نے کمرے سے باہر نکل کر آہستگی سے دروازہ بند کیا اور پرسوچ انداز میں سیڑھیاں اترنے لگیں۔
"کیا رابی کسی اور کو پسند کرتی ہے؟"
وہ سوچ رہی تھیں۔ "اس روز اس نے کہا تو تھا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ میں نے سمجھا شاید غصے میں کہہ رہی ہے۔ لیکن کیا واقعی ...؟ مگر کون ہو سکتا ہے؟ اس کا کوئی یونیورسٹی فیلو؟ لیکن کبھی ایسا کچھ محسوس تو نہیں ہوا پھر ... ضرور اس نے غصے میں کہا ہو گا۔"
احسان شاہ ابھی تک لاؤنج میں اخبار کھولے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سیڑھیوں سے اترتی مائرہ کو دیکھا اور مسکرائے۔
"ہو گئے بیٹی سے مذاکرات؟"
مائرہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور انہیں مسکراتا دیکھ کر ان کے اندر دور تک اطمینان اتر گیا۔ گویا احسان کا موڈ ٹھیک ہے اب۔
"بہت ناراض ہو گی تم سے؟"
"ہاں! لیکن میں نے منا لیا۔" مائرہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ "میری غلطی تھی۔ بس پتا نہیں کیوں، آج کل مجھے غصہ بہت آتا ہے۔"
"چلو! تم نے اپنی غلطی تسلیم تو کی۔ ویسے غصہ حرام ہے۔" احسان شاہ بہت لگاوٹ سے انہیں دیکھ رہے تھے۔
"ارے!" ایک دم وہ چونک کر سیدھے ہوئے اور اخبار اپنے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔
"مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تمہیں بتانا۔ وہ تمہاری ایک دوست تھی۔ کیا نام تھا اس کا روبی۔ وہ مجھے اسپتال میں ملی تھی اس روز۔"
"روبی ..." مائرہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "لیکن وہ تو ملک سے باہر چلی گئی تھی ... شاید کینیڈا۔"
"ہاں! لیکن وہ لوگ اب پاکستان میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی وغیرہ کے سلسلے میں۔"
"کیا وہ اسی پرانے گھر میں رہتے ہیں؟" مائرہ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔
"یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"
"تمہیں پتا تو ہے، وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی۔ اکلوتی فرینڈ۔ لیکن اس کے کینیڈا جانے کے بعد پھر رابطہ ہی نہیں رہا۔ کم از کم تم اس کا فون نمبر تو لے لیتے۔"
"وہ کہہ رہی تھی کہ دو تین روز میں تم سے ملنے آئے گی۔"
"لیکن تمہیں اس سے نمبر لینا چاہیے تھا۔ میں فون کر کے اسے کھانے پر انوائیٹ کر لیتی۔" مائرہ کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔
"خیال نہیں رہا سوری یار!" احسان شاہ بہت دلچسپی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ مائرہ اب بھی ویسی ہی خوبصورت تھیں۔ وہ آج بھی ان کے عشق میں مبتلا تھے اور وہ ان کے لیے اتنی ہی اہم تھیں۔
"تم اب بھی ویسی ہی ہو مائرہ! لیکن تمہاری دوست بہت بدل گئی ہے۔ ایک نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہیں پایا۔ اس نے مجھے پہچان کر آواز دی اور بتایا کہ وہ روبی ہے تو تب پہچانا۔ اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔"
احسان شاہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ مائرہ نے ان کی طرف دیکھا اور دل گرفتگی سے سوچا۔
"اگر اللہ مجھ پر مہربان ہوتا تو ... آج میں یہاں نہ ہوتی ... اور فلک شاہ میری محبت کو نہ ٹھکراتا۔"
دل میں آج بھی پھانس سی اٹکی تھی اور اندر کہیں اس آگ سے ہی شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ جو دل و جان کو بھسم کرتے تھے۔ پتا نہیں یہ آگ کبھی بجھے گی بھی یا نہیں۔
"افسردہ مت ہو ڈیئر۔ میری غلطی میں نے اس سے نمبر نہیں لیا۔ میرے ذہن میں ہی نہیں آیا۔ لیکن پرامس کہ تمہاری دوست نہ آئی تو اسے ڈھونڈ لیں گے۔ تمہیں اس کے میکے کا ایڈریس تو یاد ہو گا نا؟ وہاں

سے پیار کریں گے۔" مائرہ کے چہرے پر چھا جانے والے بادل احسان شاہ کی نظروں سے چھپے نہ رہ سکے۔

مائرہ نے سرہلا دیا۔ اس وقت ان کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ جس سے احسان شاہ آج بھی بے خبر تھے۔

"اب خوش ہو جاؤ یار! میں کچھ دیر بابا جان کے پاس بیٹھوں گا اور پھر مجھے کسی کام سے جانا ہے۔ واپس آکر تمہاری سہیلی کو تلاشتے ہیں۔"

احسان شاہ اٹھ کر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ مائرہ نے اخبار اٹھالیا۔ لیکن اخبار سامنے رکھے وہ مسلسل روبی کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ روبی اسکول کے زمانے سے ہی ان کی دوست تھی۔ دونوں نے ایک ہی اسکول اور پھر ایف۔ اے تک ایک ہی کالج میں پڑھا تھا۔ پھر روبی کے والد لاہور سیٹل ہو گئے۔ لیکن دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا تھا اور پھر دو سال کی جدائی کے بعد انہوں نے روبی کے اصرار پر ہی لاہور سے ماسٹرز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں مزید دو سال انہوں نے اکٹھے گزارے تھے۔ وہ ہر ویک اینڈ پر روبی کے گھر چلی جاتی تھیں۔ فلک شاہ سے محبت اور احسان شاہ سے شادی تک وہ ہر بات سے آگاہ تھی۔ مائرہ کی شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی بھی شادی ہو گئی اور وہ کینیڈا چلی گئی۔ یوں اتنی پرانی دوستی میں دوریاں پیدا ہو گئیں۔

"یہ شانی بھی بس... کم از کم اس سے نمبر ہی لے لیتے۔"

انہوں نے جھنجلا کر اخبار صوفے پر پھینکا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ ان کے دل کی تڑپ اور روبی سے ملنے کی شدید خواہش ہی تھی کہ ابھی انہیں کمرے میں گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ روبی نے "الریان" کے گیٹ میں قدم رکھا اور کچھ ہی دیر بعد شمو کی رہنمائی میں وہ ہنستی کھلکھلاتی اس کے کمرے میں کھڑی تھی۔

"ہائے روبی! یہ تم ہو۔" وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئیں۔

"اس وقت میں تمہیں بہت شدت سے یاد کر رہی تھی اور مجھے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ احسان نے تمہارا نمبر کیوں نہیں لیا۔"

"غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی کہ تمہارا نمبر نہیں لیا۔ لیکن دیکھو! تم نے یاد کیا اور میں موجود۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور بیٹھ گئی۔

"شمو! احسان شاہ کو بتا دو نا کہ روبی آئی ہے۔ وہ بابا جان کے پاس ہیں۔"

انہوں نے شمو سے کہا، جو ابھی تک وہاں کھڑی تھی۔

"چھوٹے شاہ صاحب تو مصطفیٰ صاحب کے ساتھ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔"

"اچھا! ٹھیک ہے... تم کولڈ ڈرنک لاؤ اور پھر چائے لے آنا۔ اور ہاں! یہ لنچ بھی یہیں ہی کریں گی۔"

"یہ کیا تم لنچ وغیرہ کے چکر میں پڑ گئی ہو۔ میں بس کچھ دیر کے لیے تم سے ملنے آئی ہوں۔ لمبی ملاقاتیں، لنچ، ڈنر پھر کبھی۔ آج صرف چائے تک محدود رہوں گی۔" وہ پھر ہنسی۔

"تمہاری ہنسی اور بات کرنے کا انداز بالکل وہی ہے۔" مائرہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ "لیکن تم بدل گئی ہو۔ کچھ اماں اماں سی لگنے لگی ہو۔"

"تین بچوں کی ماں ہوں یار۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ تو اماں تو لگنا ہی ہے اور سچی بات ہے، مجھے اس طرح لگنا بہت پسند ہے۔ تھوڑا سا بھاری جسم، سیاہ بالوں میں سے جھانکتے کچھ سفید بال، لبوں پر ممتا بھری مسکراہٹ، بھئی! ماں تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اب تمہاری طرح لڑکی لڑکی سی لگنے والی ماں نہیں لگتی حالانکہ تین بچوں کی ماں تو تم بھی ہو۔ احسان بھائی نے بتایا تھا مجھے۔ لیکن یار! تم تو بالکل ویسی ہی ہو۔ وہی گورنمنٹ کالج والی طرح دار، نخریلی مائرہ حسین۔ سچ بتاؤ! یہ بچے کہیں سے ادھار تو نہیں لیے؟"

وہ پھر اونچی آواز میں ہنسی۔ مائرہ بھی مسکرا دیں۔

"تم ظاہر میں کچھ بدلی ضرور ہو۔ لیکن تمہاری آواز کا والیوم وہ ہی ہے، فل۔"

"ہاں یار! اسد بھی مجھے کہہ کہہ کر ہار گئے کہ ذرا آہستہ بولا کرو۔ لیکن اپنی یہ عادت نہیں بدل سکی۔ کیا کروں... لگتا ہے میرے والیوم سیلز میں ہی کچھ خرابی ہے۔ خیر چھوڑو۔ تم بتاؤ، تمہارے بچے کیسے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔"

"میری بیٹی نے ماسٹرز کر لیا ہے۔ بیٹے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ زبیر انجینئرنگ کے دوسرے سال میں ہے جبکہ عمر اے لیول کر رہا ہے۔"

"یعنی وقفہ بہت ضروری ہے۔" روبی ہنسی۔

"میرا بیٹا جاب کر رہا ہے اور بیٹیاں بھی فارغ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ان کی شادیوں کے سلسلے میں ہی پاکستان آئے ہیں۔ تم نے بیٹی کا رشتہ طے کر دیا؟"

"نہیں! ابھی تو نہیں۔"

"کہاں ہے... ملواؤ نا۔"

"اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ابھی سوئی ہے۔ کچھ دیر تک بلواتی ہوں۔"

شمو نے آکر جوس پیش کیا۔

"کیا ارادہ ہے اس کے لیے؟ تمہارے جیٹھوں وغیرہ کے لڑکے تو ہوں گے اور وہ کیا نام تھے تمہاری نندوں کے... عمارہ اور زارا۔"

وہ جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ "زارا کا تو انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہ! بہت افسوس ہوا۔" روبی نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"ارادہ تو تھا۔ مصطفیٰ بھائی کا بیٹا بہت پسند تھا مجھے۔ شاہ بھائی کی اور میری بھی خواہش تھی۔ لیکن رابی نہیں مانی۔"

"کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟"

"پتا نہیں یار۔ اس نے ایسا کچھ کہا نہیں ہے۔ لیکن وہ شادی کے لیے بھی راضی نہیں ہو رہی۔"

"بعض اوقات بچیاں ذمہ داری سے گھبراتی ہیں۔ میری اپنی بیٹی بھی یہ ہی کہتی ہے کہ وہ فی الحال شادی کی ذمہ داریوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے پاپا کی لاڈلی بھی تو بہت ہے۔ احسان نے بہت لاڈ اٹھائے ہیں اس کے۔"

"اور احسان بھائی کیا تمہارے اب بھی اس طرح دیوانے ہیں؟"

اور احسان شاہ جو کچھ دیر کے لئے مصطفیٰ شاہ کے ساتھ باہر گئے تھے اور شمو سے روبی کے آنے کا سن کر ادھر ہی رہے تھے، اپنا نام سن کر رک گئے۔ روبی کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا جہاں آج بھی مائرہ کی حکمرانی تھی۔ وہ آج بھی اس کے اتنے ہی دیوانے تھے۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر رک گئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مائرہ کیا کہتی ہے۔ لبوں پر مدھم مسکراہٹ لیے وہ مائرہ کا جواب سننے کے منتظر تھے۔

"ہاں! احسان آج بھی میرا دیوانہ ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا۔ اسی طرح محبت کرتا ہے۔"

"پھر مانتی ہو نا مجھے؟ میں نے کیا کہا تھا، یاد ہے نا؟ کہ شادی اس سے کرو، جو تم سے محبت کرتا ہے... نہ کہ اس سے جس سے تم محبت کرتی ہو۔ اگر تمہاری شادی کسی نہ کسی طرح فلک شاہ سے ہو بھی جاتی تو فلک شاہ تمہیں وہ محبت کبھی بھی نہ دیتا، جو احسان شاہ نے تمہیں دی۔"

اور احسان شاہ جنہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے ناب پر ہاتھ رکھا تھا، وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو روبی!" مائرہ نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن یہ دل... اس نے تو ہمیشہ فلک شاہ کی چاہ کی تھی۔ اسی سے محبت کی تھی۔ اسی کا ساتھ چاہا تھا۔"

"کیا تم اب بھی فلک شاہ سے محبت کرتی ہو مائرہ؟" روبی نے حیرت پوچھا۔

"نہیں! یہ محبت کب کی نفرت میں بدل چکی۔ بس ایک آگ دہکتی ہے اندر، جو دل و جان کو جلاتی ہے۔ انتقام کی آگ... اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ اس نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ مجھے ٹھکرایا ہے اور میں اسے کبھی سکھی نہیں رہنے دوں گی۔ میں نے قسم کھائی تھی روبی اس سے

اپنی انسلٹ کا بدلہ لوں گی۔ اس نے مجھ پر عمارہ کو ترجیح دی۔ اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے دوست کو دھوکا نہ دوں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔"

برسوں پرانے زخم کے ٹانکے کھل گئے تھے۔

روبی حیرت سے سن رہی تھی۔

"اور میں نے بدلہ لے لیا۔ اللہ نے مجھے موقع دیا اور شانی نے میری بات پر یقین کرلیا وہ "الریان" سے نکل گیا ہمیشہ کے لیے۔ وہ اب یہاں قدم تک نہیں رکھ سکتا۔ اس نے کہا تھا کہ میں احسان شاہ کے قابل نہیں ہوں اور میں نے احسان شاہ سے شادی کرلی۔ اور اب وہ عمر بھر یوں ہی جلتا کڑھتا رہے گا۔"

اور ناب پر ہاتھ رکھے، ساکت کھڑے احسان شاہ کو لگا تھا، ان کا دل ایسے ڈوبے گا کہ پھر کبھی ابھر نہیں سکے گا۔

"یہ کیسی محبت تھی تمہاری مائرہ؟" روبی کی آواز میں تاسف تھا۔ "فلک شاہ بہت اچھا انسان تھا۔ تم نے کیا کیا اس کے ساتھ؟"

"میں نے اسے "الریان" والوں کے دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن روبی! ایک بار پھر وہ میرے لیے امتحان بن گیا ہے۔ اس کی بیوی، اس کا بیٹا۔۔۔"

اور احسان شاہ نے ناب سے ہاتھ اٹھالیا۔ انہیں لگا اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑے رہے تو گرجائیں گے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے مڑے۔ آنکھوں کے سامنے فلک شاہ کا چہرہ آرہا تھا۔ کتنی بے یقینی تھی ان کی آنکھوں میں۔ جیسے انہیں احسان کی بے اعتباری کا یقین ہی نہ ہو۔۔۔ اور پھر جب وہ ان کے آفس آئے تھے۔ اور جب جب انہوں نے فون کیا تھا۔

پتا نہیں کیسے وہ لاؤنج اور پھر لاؤنج سے ڈرائنگ روم تک آئے تھے۔ انہیں اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی اور ڈرائنگ روم ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں اس وقت کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے صوفے تک آئے اور گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

آنکھوں کے سامنے فلک شاہ کا چہرہ ٹھہر گیا تھا، جب انہوں نے فلک شاہ کو "الریان" سے نکلنے کو کہا تھا تو ان کی نظریں۔۔۔۔

"اف۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور گرم گرم آنسو ان کے ہاتھوں کو بھگونے لگے۔

تو یہ چھبیس سال کی جدائیاں۔

اس کا ذمہ دار کون تھا۔۔۔ وہ اور مائرہ

کیوں کیا انہوں نے مائرہ کی بات پر یقین۔۔۔ کیوں حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی؟

زارا اور اماں جان کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ وہ آخری لمحوں میں اماں جان کی آنکھوں میں انتظار کی اذیت۔۔۔ وہ حسرت۔

ان کا دل چاہا، وہ چیخیں مار مار کر روئیں۔ وہ کتنے سالوں سے مائرہ کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے تھے۔ انہوں نے مائرہ پر یقین کرکے مومی کو کھودیا تھا۔ اپنے عزیز از جان دوست کو۔ گزرے سالوں کے کتنے ہی منظر آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ کتنی ہی بار مومی نے انہیں مائرہ کے متعلق بتانا چاہا تھا اور جب وہ مائرہ کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے تو مومی کا مضطرب ہونا اور کبھی کبھی کہنا۔

"یار! تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی محبت کے لیے؟"

اور پھر جب ان کی منگنی ہوئی تھی۔

جب وہ مومی کو لے کر رحیم یار خان گئے تھے۔

نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزر گئی۔ پھر وہ اٹھے اور چہرے کو اچھی طرح رومال سے پونچھنے کے بعد انہوں نے باہر کی طرف قدم بڑھایا۔ پھر کچھ سوچ کر واپس مڑے۔ پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا اور مروہ کا نمبر ملانے لگے۔

"مروہ پھپھو پلیز۔ مجھے وہ سب کچھ بتادیں، جو آپ مائرہ، مومی اور میرے متعلق جانتی ہیں۔ ایک بات بھی مت چھپائیے گا پلیز۔ بہت کچھ میں جان چکا ہوں۔۔۔ جو نہیں جانتا، وہ مجھے آپ سے سننا ہے۔"

"کیا سننا چاہتے ہو شانی؟ جو گزر گیا اسے بھول جاؤ۔"

"کیسے پھپھو؟ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ اور آپ کہہ رہی ہیں کہ بھول جاؤں۔ آپ جانتی نہیں پھپھو کہ مائرہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی بہ مومی سے۔۔۔"

"شانی بیٹا! تم۔۔۔"

"پھپھو پلیز۔ اب کچھ بھی چھپانے کا فائدہ نہیں ہے۔ میں مر رہا ہوں پھپھو۔"

اور جب مروہ سے بات کرکے احسان شاہ نے فون بند کیا تو ایک بار پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

مومی ان کے لیے کیا تھا۔

اور انہوں نے کیا کیا تھا۔

کچھ دیر وہ کھڑے ضبط کرتے رہے۔ پھر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ لاؤنج میں کھڑے کھڑے انہوں نے اپنے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اندر سے روبی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اس وقت مائرہ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنا والٹ نکال کر دیکھا۔ اور پھر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

فلک شاہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے براؤن لفافہ اٹھا کر اس میں سے ایک فائل نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگے۔ تب ہی عمارہ نے کمرے کا دروازہ کھول کر پوچھا۔

"آپ کی چائے یہاں لے آؤں یا لاؤنج میں چلیں گے؟"

عموماً شام کی چائے وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں ہی پیتے تھے اور ساتھ میں ٹی وی بھی دیکھ لیتے تھے۔

"یہیں۔۔۔ بھجوا دیجیے۔" فلک شاہ نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ "میں ذرا یہ دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ابیک نے اپنے نئے ناول کے مسودے کی کاپی بھیجی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میں اسے پڑھ کر مشورہ دوں۔"

"اچھا تو کیا اس کا نیا ناول مکمل ہوگیا ہے؟" عمارہ نے پوچھا۔

"نہیں! ابھی آخری باب رہتا ہے۔ لیکن وہ کچھ مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے مجھے بھجوایا ہے۔" فلک شاہ مسکرائے۔

"وہ دراصل ایک شاہکار تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ اس کے پہلے دو ناول بھی تو شاہکار ہی تھے۔"

عمارہ مسکرائیں تو ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور عمارہ کو لگا، جیسے وہ اضطراب اور بے چینی جو ہر وقت ان کے چہرے کا ہالہ کیے رکھتی تھی۔ اس وقت نہیں تھی۔ لاہور سے آنے کے بعد پہلی بار عمارہ نے انہیں آج کچھ پرسکون اور مطمئن دیکھا تھا۔ وہ بھی مطمئن سی کمرے سے نکل گئیں تو فلک شاہ نے اپنے سامنے کھلے صفحے پر نظر ڈالی۔

"اور صدیوں پرانی زمین کا سینہ دکھوں سے چھلنی ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے ہی اس کی آنسوؤں کے ساتھ یاری ہے۔ حضرت آدم کے پہلے آنسو کے ساتھ اس نے پہلا آنسو بہایا تھا۔ اس نے تمہارے دکھ اوڑھے اور تمہارے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر سنبھالا۔ تمہارے دکھ کے کانٹے اپنی انگلیوں سے چنے اور پوروں کو لہولہان کیا۔۔۔ اور تمہارے راستے اپنی پلکوں سے صاف کیے۔ تمہارے ساتھ مل کر روئی تمہارے ہر دکھ اور ہر غم پر۔۔۔ تم تو اپنے دکھ اس کی جھولی میں ڈال کر شانت ہوجاتے ہو۔ وہ تو ازل سے تمہاری غمگسار ہے۔ لیکن تم نے کبھی اس کی غمگساری نہیں کی۔

تم اکڑ کر زمین پر چلتے ہو اور اپنے قدموں کی دھمک سے اس کا سینہ زخمی کرتے ہو۔"

"ہاں! تم صحیح کہتی ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن کتنی عجیب بات ہے شاعر! تم نے کبھی زمین کی قدر نہیں کی۔ اپنی غمگسار کو اور تمہارے دکھوں پر رونے والی کو تم نے ہمیشہ اپنی ملکیت جانا۔ کبھی اس کی

روتی آنکھوں کو نہیں دیکھا اور کبھی نہیں سوچا کہ تمہارے قدموں تلے بچھنے والی نے تمہارے ہر دکھ کو اوڑھا ہے اور آنسو بہائے ہیں۔"

فلک شاہ نے ایک ساتھ دو تین صفحات الٹے۔

"اور جب نماز فجر کے وقت فیروز ابو لولو نے خنجر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا تھا اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ماتھے پر شہادت کا جھومر سجا تھا۔

اور جب حسن و حیا کے پیکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے قرآن کے صفحات رنگین ہوئے تھے تو زمین کے آنسو رکتے نہ تھے۔

انہوں نے ایک اور صفحہ پلٹا۔

"اور جب زرعہ بن شریق تمیمی نواسہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سر کاٹتا تھا..... اور سنان بن انس نخعی سر مبارک نیزے پر اٹھاتا تھا اور خولی بن یزید اصبحی سر مبارک لے کر چلتا تھا تو زمین دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور فریاد کرتی تھی اور جب حضرت زینب رض لٹے پٹے قافلے کو لے کر کربلا سے روانہ ہوتی تھیں تو زمین ان کے قدموں سے لپٹتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔"

عمارہ ملازمہ کے ساتھ چائے لے کر آئیں اور ملازمہ کو جانے کا اشارہ کر کے پلیٹ اور نگٹس ان کی طرف بڑھائے۔

"نہیں! صرف چائے لوں گا۔" فلک شاہ نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیسا ہے؟" عمارہ نے چائے بناتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"اس کے پہلے دو ناولوں سے مختلف ہے۔ ابھی تو یوں ہی سرسری سا بیچ میں سے دیکھ رہا ہوں۔ تفصیل سے پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔ ویسے اچھا لگ رہا ہے۔"

"ایبک کو اللہ نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔"

عمارہ کے لہجے سے محبت چھلکتی تھی۔ انہوں نے چائے کا کپ فلک شاہ کی طرف بڑھایا۔

"آج انجی آرہی ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا۔ دونوں رات کھانا کھا کر ہی جائیں۔ کیا پکواؤں؟"

"یہ آپ کا شعبہ ہے عموجی۔ جو جی چاہے اور جو ہماری انجی اور جواد کو پسند ہو۔"

وہ مسکرائے اور اس مسکراہٹ میں عمارہ کو وہی پرانے رنگ چھلکتے دکھے تھے۔ عمارہ بھی مسکرادیں۔

"ٹھیک ہے۔ انجی سے پوچھتی ہوں۔"

وہ باہر چلی گئیں۔ فلک شاہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے پھر سے فائل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک صفحہ پلٹتے ہوئے وہ رکے۔

"اور جب حجاج بن یوسف مکہ پر حملہ آور ہوا اور مکہ کی سرزمین پر عبداللہ بن زبیر کے ماتھے پر شہادت کا تاج سجا اور حضرت اسما بعد شہادت اپنے لخت جگر سے مخاطب ہوتی تھیں تو زمین کے آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھوں سے بہتے تھے۔" انہوں نے صفحہ پلٹا۔

"اور تم جانتے ہو شاعر! کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور حکومت کے آخری ایام میں بحر اوقیانوس سے کاشغر اور سندھ تک مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے لہرادیے تھے۔"

"ہاں! میں نے ایف۔ اے میں اسلامی تاریخ رکھی تھی۔" میں نے حورعین کی طرف دیکھا۔

"حالانکہ تمہیں تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔" حورعین کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ میں مبہوت سا اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں! لیکن میرے مضمون کے ساتھ میرے کالج میں ہسٹری کا کمبینیشن (Combination) تھا۔ سو۔"

"تو تم پاس ہوگئے تھے؟" وہ دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"بس ہو ہی گیا تھا۔ چند سوال رٹ لیے تھے۔ کام چل گیا۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی لبوں پر مسکراہٹ لیے مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے اچھا لگا۔

پہلی بار اس نے آنسوؤں سے ہٹ کر کوئی بات کی تھی۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر اذیت کے علاوہ کوئی اور تاثر دیکھا۔ میرا جی چاہا آج وہ کوئی اور بات نہ کرے اور یوں ہی مجھ سے میرے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہوگئی۔

"مشرق کی طرف محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے سے ہوتا ہوا ملتان تک جا پہنچا تھا تو قتیبہ بن مسلم کاشغر ترکستان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ مغرب میں موسیٰ بن نصیر کا لشکر فرانس کی حدود میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اور طارق بن زیاد نے اندلس میں فتح کے جھنڈے گاڑھے تھے۔"

پتا نہیں اسے تاریخ کو کھنگالنے کا اتنا شوق کیوں تھا۔ میں جھنجلایا۔

"ہاں! مجھے علم ہے کہ طارق نے کشتیاں جلائی تھیں اور محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی تھی اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے خلیفہ بنتے ہی۔"

میں چاہتا تھا' آج ہم اپنے متعلق باتیں کریں اور اس کے لبوں پر وہی پیاری سی مسکراہٹ ہو' جو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھی تھی۔ لیکن وہ جب تاریخ کے ایوانوں میں گھوم رہی ہوتی تھی تو گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔

"ہم بڑی بدنصیب قوم ہیں شاعر! اپنے محسنوں کو مار کر ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کاٹتے ہیں۔ تم نے تو اسلامی تاریخ پڑھی ہے۔ بھلے نصاب کے طور پر سہی۔ تم تو جانتے ہو نا' سلیمان نے موسیٰ بن نصیر کے ساتھ کیا کیا۔ وہ موسیٰ بن نصیر جس نے آدھی دنیا کو فتح کیا تھا۔ جو افریقہ اور ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کا بانی تھا۔ اس پر خیانت کا الزام لگا کر اور سارا دن دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے لگائے جاتے تھے تو زمین کے آنسو اس نوے سالہ بہادر شخص کا حال دیکھ کر رکتے نہ تھے۔" وہ پھر افسردہ ہوئی۔

"اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا۔ اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائی گئیں۔ جائیداد ضبط کرلی گئی اور اس کے بیٹوں عبدالرحمن' عبدالعزیز اور عبداللہ کو شہید کردیا گیا۔ زمین نے اس فاتح کو سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھ کر لہو کے آنسو روئے۔"

"ہاں! میں نے پڑھا تھا۔ جرمانے کی رقم پوری کرنے کے لیے موسیٰ بن نصیر کو گلے میں طوق ڈال کر اور ہاتھ میں کشکول پکڑا کر کھڑا کردیا جاتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں نابینا بھی ہوچکے تھے۔"

میں نے پھر اس کی بات کاٹی تھی۔

"اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے طارق بن زیاد' محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو بھی مروادیا تھا۔"

اس نے ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی۔

"وہ چاہتے تو سلیمان کا حکم نہ مانتے۔ ان کے چاہنے والے ان کے سروں پر تاج رکھتے۔ لیکن وہ آج کے مسلمان نہیں تھے۔ انہیں ملت کا اتحاد اپنی زندگیوں سے زیادہ عزیز تھا۔"

اس نے نظریں میرے چہرے سے ہٹالیں۔

"اور وہ محمد بن قاسم' جس نے اہل سندھ کو زندگی کی نوید دی تھی۔ اور طارق بن زیاد جو موسیٰ بن نصیر کا لے پالک بیٹا تھا۔ وہ بہادر..... آہ! ہم بڑی بدنصیب قوم ہیں۔"

اس نے دہرایا اور ایک آہ بھر کر خاموش ہوگئی اور سر جھکالیا۔

"تو....." بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے المیے پر اتنا نہیں روئی تھی۔ جتنا اسلامی تاریخ کے المیوں پر آنسو بہاتی تھی۔

"تو میں کہہ رہی تھی کہ جب یزید بن ابو کبشہ محمد بن قاسم کو گرفتار کرنے آرہا تھا' تو زمین کے آنسو بہتے تھے اور وہ کم عمر سپہ سالار کی بلائیں لیتی اور اس پر نثار ہوتی تھی۔

اور جب مالک بن یوسف' صالح سلیمان کے حکم پر اسے قتل کرتا تھا تو زمین بلکتی تھی۔ آہ "واسط" کی

زمین پر وہ صبح کا ستارہ غروب ہو گیا۔"

فلک شاہ نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور بہت دھیان سے شروع سے پڑھنے لگے۔ انہیں یہ ناول بہت دلچسپ اور منفرد لگ رہا تھا۔ ایک دم دروازہ کھلا اور عمارہ اندر آئیں۔

"مومی... مومی! دیکھیں کون آیا ہے۔" ان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی اور سانس پھولا ہوا تھا۔

"کون؟" انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

اور پھر جیسے ان کی نظریں وہیں ساکت ہو گئیں۔ لمحہ بھر تو وہ بے یقینی سے دیکھتے رہے۔ پھر ان کے لبوں سے کانپتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"شانی۔" انہوں نے ہتھیلیوں کے زور پر اٹھنے کی بے اختیار کوشش کی۔ پھر اپنی بے بسی پر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر بھاگ کر ان کا استقبال نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے گلے نہیں لگ سکتے تھے۔

"شانی!" ان کے لبوں سے پھر نکلا۔ اور ان کی آنکھیں برس پڑیں۔

احسان شاہ تڑپ کر ان کے قریب آئے اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"مومی! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں غلط جانا۔"

"شانی!" فلک شاہ نے بازو پھیلا دیے اور احسان شاہ بیٹھے بیٹھے ہی ان کے گلے لگ گئے۔ دونوں رو رہے تھے۔ لفظ جیسے دونوں کے پاس ہی نہیں تھے۔

"شانی بھائی! پلیز۔" عمارہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اب بس کریں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"مجھے کچھ نہیں ہو گا عمو!" احسان شاہ نے مڑ کر عمارہ کو دیکھا اور پھر فلک شاہ کی طرف۔ جو ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر رہے تھے۔

"میں تو ہمیشہ سے بے وقوف تھا مومی! مجھے تو بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر تم نے مجھے کیوں نہ بتایا۔ صاف صاف... پہلے ہی دن... جب تمہیں لگا تھا کہ وہ میرے ساتھ مخلص نہیں۔"

"جو گزر گیا، سو گزر گیا شانی!" فلک شاہ نے پُرنم آنکھوں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ "میں چاہتا تھا مرنے سے پہلے تمہیں دیکھ لوں۔ سن لوں کہ تمہاری بدگمانی دور ہو گئی ہے۔ میں اس طرح مرنا نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے بدگمان ہو۔ میں نے بارہا دعا کی کہ میری قبر پر مٹی ڈالنے والوں میں تمہارے ہاتھ بھی ہوں۔ میرے لیے رونے والی آنکھوں میں تمہاری آنکھیں بھی ہوں۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارا دل صاف ہوا۔"

"مومی! تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔ مجھ سے خفا تو نہیں ہو نا؟" احسان شاہ کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔

"نہیں تم سے کبھی خفا تھا ہی نہیں یار! جانتا تھا، تمہیں بدگمان کیا گیا۔"

"اور میں بدگمان ہو گیا۔ لیکن کیوں ہوا میں بدگمان ... کیوں؟ تمہیں تو میں بچپن سے جانتا تھا۔ اور وہ صرف چند برسوں کی رفیق تھی۔ میں نے اس کا اعتبار کیا... تمہارا نہیں۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں کیوں نہیں دیکھا؟ تمہارے چہرے کو کیوں نہیں پڑھا؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچنے لگے۔

"کیا کر رہے ہو شانی؟" فلک شاہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"کیا کروں... کیا کروں میں مومی! جو اس اذیت کو کم کر سکے... جو دل و جان کو ٹکڑے کیے دیتی ہے۔ کیسے کم کروں اس دکھ کو جو صبح سے دل چیر رہا ہے؟"

فلک شاہ نے ہاتھ بڑھا کر انہیں پھر سے گلے لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے۔ اس دکھ نے چھبیس سال تک ان کے دل کو آرے کی طرح چیرا تھا۔ زخم لگائے تھے۔

"مومی! میں کیا کروں؟ کیا کروں ایسا جو ان سارے گزرے برسوں کو واپس لے آئے؟"

احسان شاہ کہہ رہے تھے اور ان کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ایک بار پھر دونوں دوست بلک بلک کر رو

رہے تھے اور ان کے آنسو ایک دوسرے کے کندھے بھگو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایک بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں "زمین کے آنسو" کی فائل تھی۔ اس نے فلک شاہ کو اس کی فوٹو کاپی بھیجی تھی۔ انہوں نے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن نظر ثانی کرنے کو بھی کہا تھا۔ سو فجر کی نماز پڑھ کر وہ سویا نہیں تھا اور فائل اٹھالی تھی۔ وہ اس ناول کو یکسوئی سے لکھ نہیں سکا تھا۔ پہلے دو ناول اس طرح وقفہ دے کر نہیں لکھے تھے اس نے۔

"بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ مزید لکھنے سے پہلے مجھے پچھلے لکھے ہوئے کو ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔" اس نے ورق گردانی کرتے ہوئے سوچا اور اپنے سامنے کھلے صفحے پر نظر ڈالی۔ یہ صفحہ نمبر 253 تھا۔

"جب صلاح الدین ایوبی بیت المقدس کی خاطر جنگ کر رہا تھا تو عباسی خلفاء عیش و عشرت میں پڑے تھے۔ بغداد کے چوراہوں پر مناظرے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے فرقے کو برا کہا جاتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ چھ سو سال پہلے ایک طرف کوہ البرز کی چوٹیوں پر اسلام کا جھنڈا لہرانے والے اور دوسری طرف افریقہ کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں گھوڑے دوڑانے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وہ صحرائے گوبی کا ایک چرواہا تھا۔ جس کا نام تموچن تھا اور تاریخ میں چنگیز خان کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ اس کی قیادت میں منگولیا کے وحشی قبائل ایک آندھی کی طرح اٹھے اور شہروں اور بستیوں کو جلاتے چلے گئے تھے اور ان کے جرنیل اپنی فتح کی یادگار میں انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے تھے تو زمین اپنے وجود پر ان میناروں کی تعمیر سے اذیت میں تھی۔ اور ان مسلمانوں کے لیے اس کا دل روتا تھا اور جب جلال الدین خوارزم شاہ تھک کر اس قوم سے مایوس ہو کر اکیلا جاتا تھا تو زمین اس کے ان دیکھے آنسو اپنے نامعلوم ہاتھوں سے پونچھتی تھی اور جانتے ہو شاعر! تاریخ کبھی کسی قوم کی اجتماعی غلطی معاف نہیں کرتی۔ وہ چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان تھا اور یہ معتصم باللہ کی خلافت کا تیسرا سال تھا، جب وہ بلا کی طرح نازل ہوا اور بغداد نے وہ تباہی دیکھی، جس کے سامنے بابل و نینوا کی داستانیں ہیچ ہیں۔ تب زمین نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اس کا شمار ہی نہیں۔ دجلہ کے سرخ پانی میں اس کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے اور کتب خانوں سے اٹھنے والا دھواں اس کے دل میں آگ لگاتا تھا۔" اس نے چند صفحات ایک ساتھ پلٹ دیے۔

"تو زمین کے آنسوؤں کا تو حساب ہی نہیں ہے شاعر! وہ کب کب روئی۔ کب کب آنسو بہائے۔" میں اس کی بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

"جب عبداللہ فرڈیننڈ کو غرناطہ کی چابیاں دے رہا تھا۔
جب مسجد قرطبہ کو کلیسا میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔۔۔
اور جب ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کو شہید کیا جا رہا تھا اور جب 1857ء میں برصغیر کے مسلمانوں کو سولیوں پر چڑھایا جا رہا تھا۔۔۔ اور جب بخت خان مایوس سر جھکائے لال قلعہ سے نکلا تھا۔۔۔ جب جلیانوالہ باغ میں نہتے لوگوں پر جنرل ڈائر گولیاں چلا رہا تھا تو کیا زمین اپنے آنسو روک پاتی ہوگی؟ نہیں نا!"

ایک نے پھر ایک ساتھ کئی صفحات پلٹ دیے یہ صفحہ نمبر 280 تھا۔ "تاریخ نے اتنی بڑی ہجرت دیکھی۔ جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ ہجرت برصغیر کی تقسیم کے وقت دیکھی گئی اور مشرقی پنجاب میں ظلم و ستم اور بربریت کی جو داستانیں لکھی گئیں انہوں نے تاتاریوں کے ظلم کو مات کر دیا۔ یہ پاکستان یوں ہی نہیں بن گیا تھا۔ بڑی قربانیاں دی گئی تھیں۔ آہ!" اس کے لبوں سے آہ نکلی۔

"کیا ہوا حورعین؟" میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آہ شاعر! تم لوگوں نے تاریخ کو مسخ کیا۔ تمہارے ادیبوں نے مشرقی پنجاب میں ہونے والے ظلم و شقاوت کی کہانیاں تو کم لکھیں۔ لیکن یہاں ہونے والے اکا دکا واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔"

"نہیں خیر! ایسا تو نہیں ہے۔ لکھا تو ہے۔ لیکن شاید تم نے نہیں پڑھا۔ نسیم حجازی کی خاک و خون۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"ہو سکتا ہے۔ میں نے وہ سب نہ پڑھا ہو۔ لیکن شاعر! یہ تو کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔"

"کون سی؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ ہی سقوط ڈھاکہ اور سانحہ مشرقی پاکستان۔ مکتی باہنی والوں نے جو مظالم کیے۔ بہاریوں پر اور مغربی پاکستانیوں پر اور مغربی پاکستان کے فوجیوں پر۔ انہیں بتاتے میرا دل کانپتا ہے۔ لیکن تمہارے بڑے بڑے ادیبوں کی انگلیاں تو صرف اپنی فوج کی طرف اٹھتی رہیں۔ اپنی ہی فوج کو بدنام کرنے میں وہ غیروں سے بھی بڑھ کر نکلے۔ کسی نے حقیقت کو جاننے اور تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تیس لاکھ بنگالی مارے گئے۔ یہ ایسا جھوٹ تھا۔ جسے سب نے تسلیم کر لیا کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ حقیقت پرکھنے والے تو دوسرے ہیں، جو صفحات الٹ کر دیکھتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں لیکن تمہارا قلم پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ تمہیں کیا۔۔۔ تمہیں تو اپنی کرسی سے مطلب ہے اور دولت سے، جو تمہارے بینک بھر رہی ہے۔ تم نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ محصور بہاریوں پر کیا گزرتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا حورعین! مجھے تاریخ سے کیا لینا دینا۔ مجھے زمین کے آنسوؤں سے کیا مطلب۔ مجھے تو تمہارے آنسو بے قرار کرتے ہیں اور تمہارا کرب میرے دل میں زخم ڈالتا ہے۔ میں جو اتنے عرصے سے اس ریسٹ ہاؤس میں پڑا ہوں تو تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کیوں؟ تمہارے لیے۔۔۔ صرف تمہارے لیے حورعین! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ آنکھوں میں حیرت لیے مجھے دیکھنے لگی۔

"میرا یقین کرو حورعین! یہاں کی سردی میری ہڈیوں کو کڑکڑاتی ہے۔ لیکن میرا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تمہارے بغیر۔۔۔ تم میرے ساتھ چلو حورعین!"

میں جذباتی ہو رہا تھا اور وہ یوں ہی آنکھوں میں حیرت لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سوری!" مجھے ایک دم ہی خیال آیا تھا۔ میں نے رابعہ، رقیہ اور مریم کے متعلق تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور وہ اکیلی یہاں اس وادی میں کیا کر رہی ہے۔ میں اس کے قریب ہی دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔

"حورعین! رابعہ تو بچ گئی تھی۔ پھر کیا ہوا تھا؟ کیا تمہاری حویلی یہیں قریب ہے؟"

حورعین نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں ایک دم پانیوں سے بھر گئیں اور وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چوہدری فرید کی حویلی میں اب ثریا کی حکومت تھی۔ وہ سر اٹھا کر تنی ہوئی گردن کے ساتھ چلتی تھی کہ اس کی گود میں چوہدری فرید کا وارث تھا۔ اسے تو اب نورو اور میراں کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ بلا سے وہ بن سنور کر ڈیرے پر جائیں اور چوہدری فرید کو لبھائیں۔ وہ وارث کی ماں تھی اور اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔"

وہ سر جھکائے ہولے ہولے بول رہی تھی اور میں ایک بار پھر اسے خاموش ہو کر سن رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ساری گفتگو میں مجھے صرف مریم کی کہانی سے دلچسپی تھی۔

مریم جو حورعین کی ماں تھی۔

حورعین جو خمسہ تھی پانچویں۔

"اور چوہدری فرید کو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ بھی اس گھر میں رہتی ہے اور ثریا جتنے ہی حقوق رکھتی ہے اور ثریا سے زیادہ زمین کی مالک ہے۔ لیکن وہ اسے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ وہ ثریا سے اکتاتا تو ڈیرے کی راتیں رنگین ہو جاتیں اور میراں اور نورو سے بے زار ہوتا تو ثریا کے پہلو میں پناہ ڈھونڈتا۔ مریم تو اب کہیں بھی نہیں تھی۔۔۔ ایک بات بتاؤ گے شاعر؟"

حورعین نے یکایک سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

میں جو بہت دھیان سے اسے سن رہا تھا' ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ نورو اور میراں جیسی عورتوں میں مرد کے لیے کیا کشش ہوتی ہے؟ کیا بات ہوتی ہے ان میں جو مریم جیسی خوبصورت اور صابر عورت اور ثریا جیسی طرح دار عورت میں نہیں ہوتی؟ وہ جو نہ خاندانی ہوتی ہیں' نہ شریف۔"

"پتا نہیں۔" میں گھبرا گیا۔ "میرا اس طرح کی عورتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور سر جھکالیا اور بات وہیں سے ہی شروع کی' جہاں چھوڑی تھی۔

"تو مریم سارا دن مصروف رہتی اور شام ہوتے ہی گھڑونچی کی جالیوں سے جھانکنے لگتی کہ دن بھر گاؤں کی گلیوں میں گھومنے کے بعد شام کو دارو سائیں پیپل تلے آکر بیٹھ جاتا تھا۔ چپ ساکت۔۔۔ پتا نہیں کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کے گیت بھی مریم کو رلاتے تھے اور اس کی چپ بھی اسے رلاتی۔ وہ رقیہ کے کندھے پر سر رکھے روئے چلی جاتی۔"

"مسعدی اور فرو بہت یاد آتی ہیں رقی" اور رقیہ اس کا سر سینے سے لگائے ہولے ہولے تھپکتی رہتی پھر۔ ایک دن جانتے ہو کیا ہوا؟"

حور عین نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"چوہدری فرید کی بڑی بہن نے اپنا دوپٹا چوہدری فرید کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ اپنے ذہنی معذور بیٹے کا رشتہ لائی تھی۔

"یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی فریدے! بڑی آس لے کر آئی ہوں۔"

اور چوہدری فرید نے اس کا دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پر ڈال دیا۔

"اپنے ہی اپنوں کا تن ڈھانپتے ہیں۔" اس نے مریم کی طرف دیکھا' جو ساکت بیٹھی تھی۔

"میری بہن ہے اور اس کا دکھ مجھے ہی بانٹنا ہے' غیروں کو نہیں۔" وہ وضاحت کر رہا تھا اور مریم پتھر ہو گئی تھی۔

یہ چوہدری فرید کی وہ بہن تھی' جس نے رقیہ کے بعد ہر بیٹی کی پیدائش پر چوہدری فرید کو پرسہ دیا تھا اور بین ڈالے تھے۔ لیکن اب اپنے ذہنی معذور بیٹے کے لیے بیوی چاہیے تھی اسے۔

"یہ ظلم مت کرو۔" مریم چوہدری فرید کے پاؤں پر گر پڑی۔

"یہ ظلم نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے۔ اسے میں رشتہ نہیں دوں گا تو کون دے گا؟"

"کیا رقیہ؟" میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے نچلے ہونٹ کو بری طرح دانتوں سے کچل ڈالا۔ "ہماری برادری میں لڑکی کی دوسری شادی کا رواج نہیں ہے۔ چاہے وہ بیوہ ہو یا مطلقہ۔ سولہ سال کی ہو یا بیس سال کی۔ اسے باقی ماندہ زندگی یوں ہی گزارنا ہوتی ہے۔"

"تو کیا رابعہ؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

لیکن وہ بھیگی پلکوں کو اوڑھنی کے پلو سے پونچھتی اور ہونٹ کچلتی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے آہستگی سے کہا۔

"اور جس روز چوہدری فرید کی بہن گاؤں میں بتاشے بانٹ رہی تھی۔ اس رات مریم پیپل تلے بیٹھے دارو سائیں کے سامنے دو زانو بیٹھی زاروں زار روئی تھی۔

"لوگ کہتے ہیں تو سائیں ہے۔ اللہ کا پیارا۔ میری رابعہ کے لیے دعا کر۔ وہ بہت معصوم ہے۔ بہت چھوٹی ہے۔ میری زبان میں تاثیر نہیں ہے دارو سائیں۔ میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ تو دعا کر میری رابی کے لیے۔"

اور دارو سائیں خالی خالی آنکھوں سے اسے تکتا تھا۔ جیسے کچھ نہ سنتا اور سمجھتا ہو۔ بس ایک بار اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس نے مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر فوراً ہی اٹھالیا تھا اور مریم مایوس ہو کر واپس آگئی تھی اور پوری رات وہ جاگی تھی۔ کبھی اندر کبھی باہر رقیہ اس کے ساتھ جاگتی اور آنسو بہاتی تھی اور حور عین اور رابعہ بے خبری کی نیند سوتی تھیں۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب مریم بے چین ہو کر صحن میں آبیٹھی تھی اور دارو سائیں کی آواز ہوا کے دوش پر پڑتی مریم تک آئی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے دارو سائیں کی آواز سنی تھی اور دارو سائیں کی آواز میں آج جیسے بہت کرب اور درد تھا۔ یوں جیسے اس کے گلے سے لفظ نہیں آنسوؤں میں بھیگی سسکیاں نکل رہی ہوں۔

"نی میں نیل کرائیاں نیلکاں
میرا تن من نیلو نیل"

وہ بار بار یہ ہی دہراتا تھا اور سسکیاں لیتا تھا۔ مریم بے چین ہو کر گھڑونچی تک آئی تھی۔ لیکن باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اماوس کی رات تھی اور اس اندھیرے میں دارو سائیں نظر نہیں آتا تھا۔ بس اس کی آواز تھی' جو سماعت میں سسکیوں اور آہوں کی صورت آتی۔۔۔ اور اس صبح مریم منہ اندھیرے ہی حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ گھٹنے موڑے دارو سائیں پیپل تلے اوندھا پڑا تھا۔ مریم نے دوڑ کر اسے سیدھا کیا۔ اس کا ماتھا لہولہان تھا۔

"دارا۔۔۔ دارا شکوہ!"

مریم ہاتھوں سے اور دوپٹے کے پلو سے اس کی پیشانی سے بہتا خون پونچھتی اور روتی تھی۔

"دارا شکوہ!" وہ اس کا پورا نام لیتی تھی کہ بچپن میں دارا شکوہ کو اپنے پورے نام سے بلایا جانا پسند تھا۔

مریم بلاتی تھی اور دارو سائیں کے کانوں میں کوئی بھولی بسری آواز رس گھولتی تھی۔

"دارا شکوہ! تم نے خود کو زخمی کیا تو پھر زخم صاف نہیں کروں گی۔ پھپھو نے منع کیا ہے نا درخت پر چڑھنے سے؟"

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

"مریم!"

دارا شکوہ نے اسے بلایا تھا۔ آواز دی تھی۔ مریم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اور ابھی اس کی آنکھوں کی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ دارو سائیں کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سر پیچھے ڈھلک گیا۔

"نہیں۔" مریم اس کے بند پپوٹوں پر ہاتھ رکھے اسے دیوانہ وار پکار رہی تھی اور اس کے کانوں میں دارو سائیں کی آواز گونج رہی تھی۔

"نی میں نیل کرائیاں نیلکاں۔"

"دارو سائیں مر گیا تھا کیا؟"

میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا تو حور عین نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ جیسے اسے میری ناسمجھی پر حیرت ہوئی ہو اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی سیاہ اوڑھنی سے اچھی طرح خود کو لپیٹا اور پتھر پھلانگتی نیچے وادی کی طرف جانے لگی۔

"حور عین رکو۔ سنو' مجھے تم سے کچھ کہنا تھا پلیز۔"

لیکن حور عین رکی نہیں۔ وہ میری نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی اوڑھنی کا ایک پلو پتھروں پر گھسٹتا تھا۔"

ایبک بہت دھیان سے پڑھ رہا تھا اور کہیں کہیں کچھ اضافہ بھی کرتا جا رہا تھا کہ عمر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"ارے عمر! تم۔"

ایبک نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور بڑے تپاک سے اسے ملا۔ وہی ہمیشہ والی گرم جوشی اور محبت کا اظہار۔ لیکن عمر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"اریان" میں سب ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔" عمر نے سر ہلایا۔

"تم کچھ خاموش لگ رہے ہو عمر! خیر تو ہے نا؟" ایبک نے بغور اسے دیکھا۔

"وہ آپ ناراض ہیں ایبک بھائی؟ ماما نے۔۔۔"

"کچھ مت کہنا یار! میں ناراض نہیں تھا۔ بزی تھا۔" ایبک نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

"سوری ایبک بھائی! وہ۔۔۔" عمر نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

"کہا نا' کچھ مت کہنا۔ ایسا کچھ نہیں ہے' جس کے لیے تمہیں سوری کرنے کی ضرورت ہے۔" ایبک نے محبت سے اس کے بال بکھرائے۔

"بابا جان بہت اداس ہیں اور آپ کو پتا ہے۔ انہوں نے اس روز کے بعد سے سب کے ساتھ ٹیبل پر کھانا نہیں کھایا۔ کیا آپ اب کبھی "الریان" نہیں آئیں گے؟" اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"ارے نہیں یار! تم سے یہ کس نے کہا؟ تمہیں نہیں معلوم ایبک فلک شاہ کو بھی اپنے بابا کی طرح "الریان" سے عشق ہے۔ وہ اس سے دور نہیں ہو سکتا۔"

"انکل "الریان" سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن دور ہو گئے۔ حالات کا کیا پتا ہوتا ہے ایبک بھائی۔" عمر بدستور سنجیدہ تھا۔

"زیادہ فلسفی بننے کی ضرورت نہیں یار۔" ایبک نے ہلکی سی اس کی ناک دبائی۔ "چلو! ابھی چلتے ہیں میں فریش ہو کر آتا ہوں۔"

"سچ ایبک بھائی!" عمر کی بھوری آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بالکل سچ" ایبک مسکرایا اور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگا۔

☼ ☼ ☼

رابیل لاؤنج میں تنہا بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں اخبار تھا۔ لیکن وہ اخبار نہیں پڑھ رہی تھی اور نہ ہی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ بڑے دنوں بعد وہ آج یوں لاؤنج میں آکر نیچے بیٹھی تھی۔ ورنہ بس کھانا لگنے کے بعد آتی اور پھر چلی جاتی تھی۔ نیچے خاموشی تھی۔

رابیل ابھی تک سب کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ حالانکہ مونی یا مرینہ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ لیکن رابیل کو لگتا تھا جیسے وہ اب نظر اٹھا کر کبھی مونی یا مرینہ سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

پتا نہیں وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ مما نے اس طرح کی بات کیوں کی اور ایبک کیا وہ کبھی اس کا سامنا کر پائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔۔۔ اور کیا کبھی ایبک جان پائے گا کہ ایک شام اچانک میرے دل کی دیواروں پر یہاں وہاں ہر جگہ اس کی محبت کے چراغ جل اٹھے تھے کیا نارسائی میرا مقدر ہے۔ اور کیا۔

شمو کچن سے ڈسٹر اٹھائے لاؤنج میں آئی۔

"باجی! ڈسٹنگ کر لوں؟"

"ہاں!" رابیل نے چونک کر اسے دیکھا۔ تب ہی باہر گاڑی کا ہارن بجا۔

"عمر بھائی آگئے ہیں شاید۔" شمو دروازہ کھولنے کے لیے جانے لگی۔

"کیا عمر گھر پر نہیں ہے؟ آج تو چھٹی تھی۔" رابیل نے پوچھا۔

"ہاں! وہ کچھ دیر پہلے ہی گئے تھے۔"

گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ شمو اندرونی دروازہ کھولنے لگی۔ رابیل نے مڑ کر دیکھا۔ عمر کے ساتھ ایبک بھی اندر آیا تھا۔ رابیل کا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید اب ایبک کبھی "الریان" نہیں آئے گا۔ لیکن وہ آگیا تھا۔ یقیناً "عمر اسے لینے گیا تھا۔ شاید بابا جان نے اسے بھیجا ہو۔

ایبک اسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکا گیا تھا۔ لیکن پھر "السلام علیکم" کہتا ہوا تیزی سے عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رابیل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے عمر سے پوچھا۔

"کیا وہ مجھ سے خفا ہیں؟"

"ارے نہیں رابی آپی! وہ تو ماما سے بھی خفا نہیں ہیں۔ کہہ رہے تھے۔ بڑی ہیں۔ انہیں جو بہتر لگا' انہوں نے کیا۔ وہ ایسے ہی ہیں گریٹ" رابی سے بات کر کے وہ بھی ایبک کے پیچھے لپکا۔ جہاں عبدالرحمٰن شاہ اسے گلے لگائے کہہ رہے تھے۔

"بہت افسردہ تھا تمہارے لیے۔ ابھی میں اور شانی تمہاری طرف ہی آ رہے تھے۔"

"سوری بابا جان! بس بہت بزی ہو گیا تھا میں۔" وہ شرمندہ ہوا اور احسان شاہ کو سلام کیا۔ جو بیڈ کے پاس ہی کرسی پر بیٹھے بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آج پہلی بار انہوں نے اسے غور سے دیکھا تھا اور آج پہلی بار ہی انہیں احساس ہوا تھا کہ مومی کا بیٹا کتنی سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے۔

وہ ایک دم ہی اٹھے اور عمر احسان شاہ کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا دیا۔

"تو پاپا بھی ایبک فلک شاہ کے فین ہو گئے۔"

"ادھر میرے پاس بیٹھو ایبک۔" عبدالرحمٰن شاہ نے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بنائی اور عمر کی طرف دیکھا۔

"تم کیوں کھڑے ہو عمر؟ بیٹھ جاؤ۔" عمر احسان حیرت زدہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی احسان شاہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اس سے بے نیاز ایبک کی طرف متوجہ تھے۔

"بابا جان! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ایبک شکل و صورت میں سلجوق انکل سے ملتا ہے اور عادت و مزاج میں بالکل مومی ہے۔"

"ہاں! لیکن اس میں جو صبر اور تحمل ہے' وہ مومی میں نہیں تھا۔ مومی بہت جلد غصے میں آجاتا تھا۔"

"ہاں! لیکن کبھی کبھی۔" احسان شاہ مسکرائے۔

"لیکن یہ کبھی کبھی کا غصہ بہت نقصان کر گیا ہمارا۔"

"بابا جان!" احسان شاہ شرمندہ ہوئے "غلطی میری تھی۔ میں نے اسے غصہ دلایا۔ میں اس کے لیے کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا کہ اماں جان نے۔۔۔"

"جو ہوا' سو ہوا۔ اب تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی تو میں بہت خوش ہوں۔ ورنہ یہ دکھ لے کر قبر میں جاتا۔"

"بابا جان!" احسان شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"بس اب پرانی باتوں کا ذکر کبھی مت کرنا۔ خوامخواہ تکلیف ہو گی' تمہیں بھی اور مومی کو بھی۔"

"آپ کو کیا پتا بابا جان میرے اندر کتنے گہرے زخم ہو گئے ہیں۔ میری محبت مر گئی اور میں کس اذیت سے گزر رہا ہوں۔" انہوں نے خود پر قابو پا کر ایبک کی طرف دیکھا۔

"مومی مجھے بہت پیارا تھا۔ میرے دل کے سب سے زیادہ قریب۔ پھر ہمارے درمیان ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی اور میں اس سے ناراض ہو گیا۔ حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ میں مومی سے ناراض تھا۔ اس لیے جب تم مومی کے ساتھ "الریان" آئے تو میں نے تمہاری طرف کبھی دھیان سے دیکھا نہیں۔ حالانکہ عمر تمہارا بہت ذکر کرتا تھا۔ وہ ایسے ہی دیوانہ ہے تمہارا۔ جیسے میں مومی کا تھا۔"

انہوں نے مسکرا کر عمر کی طرف دیکھا تو عمر شرما گیا۔

"میرا یہ بیٹا بہت حساس اور نرم دل ہے۔" وہ عمر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایبک بھی مسکرا دیا۔

"ایبک بیٹا! عمو اور مومی کیسے ہیں؟ کل سے اس سے بات ہی نہیں ہوئی۔"

"بابا اور ماما بالکل ٹھیک ہیں اور بہت خوش بھی۔ جب سے احسان انکل ان سے مل کر آئے ہیں' خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔"

"تو پچھلے دنوں جو پاپا غائب ہوئے تھے دو دن کے لیے تو بہاول پور گئے تھے اور ہم سمجھ رہے تھے اسلام آباد گئے ہیں۔"

"احسان انکل! میں بہت ممنون ہوں آپ کا۔ اس خوشی کے لیے جو آپ نے بابا کو دی۔ میں بابا کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا تو اپنی بے بسی مجھے اذیت دیتی تھی۔ بہت شکریہ احسان انکل!"

"بعض اوقات ہماری چھوٹی چھوٹی غلطیاں' معمولی غلط فہمیاں ہمیں ایک دوسرے سے کتنا دور لے جاتی ہیں۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کاش! ہم اس موڑ پر رک کر ٹھہر کر' سوچ لیتے۔ سمجھ لیتے۔ ہم پتھر اور بے حس کیوں ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے پیاروں کی بات کیوں نہیں سنی۔"

احسان شاہ افسردہ ہو رہے تھے۔ عمر شاہ چپکے سے اٹھا۔ تاکہ لاؤنج میں بیٹھی رابیل کو اس انقلاب کی خبر دے۔ یعنی پاپا نہ صرف یہ کہ ایبک سے بات کر رہے تھے۔ بلکہ وہ بہاول پور کا چکر بھی لگا آئے تھے اور انہوں

نے ایبک کو گلے بھی لگایا تھا اور اس کی پیشانی بھی چومی تھی۔ واؤ۔

لاؤنج خالی تھا۔ رابیل شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ دوبارہ عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے میں جانے کے بجائے وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا اور ایبک کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی ایبک باہر نکلا۔

"او کے عمر! میں چلتا ہوں۔"

"ارے! اتنی جلدی؟" عمر کھڑا ہو گیا۔

"کچھ کام تھا یار! یہ ہمدان کیا سو رہا ہے ابھی تک؟"

"نہیں! وہ تو اسٹڈی میں تھے۔ آج کل اسلامی کتب کے مطالعے کا شوق چڑھا ہے انہیں۔ آپ رکیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں۔ ورنہ ناراض ہوں گے مجھ سے کہ آپ کے آنے کا بتایا نہیں۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"پتا نہیں اریب فاطمہ واپس آئی ہے یا ابھی تک گاؤں میں ہی ہے۔" ایبک نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے سوچا۔

تب ہی منیبہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اریب فاطمہ نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں، جو وہ مرینہ کو دینے جا رہی تھی۔ ایبک کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یقیناً دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" اس نے سوچا اور اریب فاطمہ کی طرف بڑھا۔

"کیسی ہیں اریب فاطمہ اور اماں کیسی ہیں"

"اماں ٹھیک ہیں۔"

ایبک نے بغور اسے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور پریشان لگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے اریب فاطمہ! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟"

"آپ پارک میں چلیں۔ میں وہیں آ رہی ہوں۔ ضروری بات کرنا ہے۔ یہاں کیسے کروں۔ مائرہ آنٹی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گی۔" اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھتی ہیں تو۔"

ایبک پریشان سا ہو گیا تھا۔ یقیناً" کوئی ایسی بات تھی۔ ورنہ اریب فاطمہ کو اس طرح کہیں باہر جا کر بات کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

"کہیں اس کے والدین نے اس کی شادی تو طے نہیں کر دی۔"

وہ مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ ایبک رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے ہمدان کا انتظار کرنا تھا۔ ہمدان آیا تو وہ اس سے مل کر فوراً" ہی "ابریان" سے نکل آیا۔ ہمدان اسے روکتا ہی رہ گیا۔

مرینہ کے کمرے سے باہر نکل کر منیبہ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اریب فاطمہ نے اسے باہر نکلتے دیکھا اور کمرے میں جا کر الماری سے چادر نکالی۔ منیبہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"بس یہ ذرا مدنی بک ڈپو تک جا رہی ہوں۔ کچھ پیپرز وغیرہ خریدنے ہیں۔"

"یاسین کو کہہ دیتیں۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے خود دیکھ کر لینے ہیں۔ کچھ بال پوائنٹ بھی لینے ہیں۔" وہ منیبہ کی بات کا جواب دے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

رابیل اپنے بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جب مائرہ نے سیڑھیوں کے پاس سے اسے آواز دی اور پھر جواب نہ پا کر خود ہی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں آئیں۔ رابیل نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں۔

"کیا ہوا رابی بیٹا! تم رو رہی تھیں؟" وہ پریشان ہو گئیں۔

"کچھ نہیں ماما! ایسے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔"

پتا نہیں، یہ سر درد کیوں ہو جاتا ہے۔ تمہیں کہا بھی تھا کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک کروا لیتے ہیں۔ لیکن تم مانتی ہی نہیں ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے ماما! جو ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔

بس نیند پوری نہیں ہوئی میری۔"

"چلو! ٹھیک ہے۔ پھر تم آرام کرو۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی تھی۔ یہ بیڈ روم سلیپر لیے تھے، واپس کرنے ہیں۔ تم بھی کہہ رہی تھیں چپل لینے کو تو میں نے کہا، ساتھ لے چلوں۔"

"نہیں ماما! مجھے یہاں اس مارکیٹ سے چپل نہیں لینے تھے۔"

"اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی تو افطار کے بعد ذرا روبی کی طرف چلیں گے۔"

"مل تو لیا تھا اس دن۔ اب کیا کروں گی جا کر؟"

"میں چاہ رہی تھی تم اس کے بیٹے سے بھی مل لو۔ دراصل روبی کی باتوں سے لگا تھا مجھے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ ہمدان تمہیں پسند نہیں۔ طاہر کے لیے تم نے انکار کر دیا تو اب۔۔۔"

"ماما پلیز۔۔۔" وہ بے زار ہوئی۔

"میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں اب۔"

"مجھے تمہارا یہ انداز بالکل بھی پسند نہیں ہے رابی! میں ان چند ماہ میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بہرحال فیصلہ کرنا ہو گا۔" رابیل نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"ایک تو تمہارے پاپا کا موڈ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ جب سے اسلام آباد سے واپس آئے ہیں۔ بابا جان کے کمرے میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔" وہ بڑبڑائیں اور رابیل کی طرف دیکھا۔

"میں دو، تین روز میں روبی کی فیملی کو افطاری پر بلوا رہی ہوں۔ تم اچھی طرح دیکھ لو۔ پرکھ لو، طاہر تو دیکھا بھالا ہے۔ بہرحال ہمیں تمہارا فیصلہ قبول ہو گا جسے بھی پسند کر لو۔"

"کیا واقعی مما؟"

"ہاں، زندگی تم نے گزارنی ہے، میری جان! تو فیصلہ بھی تمہارا ہی ہو گا۔"

"ٹھیک ہے مما!" رابیل لیٹ گئی۔

"میں آج تمہارے بابا جان اور پاپا سے بات کر کے روبی کی فیملی کو انوائیٹ کرتی ہوں۔"

وہ ایک بار پھر رابیل کو سونے کی تاکید کر کے کمرے سے نکل آئیں۔

☼ ☼ ☼

ایبک نے پارک کے پچھلے دروازے کی طرف گاڑی پارک کی تھی اور اسی دروازے سے پارک میں داخل ہوا تھا۔ دوپہر کے ایک بجے پارک سنسان پڑا تھا۔ شاید رمضان کی وجہ سے۔ ورنہ اتنی ویرانی تو کبھی بھی نہیں ہوتی تھی۔ دوپہر میں بھی چند ایک بچے نظر آ جاتے تھے۔ وہ اسی جگہ پر بینچ کے پاس کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جب اریب فاطمہ نے دوسرے گیٹ سے پارک میں قدم رکھا اور ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اسی بینچ کی طرف آ رہی تھی کہ اس کی نظر ایبک پر پڑی جو بے چین ہو کر ایک قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سب ٹھیک ہے نا اریب فاطمہ! میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ اچانک آپ کی والدہ کو کیا ہو گیا تھا۔"

"کچھ نہیں۔۔۔" اس نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے ایبک کی طرف دیکھا۔ "اسفند بھائی نے جھوٹ بولا تھا۔ اماں کو بتائے بغیر وہ مجھے لینے آئے تھے۔"

وہ اپنی انگلی پر چادر کا پلو لپیٹتی بے حد مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہوا اریب فاطمہ پلیز۔ کچھ بولیں ورنہ میرا دل رک جائے گا۔" اور تب اریب فاطمہ نے ساری بات بتا دی۔

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا اریب فاطمہ! میں نے صرف آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچا۔ آپ سے پہلے میں نے کبھی کسی کے لیے اس طرح نہیں سوچا، لیکن میں آج ہی ماما سے بات کرتا ہوں وہ مروہ پھپھو سے بات کرتی ہیں۔ اب ڈائریکٹ جانا مناسب نہیں لگتا۔ تمہارے ابا اور بھائی انکار ہی نہ کر دیں۔ مروہ پھپھو سے ہی بات کرنا مناسب ہو گا۔ کیا خیال ہے۔"

اریب فاطمہ نے سر ہلا دیا، لیکن اس کی بھیگی پلکوں نے ایبک کو بے چین کیا۔

"اریب فاطمہ! میں آپ کو نہیں کھو سکتا۔ آپ میرا یقین رکھیے گا ہمیشہ۔ میں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اور کبھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو مجھے فون کر دیجیے گا کسی پی سی او سے۔ میں۔۔۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اریب فاطمہ نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔ "مجھے لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا جیسا ہم نے چاہا۔ کاش میرے دل میں کبھی آپ کا خیال نہ آتا اور ابا اماں جہاں چاہتے، جس کے ساتھ چاہتے مجھے رخصت کر دیتے، لیکن اب نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں کیسے آپ کا خیال دل سے نکالوں گی۔ میں جھوٹی زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ تو اس دوسرے شخص کو دھوکا دینے والی بات ہوئی نا کہ آپ کے دل میں کوئی اور ہو اور آپ کسی اور کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں۔"

آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

اس کے آنسوؤں کو اپنے انگلیوں سے پونچھنے کی خواہش دل میں چھپائے ایبک اس کے قریب ہی بینچ پر بیٹھ گیا۔

"پلیز اریب فاطمہ! روئیے مت۔ مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگا ہے۔ آپ کو چاہ کر، آپ کی تمنا کر کے میں نے آپ کو تکلیف دی۔ کاش میں بھی ہوی کی طرح سب کچھ دل میں رکھتا اور ایک دن اچانک آپ کے گھر اپنے والدین کو بھیج دیتا۔"

اریب فاطمہ جو اس کے اس طرح قریب بیٹھنے پر گھبرا گئی تھی، اس نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"نہیں۔ آپ نے مجھے تکلیف نہیں دی۔ محبت تکلیف نہیں ہوتی، میں تو اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔ لیکن۔۔۔"

اور وہ جو بہت کچھ کہنے کی خواہش میں بیٹھا تھا۔ سب دل میں چھپا کر کھڑا ہو گیا اور اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے اریب فاطمہ! آپ اب جائیں۔ یہاں زیادہ دیر تک آپ کا رہنا مناسب نہیں ہے اور آنسو پونچھ لیں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ وہ یقیناً "بہتر کرے گا۔"

اریب فاطمہ نے چادر کے پلّو سے اپنا چہرہ پونچھا اور ایبک کی طرف دیکھا اور پھر "فوراً" ہی سر جھکا لیا۔ ایبک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"اللہ حافظ اریب فاطمہ! آپ جانتی ہیں نا، آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔"

اریب فاطمہ نے سر ہلایا اور سر جھکائے گیٹ کی طرف چل دی۔ چند لمحے ایبک وہاں ہی کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا پھر پلٹ کر دوسرے گیٹ کی طرف چل دیا۔

☼ ☼ ☼
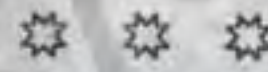
مائرہ مارکیٹ سے جوتا تبدیل کر کے "الریان" کی طرف جا رہی تھیں کہ انہوں نے اریب فاطمہ کو پارک سے نکلتے دیکھا۔ "یہ اس پہر یہاں پارک میں کیا کرنے آئی ہے۔ کیا کسی لڑکے سے ملنے؟ کیا خیریاں کی طرح اس نے بھی دوستیاں بنا رکھی ہوں۔"

مائرہ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں اور اریب فاطمہ کو سر جھکائے پارک سے نکل کر سڑک کراس کرتے اور پھر بدنی بک ڈپو میں داخل ہوتے دیکھتی رہیں۔ جوں ہی اریب دکان میں داخل ہوئی۔ وہ تیزی سے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھیں اور پارک میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

پارک ویران پڑا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ غبارے اور قلفی بیچنے والے لڑکے بھی جو اکثر دوپہروں میں یہاں ہی ہوتے تھے۔ نظر نہیں آ رہے تھے حتیٰ کہ وہ نشئی بھی نہیں جو دن رات درخت کے نیچے پڑا رہتا تھا۔

"پھر اریب فاطمہ بھری دوپہر میں یہاں کیا کر رہی تھی۔"

وہ سوچتی ہوئی پارک سے باہر آئیں۔ "یقیناً کسی سے ملنے ہی آئی ہوگی۔" مائرہ کو پورا یقین تھا۔

"ہوی کو ضرور پتا ہوگا اگر کسی کے ساتھ اس کا چکر ہے تو۔۔۔ ہر وقت اسی کے ساتھ رہتی ہے، ضرور اسے بتایا ہوگا۔"

وہ یوں ہی اریب فاطمہ کے متعلق سوچتی الریان میں داخل ہوئیں۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ وہ رکے بغیر اپنے کمرے میں آئیں۔

احسان شاہ بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے مائرہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو شانی؟" وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

لیکن احسان شاہ نے جواب دیے بغیر دوسری دراز کھولی اور اس میں پڑی فائل نکال کر کاغذات چیک کرنے لگے۔

"آخر ایسا کیا ہو گیا ہے شانی کہ تم نے اپنا موڈ خراب کر رکھا ہے۔ تین دن سے تم کمرے میں نہیں آئے۔ بابا جان کے کمرے میں ڈیرا جما رکھا ہے اور اب مجھ سے بات کرنا تو در کنار میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہو۔ حالانکہ تمہارے اسلام آباد جانے سے پہلے میں نے تم سے سوری کر لیا تھا اور تم نے میری بات سمجھ بھی لی تھی کہ میں ماں ہوں اس کی۔ برے بھلے کی تمیز بتانا میرا فرض ہے، لیکن پھر آخر ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسے ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے مجھ سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔"

"گناہ تو مجھ سے سرزد ہوا ہے مائرہ حسن!" وہ ایک جھٹکے سے مڑے تھے۔ "غلطی میں نے کی تھی جو تمہاری باتوں میں آ گیا اور تمہارا اعتبار کیا۔ وہ یہاں رہتا تھا مائرہ حسن! یہاں۔"

انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"لیکن تمہارا یقین کر کے اسے نوچ کر پھینک دیا میں نے اس دل سے۔"

"صاف بات کرو شانی!" مائرہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"انجان مت بنو مائرہ! تم جانتی ہو۔ تم نے کیا کھیل کھیلا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں تمہاری چال میں آ گیا اور نہ جانے کب تک دھوکے میں رہتا جو تم روبی سے دل کی بات نہ کرتیں۔"

مائرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ یہ کیا ہوا تھا۔ کیسے۔ کب احسان شاہ نے ان کی اور روبی کی بات سن لی تھی۔ کتنا غلط ہوا تھا۔ سب رائیگاں چلا گیا۔

"ساری عمر ایک دھوکے میں گزار دی میں نے۔ یہ اذیت ایک خنجر کی طرح گڑی ہے یہاں۔۔۔ یہاں۔"

انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

"تم جو یہاں اس وقت میرے کمرے میں موجود ہو تو صرف اس لیے کہ میرے بچوں کی ماں ہو اور میں انہیں بے بھرم نہیں کرنا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے سر جھکیں اور انہیں علم ہو کہ ان کی ماں کس قدر فریبی عورت ہے۔"

"شانی۔۔۔"

"مت کہو کچھ مائرہ حسین! تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔ میں تم سے بات کرنا تو در کنار تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا۔ اپنے بچوں کی خاطر اور الریان کی عزت کی خاطر تمہارے جیسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن پر لعنت کی گئی ہے اور جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹی تہمت لگانے والی عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے۔ تم نے جھوٹ بولا۔ بہتان لگایا، مجھے دھوکا دیا مائرہ حسن۔ اور۔۔۔"

"شانی۔۔۔" مائرہ کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ "میری بات سنو۔۔۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ میں تو وہ یوں ہی مذاق۔۔۔"

احسان شاہ نے ایک تنفر بھری نظر ان پر ڈالی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے اور مائرہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دونوں ہاتھ گود میں دھرے شکست خوردہ سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ بازی الٹ گئی تھی۔ وہ تو ابھی فلک شاہ کو اور سزا دینا چاہتی تھیں اور

ذلیل کرنا چاہتی تھیں۔ ایبک کے ذریعے اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے کس طرح کیا کریں کہ ایبک اور فلک شاہ کو الریان کے ہر فرد کی نگاہوں سے گرادیں۔ لیکن وہ خود احسان شاہ کی نظروں میں گر گئی تھیں۔ وہ اس الٹی بازی کو کیسے اپنے حق میں کریں۔ ہاتھ گود میں رکھے وہ سوچ میں گم ہو گئیں۔ کوئی تدبیر' کوئی طریقہ ایسا کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ احسان شاہ بھی۔ کتنی شدید محبت کی تھی احسان شاہ نے اور چند لمحے پہلے ان محبت برساتی آنکھوں سے کتنی نفرت جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔" انہوں نے ایک جھرجھری سی لی "مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ ایسا کہ احسان شاہ کا دل پھر میری طرف پلٹ آئے۔" تب ہی دروازہ کھلا اور رابیل اندر آئی۔ وہ فریش ہو کر آئی تھی۔ مائدہ نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پریشان ہو کر سوچا۔ "کیا اس نے جان لیا ہے۔ کیا احسان نے اسے بتادیا ہے کہ۔۔۔ لیکن انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ بچوں کو پتا چلے کہ۔۔۔"

"ماما! کیا ہوا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آپ جوتے تبدیل کرنے نہیں گئیں؟" رابیل پوچھ رہی تھی۔

"ہاں' نہیں' میں ٹھیک ہوں۔" وہ چونکیں۔ "جوتے تبدیل کرلیے ہیں۔ یہ اسی اپنی مارکیٹ میں سے ہی لیے تھے۔ تمہارا سر درد ؟"

"ٹھیک ہے مما!" رابیل ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"کہیں جارہی ہو؟"

"نہیں۔ میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا۔ آپ خواہ مخواہ تردد نہ کریں۔ اگر روبی آنٹی کی فیملی کو صرف اس لیے بلا رہی ہیں تو مجھے ان کے بیٹے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں محض دوست سمجھ کر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"رابی! ادھر دیکھو میری طرف۔" مائدہ نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی پریشانی بھول گئیں۔

"اس روز تم کہہ رہی تھیں کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔ میں نے سمجھا شاید غصے میں کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا واقعی تم کسی اور کو۔۔۔"

رابیل کی نظریں جھک گئیں۔

"کون ہے وہ؟" مائدہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی بھی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے مما۔"

"فرق پڑتا ہے رابی! اگر وہ اس قابل ہے کہ احسان شاہ کا داماد بن سکے تو پھر بتاؤ۔ ہمیں تمہاری خوشی ہر حال میں عزیز ہوگی۔"

"وہ اس قابل ہو بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اسے پسند نہ کریں گی۔" وہ افسردہ ہوئی۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ رابی!" مائدہ نے الجھی الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔ دل میں کسی وہم نے پنجے گاڑے۔

"ایبک۔۔۔ مما! میں ایبک کو پسند کرتی ہوں۔" رابیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ایبک۔۔۔" مائدہ کی آواز بلند ہوئی۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے رابیل۔"

"مما! آپ نے میری پسند پوچھی تھی۔ میں نے آپ کو بتادی۔ اب خواہ مخواہ چلائیں مت۔"

"یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ تمہاری شادی ایبک سے ہو سکتی ہے۔"

"کیوں ایبک میں کیا برائی ہے؟" رابیل نے سوالیہ نظروں سے مائدہ کی طرف دیکھا۔ "صرف اس لیے کہ وہ عمارہ پھپھو کا بیٹا ہے اور آپ کو ان سے روایتی نند' بھابھی والا جلاپا ہے۔"

"ہاں ہے جلاپا۔۔۔ پھر؟" مائدہ ضبط کھوتی جارہی تھیں۔ یہ دوسرا بڑا دھچکا تھا جو ان چند گھنٹوں میں انہیں لگا تھا۔

"مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ وہ تمہیں اپنے جال میں پھنسا لے گا اور تم اس کے جال میں پھنس جاؤ گی۔"

"مما پلیز۔۔۔ غلط الزام مت لگائیں۔" رابیل نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ایبک مجھے پسند نہیں کرتا۔ میں اسے پسند کرتی ہوں اور اسے تو اس کی خبر تک نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ کبھی مجھے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ مجھے اپنے جال میں پھنسا رہا ہے۔ آپ اپنے مفروضے اپنے پاس رکھیں۔ وہ آپ کی بیٹی کو اس طرح پسند نہیں کرتا جیسے میں کرتی ہوں' وہ صرف میری عزت کرتا ہے۔ کیونکہ میں اس کے ماموں کی بیٹی ہوں۔"

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آواز بھر آگئی۔ مائدہ کو لگا جیسے رابیل کی جگہ وہ ہوں اور فلک شاہ کی یک طرفہ محبت میں مبتلا ہوں اور فلک شاہ ان کی طرف دیکھتا تک نہ ہو۔ یکایک ان کے دل میں رابیل کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔

"وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔ تم جو الریان کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔ ہے کوئی الریان میں تم جیسی۔ ایسا نہیں ہو سکتا رابی! وہ تمہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ جان بوجھ کر اپنی اہمیت جتانے کے لیے ایسا کرتا ہوگا۔"

"وہ ایسا نہیں ہے مما! اسے اپنی اہمیت جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اسے ایک پرانی بات یاد آئی تھی۔ پتا نہیں کس نے کہا تھا۔ شاید موی نے یا پھر عمر نے کہ اسے اپنی طرف توجہ مبذول کروانے کے لیے کسی ڈرامے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات۔

"جو بھی ہو میں کبھی بھی عمارہ اور فلک شاہ کے بیٹے سے تمہیں شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" مائدہ کو پھر خیال آیا تھا کہ ایبک فلک شاہ اس فلک شاہ کا بیٹا ہے۔ جس نے ان کی محبت کو ٹھکرایا تھا۔

ایک افسردہ سی مسکراہٹ رابیل کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو اور پروپوزل دیا ہو اس نے میرا۔" تلخی سے کہتی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اور مائدہ نے باہر جاتی رابیل کو دیکھ کر دکھ سے سوچا۔

تو کیا میری طرح میری بیٹی کے مقدر میں بھی نارسائی ہے۔ "نہیں میری بیٹی میری طرح نارسا نہیں رہے گی۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ ایسا کہ رابیل کے دل سے ایبک فلک شاہ کا خیال نکل جائے۔"

"کیا میرے دل سے فلک شاہ کا خیال نکل گیا ہے؟"

انہوں نے خود سے پوچھا تو جواب نفی میں تھا۔ آج بھی یہ احساس ان کے دل میں کچوکے لگاتا تھا کہ فلک شاہ نے انہیں اور ان کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا تو کیا رابی بھی۔۔۔ نہیں انہوں نے خود ہی تردید کی۔ محض وقتی پسندیدگی ہے۔ ورنہ چند دن پہلے تک تو وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ سو جلد ہی ایبک کا خیال اس کے دل سے نکل جائے گا۔ انہوں نے خود کو یقین دلایا اور مطمئن ہو گئیں۔ لیکن جلد ہی ان کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ انہیں یاد آگیا کہ احسان شاہ ابھی ابھی کیا کہہ کر گئے تھے۔

کس بری طرح انہوں نے انہیں جھٹک دیا تھا۔ ہر رشتے کو توڑ دیا تھا۔ وہ نہ ان کے لیے بیوی رہی تھیں' نہ محبت۔

وہ صرف اب ان کے بچوں کی ماں تھیں۔ کتنا صاف صاف کہہ دیا تھا انہوں نے کہ وہ اب ساری زندگی ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ مجبور ہیں۔ الریان کی عزت اور بچوں کی وجہ سے۔

انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

بہت برا ہوا تھا۔ کاش روبی ان کے گھر نہ آتی اور گھر آئی ہی تھی تو وہ احتیاط کرتیں۔

اب کیا کریں ایسا کہ احسان شاہ کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے۔ کیا کہیں' کچھ بھی کہنا بے کار ہوگا۔ انہوں نے جو کچھ اپنے کانوں سے سنا۔ وہ انہیں جھٹلا نہیں سکتیں۔ پھر۔۔۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لیں۔ وہ نرم دل ہیں۔ ان سے محبت نہیں عشق کرتے ہیں۔ پھر وہ ان کے بچوں کی ماں ہیں۔ اس حوالے سے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور ہے۔

وہ اٹھیں اور پھر بیٹھ گئیں۔

"نہیں۔۔۔ ابھی شاید وہ بابا جان کے کمرے میں ہوں۔ پھر کبھی جب وہ اکیلے ہوں۔ اپنے بیڈ روم میں ہوں تو پاؤں پکڑنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔" انہوں نے سوچا۔ "لیکن جلدی نہیں ابھی وہ شاک میں ہیں۔ غصے میں ہیں۔ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لیے رحیم یار خان چلی جاؤں۔ دوریاں یوں بھی محبت کو بڑھاتی اور جگاتی ہیں۔ اگر رابیل کو بھی ساتھ لے جاؤں تو یوں بھی وہ فارغ ہے اب۔۔۔ وہاں ایبک کا خیال ہو سکتا ہے دل سے نکل جائے۔ طاہر سے ملے گی بات چیت کرے گی تو شاید دل میں طاہر کا خیال پیدا ہو جائے۔"

وہ فیصلہ کر کے اٹھیں۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی۔ لیکن بظاہر انہوں نے خود کو مطمئن کر لیا تھا اور وہ گہرائی تک نہیں جا پائی تھیں کہ احسان شاہ نے انہیں اپنی زندگی میں شامل رکھتے ہوئے بھی اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔

اریب فاطمہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ سائرہ کو باہر آتے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی اور اس کی گود میں رکھا شاپر نیچے گر گیا۔ مائرہ نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور پوچھنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ دوپہر کے وقت پارک میں کس سے ملنے گئی تھی کہ منیبہ دروازہ کھول کر باہر آئی اور اریب فاطمہ سے پوچھا۔

"تم نے دیر لگا دی ریبا؟"

"ہاں۔۔۔ وہ مجھے اس بک شاپ سے نہیں ملی تھیں مطلوبہ چیزیں تو مارکیٹ چلی گئی تھی۔"

مائرہ کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یعنی جھوٹ بولا جا رہا ہے۔"

انہیں یقین ہو گیا کہ اریب فاطمہ ضرور کسی سے ملنے گئی تھی اور وہ کوئی کون ہو سکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے انہوں نے سوچا۔ لیکن اس وقت اندر سے وہ خود الجھی ہوئی تھیں اور اریب فاطمہ سے بات کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

"تم کو ظہر کی نماز پڑھنی ہو گی ابھی؟" منیبہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔" اریب فاطمہ نے جھک کر شاپر اٹھایا۔

"تو جلدی سے نماز پڑھ کر ذرا کچن میں آ جاؤ۔ آج مصطفیٰ انکل نے اپنے دوستوں کو افطاری پر بلایا ہے۔"

اریب فاطمہ سر ہلا کر کمرے میں چلی گئی تو رابیل کچن سے باہر آئی اور مائرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ رابیل کو کوکنگ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اور اس وقت وہ منیبہ سے کہہ رہی تھی۔

"کیا مینیو ہے آج کا۔ میں بھی ہیلپ کرا دوں گی۔ حفصہ کی طبیعت تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"وہی جو ہمیشہ افطار پارٹی پر ہوتا ہے۔" منیبہ مسکرائی اور کچن کی طرف بڑھی۔ "آ جاؤ تم بھی۔ ابھی سے تیاری کریں گے تو کہیں وقت پر سب کچھ تیار ہو گا۔"

"رابی!" مائرہ نے بے اختیار آواز دی۔ تو رابیل واپس کچن میں جاتے جاتے مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"وہ ابھی تمہاری نانی اماں سے بات ہو رہی تھی میری۔ اداس ہو رہی تھیں۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگتی تھی۔ سوچ رہی ہوں کچھ دنوں کے لیے رحیم یار خان چلی جاؤں۔"

"ٹھیک ہے مما! پاپا سے بات کی آپ نے؟"

"نہیں بس ابھی تو فون کیا تھا میں نے تمہاری مرضی ہو تو تم بھی چلی چلو۔ کافی عرصہ سے نہیں گئی ہو۔ بہت یاد کر رہی تھیں تمہیں۔" رابیل نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔

"ٹھیک ہے مما! چلتے میں پھر۔"

اور مائرہ نے اطمینان بھری سانس لی۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ رابیل نے انکار نہیں کیا تھا۔ ورنہ اگر وہ انکار کر دیتی تو وہ اسے زبردستی ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں۔ بہت مطمئن ہو کر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مسرتوں کی نوید سب کو
رہے مبارک یہ عید سب کو
انہیں بھی جو تنہا جی رہے ہیں
انہیں بھی جو مل کے چل رہے ہیں
تمام مردوں کو، عورتوں کو
سبھی جوانوں کو، بالکوں کو
یہ عید بھی سج گئی ہے ان بجتی چوڑیوں سے
جو لڑکیاں ہاتھ بھر کے پہنیں
چھنکتی ان پائلوں کے دم سے
جوان کے پاؤں میں بج اٹھی ہیں
دھنک کے رنگوں کے آنچلوں سے
جنہیں سنبھالے، دمکتے چہرے چمک رہے ہیں
نجانے کتنے ہی خواب ہیں جو
سبھی نگاہوں میں پل رہے ہیں
تمام ہونٹوں پہ اک دعا ہے
خدا کرے یہ خوشی کی گھڑیاں
ہمیشہ سب کے قریب آئیں
سب اپنے غم آج بھول جائیں
بھلا کے سب پچھلی تلخیوں کو
کن کے جھولوں میں جھول جائیں
بہارِ الفت کے گیت گائیں

عنبرین حسیب عنبر

یہ میرا گھر جسے چھوڑ کر یوں جا رہا ہوں
کیا تھا کیوں اسے تعمیر، اب پچھتا رہا ہوں

جسے آنا نہیں ہے لوٹ کر آئے گا اک دن
نہ جانے کیوں میں اپنے آپ کو سمجھا رہا ہوں

نہیں گزری یہ میری عمر بے کاری میں یونہی
جو سیکھا زندگی سے ہے، وہی بتلا رہا ہوں

میں اک لمبے سفر کا فاصلہ طے کرتے کرتے
بہت ہی تھک چکا ہوں اس لیے سستا رہا ہوں

وہ میرا ہے یقیں آتا نہیں کیوں غوث مجھ کو
میں اپنے سامنے جو مقبرہ بنوا رہا ہوں

غوث متھراوی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن سرجیسؓ فرماتے ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں حضرت ابوذرؓ سے محبت کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کیا تم نے ان کو یہ بات بتادی ہے؟"
میں نے کہا۔ "نہیں۔"
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"انہیں بتادو۔"
پھر جب میری حضرت ابوذرؓ سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔
"مجھے آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے۔" انہوں نے جواب میں مجھے دعا دی۔

گستاخ رسولؐ

خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک سے گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔
"اس امت کے باقی رہنے کا کیا جواز ہے کہ جس کے نبیؐ کی توہین کردی جائے؟"
(کتاب الشفا - عیاض المالکی)

حضرت علیؓ نے فرمایا،

جو بندہ کسی سے جتنی محبت کرتا ہے، اتنی نفرت بھی کرسکتا ہے۔ کیونکہ ایک خوبصورت شیشہ جب ٹوٹتا ہے تو ایک خطرناک ہتھیار بن جاتا ہے۔

، اگر کسی انسان کے دل میں اپنا مقام دیکھنا چاہو تو اُس کو غصے میں دیکھو، اپنے لیے اس کے الفاظ سن لو، اپنا مقام جان لوگے۔
سار یہ چوہدری۔ ڈوگہ گجرات

نیکی کر...

جنگل میں ایک خوبصورت لیکن بزدل چیتے کا ایک شیر دوست بن گیا۔ چیتا ایک شیرنی کو بہت پسند کرتا تھا۔ اور اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ ایک دن اس نے اپنی خواہش کا اظہار شیرنی سے کیا تو اس نے کہا کہ میں اس شرط پر تم سے شادی کروں گی اگر تم میرے لیے ہرن کا شکار کرکے لاؤ۔ چیتا بے چارہ محبت سے مجبور تھا لہٰذا مان گیا۔
اس نے اپنے دوست شیر کو یہ ماجرا سنایا تو اس نے دوستی کی وجہ سے ایک ہرن شکار کرکے چیتے کے حوالے کردیا۔ شیرنی نے بظاہر چیتے کی بہادری دیکھ کر اس سے شادی کرلی۔
پورے جنگل میں شادی کی خوشیاں منائی جارہی تھیں مگر شکار کرنے والا شیر بہت اُداس بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھی نے شیر سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔
"نیکی بھی دیکھ بھال کر کرنا چاہیے۔ بزدل چیتے کی شادی کروانے میں، میں نے اس کی مدد کی اور وہ کمبخت میرا ہی بہنوئی بن گیا ہے۔"
اقراء۔ کراچی

اشارہ کافی ہے،

سیٹھ صاحب ارب پتی تھے۔ انہوں نے غربت میں جنم لیا تھا اور ترقی کرتے کرتے اس مقام تک پہنچے تھے۔
ایک رات ایک اخباری نمائندہ ان سے انٹرویو لینے آیا۔
"سیٹھ صاحب! سب سے پہلے یہ بتلائیے کہ آپ نے اپنی ترقی کیسے کی اور اتنے دولت مند کیسے بنے؟" نمائندے نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے دریافت کیا۔
"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" سیٹھ صاحب طویل سانس لے کر بولے۔ "جب تک میں آپ کو یہ کہانی سناتا ہوں تب تک کے لیے کمرے کی لائٹ بجھا کر زیرو کا بلب جلا دیتا ہوں۔ بات چیت کا کیا ہے، وہ تو زیرو کے بلب کی روشنی میں بھی کی جاسکتی ہے۔" یہ کہہ کر سیٹھ صاحب اُٹھے اور انہوں نے کمرے کی لائٹ بجھا کر زیرو کا بلب روشن کردیا۔
تب اخباری نمائندہ بھی اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے سیٹھ صاحب! میں سمجھ گیا کہ آپ دولت مند کس طرح ہوئے ہوں گے۔ اب آپ کو اپنی آپ بیتی سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ ان سے رخصت ہوگیا۔

ڈاکٹر مفکرین کی نظر میں،

- ڈاکٹر دنیا میں ایسا شخص ہے جسے لوگوں کی اچھی صحت سے تکلیف پہنچتی ہے۔ (مارشل)
- نوجوان ڈاکٹر اور بوڑھے حجام سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ (بینجمن فرینکلن)
- ڈاکٹروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنے دماغوں سے اور دوسرے وہ جو اپنی زبانوں سے پریکٹس کرتے ہیں۔ (ولیم اوسلر)
- ڈاکٹر اس کو کہتے ہیں جو نسخہ لکھتا رہتا ہے تاوقتیکہ مریض مر نہ جائے یا قدرتی طور پر اچھا ہوجائے۔ (جان ہسٹلر)
- اس کو پریکٹس کرتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا۔ اس نے تین مریضوں کا علاج کیا۔ میں ان کے جنازوں میں شرکت کرچکا ہوں۔ (مارک ٹوین)

نسرین اختر۔ میٹروول

خدا گواہ،

یہ طالبانِ وزارت، یہ لیڈرانِ کرام
تلاش جاہ میں جو کچھ کہو وہ کرلیں
نئے جنم میں یقین ہو اگر وزارت کا
خدا گواہ کہ یہ آج خودکشی کرلیں
(رئیس امروہوی)

وضاحت،

پروفیسر صاحب نے کلاس روم میں اپنے لیکچر کے دوران ایک لڑکے کو اونگھتے دیکھ کر غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔
"تم میری کلاس میں سو نہیں سکتے۔"
لڑکا آنکھیں کھول کر سر اٹھاتے ہوئے قدرے بےزاری سے بولا۔
"سو تو سکتا ہوں سر... ! بشرطیکہ آپ اتنے زور سے نہ بولیں۔"
شبنم شمشاد۔ یزمان

حرف،

عزتِ نفس اور انا میں وہی فرق ہے جو فخر اور غرور میں ہوتا ہے۔ عزتِ نفس اور فخر کہتا ہے کہ "میں بھی ہوں۔"
لیکن غرور اور انا کہتی ہے۔
"صرف میں ہی ہوں۔"
اور محبت اس باریک فرق کو ماپنے کا پیمانہ ہے۔

خاموشی،

اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے۔ زیادہ بولنے والا انسان مجبور ہوجاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کو ملا کر بولے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔

(واصف علی واصف)

ثمرہ۔ کراچی

خوشبو جیسی باتیں،

٭ صرف بد دعائیں ہی خوشیوں کے رستے بند نہیں کرتیں، بعض اوقات صبر بھی سکھ کی راہ کی دھول بن جایا کرتا ہے۔

٭ ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

٭ رشتے اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے، اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جتنے آبگینے۔ ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو ٹوٹ گئے۔ بدگمانی نے سر اٹھایا تو چکنا چور ہو گئے۔ پھر ان پر کیسا فخر، کیسا مان؟

٭ زخم ہمیشہ اس سے ٹھیک ہوتا ہے جو اسے عنایت کرتا ہے اور کبھی تو یہ اس کے بس کی بھی بات نہیں رہتی۔

٭ اپنے آپ سے زبردستی مت کریں ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔

٭ کچھ تعلق انا سے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے انا ضروری ہوتی ہے۔

٭ خاموش انسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں اور خاموشی خود ایک راز ہے۔

٭ امن کی فاختہ وہیں اترتی ہے جہاں پیار، صلح اور صبر کی دھوپ پھیلتی ہو۔

آخری الفاظ،

ذیل میں کچھ لوگوں کی زندگی کے آخری الفاظ درج کیے جا رہے ہیں۔ جو روایتی قسم کے الفاظ سے مختلف ہیں۔

٭ ذرا ماچس کی تیلی جلا کر دینا۔ میں اپنی گاڑی کی ٹنکی دیکھنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔

٭ بیگم! تم ہمیشہ اتنا بدمزا کھانا کیوں بناتی ہو؟

٭ ذرا یہ پستول دکھانا، کیا یہ لوڈڈ ہے؟

٭ میرا خیال ہے کہ میں ریلوے لائن کراس کر رہی ہوں۔ ٹرین تو بہت معمولی رفتار سے آ رہی ہے۔

٭ بیگم کیا کہا تم نے تمہاری اماں ابھی چھ مہینے اور ہمارے ہاں رہیں گی؟

٭ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔؟ یہ جو بوتل میں نے ابھی خالی کی ہے۔۔۔ یہ دوا کی بوتل نہیں تھی۔۔۔؟

٭ ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ کل تم نے جس شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل میں دیکھا تھا، وہ میں ہی تھا۔ تو پھر کیا ہوا۔۔۔؟

٭ آں، ہاں، سچ۔۔۔ تم ٹھیک سمجھی ہو بیگم۔۔۔ میں سچ۔۔۔ اپنی تنخواہ سچ۔۔۔ جوئے میں۔۔۔ سچ ہار آیا ہوں۔

٭ ذرا دیکھو۔۔۔ میں کس طرح قلابازی کھا کر اس پل سے سمندر میں چھلانگ لگاتا ہوں اور تیرتا ہوا ساحل سے آتا ہوں۔

ندا۔ فیصل آباد

پڑتال،

کسی معروضی امتحان میں ایک طالب علم ہر سوال پہ سکہ اچھالتا اور پرچے پر اس کے مطابق صحیح یا غلط کا نشان لگا دیتا۔ ممتحن کافی دیر سے اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ طالب علم جب پرچہ مکمل کر چکا تو اس نے یہی سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔

ممتحن سے رہا نہ گیا، "اب تم کیا کر رہے ہو؟"

"اپنے جواب چیک کر رہا ہوں۔" طالب علم نے جواب دیا۔

اقرا۔ کراچی

خالدہ جیلانی

نوال افضل گھمن ______ گجرات
ہم کسی کو گلے نہ لگا سکے
عید آئی، مگر بعید رہی

افشاں خان ______ شاہ پور چاکر
عید وہ مل رہے ہیں غیروں سے
ہم سے کہتے ہیں، مدّعا کہیے

آمنہ اُجالا ______ ڈہرکی
ہائے افسوس کہ رسماً بھی کسی نے مجھ کو
آن کر عید مبارک نہ کہا عید کے دن

زوباریہ خالد ______ لاہور
آج محفل میں پھر اکیلا ہوں
آج پھر عید آئی ہے اے دوست

سائرہ ممتاز ______ واہ کینٹ
عید کا چاند دیکھنے والے
آ، کہ میری بھی عید ہو جائے

شفق راجپوت ______ گوجرہ
ہم نے پردیس میں کہیں چاند کو تاکیدیں
ان سے کہنا کہ انہیں لاکھ مبارک عیدیں

شاہ جہاں گل ______ مرزا پور
بے چارگی کے زخم ہیں اور بے بسی کے پھول
دامن میں اور کچھ بھی نہیں عید کے لیے

فریحہ شبیر ______ شاہ نکڈر
تو ساتھ تھا تو ہر اک روز، روزِ عید لگا
ہوا تو آج خفا ہے تو عید کیسے کریں
یہ عید کارڈ، یہ تحفہ تو رسمِ دنیا ہے
کہ آشیانہ جلا ہے تو عید کیسے کریں

سنبل ملک اعوان ______ شاہدرہ ملک
آئیں کبھی تو وہ بھی میری دید کے لیے
صورت کسی بہلنے دکھا چاند عید کے

ندا عروج ______ لیہ
چشم تو وسعتِ افلاک میں کھوئی سا غز
دل نے اک اور جگہ ڈھونڈ لیا عید کا چاند

اسماء عروج ______ ملتان
اے غمِ یار تجھے میری وفاؤں کی قسم!
میری آنکھوں میں ستارے نہ سجا عید کے دن

کوثر بانو ______ کراچی
کچھ مسرت مزید ہو جائے
اس بہانے سے عید ہو جائے
عید ملنے جو آپ آ جائیں
میری بھی عید، عید ہو جائے

ثروت جہاں ______ اوکاڑہ
کتنے ترسے ہوئے ہیں خوشیوں کو
وہ جو عیدوں کی بات کرتے ہیں

فرح سرفراز ______ کوٹ رادھا کشن
جو شخص کھو گیا ہم سے اندھیری راہوں میں
اسی کو ڈھونڈ کے لاؤ کہ عید آئی ہے

زہرہ کمال ______ چناب نگر
میرا چاند مسکرائے تو عید ہے عید
وہ چہرہ دکھائے تو عید ہے عید
رہتا ہے وہ بدلیوں کے اس پار
جب سامنے آئے تو عید ہے عید

سارہ مجیب ______ لاہور
اُن کو دیکھا تو پھر اُترا نہ گیا
آسمان تک ہی رہا عید کا چاند

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

سمیرا یوسف — کی ڈائری سے

ترکی کے انقلابی شاعر ناظم حکمت نے ہیروشیما میں امریکا کے ہاتھوں برسائے ہوئے دنیا کے پہلے ایٹم بم کے خلاف اس لڑکی کی فریاد کے طور پر وہ نظم لکھی تھی جو سوئے ہوئے انسانوں کے دل پر دستک دیتی ہے سو آج پاکستان کے بے گناہ معصوم بچے امریکا کے ڈرون حملوں کا نشانہ ہیں اور عالمی ضمیر ہی نہیں پاکستان کے نام نہاد دانش ور بھی سو رہے ہیں۔

پیارے انکلز!
میں ہیروشیما میں ایٹم بم سے جل کر
مرجانے والی لڑکی ہوں
میں چھوٹی ہوں اور ہمیشہ چھوٹی رہوں گی
کیونکہ مردہ بچے کبھی بڑے نہیں ہوتے
مگر میں آپ کو سنانا چاہتی ہوں کہ
میں لقمۂ اجل کیسے بنی
پہلے بارودی آگ سے میرے کپڑے جلے
پھر میرے بال اور اس کے بعد میرا سارا وجود
پیارے انکلز!
پیاری آنٹیاں!
مجھے آئس کریم اور ٹافیاں پسند تھیں
مگر مرجانے والے بچے آئس کریم اور ٹافیاں نہیں کھا سکتے
میں آپ کے در پر اس لیے دستک نہیں دے رہی
کہ مجھے ٹافیاں دیں، آئس کریم کھلائیں
میں آپ کے پاس صرف اس لیے آئی ہوں
کہ آپ آواز اٹھائیں اس جنگ کے خلاف
جو بچوں کو مٹھی بھر راکھ بنا دیتی ہے
میں تو مر گئی ہوں مگر چاہتی ہوں کہ
دوسرے بچے جیتے رہیں
ٹافیاں اور آئس کریم کھاتے رہیں

نوال افضل گھمن — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ساحر لدھیانوی کی یہ غزل
ناہید مزمل بٹ کے نام۔

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا

ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ہیں اُن کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

کس لیے جیتے ہیں ہم کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	ایشا، مریم
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

فوزیہ سلیم ۔۔۔ چیچہ وطنی

چاند نگر کا چاند جو بچھڑ گیا!
اس جگ کی رات اندھیری میں اک تارہ تھا وہ ڈوب گیا!
اور وعدے ساتھ نبھانے کے سب بھول بھلا کر خوب گیا!

چاند نگر کے چاند کو دنیا سے گئے 20 برس مکمل ہو گئے ہیں۔ان کی شخصیت کا جادو آج بھی اسی طرح ہے وہ زندہ ہیں دلوں میں ذہنوں میں اپنی تحریروں میں! ذوالقرنین بھائی کی صورت میں اور جو انہوں نے کرن کی شکل میں پودا لگایا جس کی شاخیں ہمیں آج سایہ دے رہی ہیں!

وہ ناول نگار افسانہ نگار شاعر مصنف کالم نویس اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔

خلیل جبران نے کہا! "تم میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔ لیکن وہ سب دے دیتے ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی سخاوت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا صندوق کبھی خالی نہیں ہوتا۔"

پہلے جبران کے اس خوب صورت جملے کا عقدہ نہیں کھلا تھا جیسے کہ اب کھلا ہے۔

محمود بابر فیصل جانتے تھے سب دے دینا کیا ہوتا ہے! کیا معنی رکھتا ہے؟ کوئی اپنی ذات کی نفی کر کے کسی کو بچی خوشی نہیں دے سکتا۔انہوں نے یہ کٹھن کام کیا!

یہ ان کی سخاوت تھی کہ انہوں نے محبت دونوں ہاتھوں سے بانٹی! یہ ان کا زندگی پر یقین تھا کہ زندگی حرارت محبت اور لطف کا دوسرا نام ہے انہوں نے اسی زندگی کے یقین کو آگے بڑھایا۔ ان کی تحریروں نے تو ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے! دعا بھی ایسی جو مسلسل سفر میں ہے! نسل در نسل! علم کا ایک ذخیرہ ہے جو مستقل سلسلوں کی صورت ذوق کو تسکین دیتا ہے۔

دعائے خیر جو ان کی زندگی میں ان کی خوشیوں کے لیے کی جاتی تھی اور آج یہی دعائے خیر اب ان کے جنت میں درجات بلند کرنے کے لیے مانگی جاتی ہے۔

وہ روشن چمکتا چاند بہت دور دور چلا گیا ہے! ان کے لیے ہمارے دلوں میں یادوں اور محبتوں اور احترام کے روشن چراغ زندہ رہیں گے۔

مبین اختر راجہ ۔۔۔ سوہاوہ

میں چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی۔جب سے خواتین پڑھ رہی ہوں۔اب الحمدللہ ماسٹرز کیے ہوئے بھی عرصہ بیت گیا ہے یقین کیجیے بہت دکھ ہوتا ہے یہ سن کر جب مائیں اپنی جہالت کی وجہ سے بچیوں کو خواتین پڑھنے سے روکتی ہیں۔

میں نے میٹرک سے لے کر ماسٹر تک تمام امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے اور خواتین یا شعاع کبھی بھی میری نصابی سرگرمیوں پر منفی انداز سے اثر انداز نہیں ہوا بلکہ ان پرچوں نے ہمیشہ میری راہنمائی کی۔

"میرے خواب لوٹا دو" کی آخری قسط پڑھی۔ویل ڈن نگہت جی! آپ نے ہماری توقعات کے مطابق اختتام کیا۔

نگہت سیما "زمین کے آنسو" کو بہت خوب صورتی سے اختتام کی جانب لے جا رہی ہیں۔ان کی یہ تحریر ہمیں مدتوں یاد رہے گی۔

اس شمارے میں جس تحریر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے "گل نین" نبیلہ عزیز نے خان بابا کی گل نین تحریر کر کے قلم سے وفا کا حق ادا کر دیا۔اس کے علاوہ افسانوں میں "چھوٹی سی درز" اور "وہ میرا مہربان" بہترین تھے۔

پیاری بہن! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔میں والدین اپنی بچیوں کو خواتین شعاع پڑھنے سے روکتے ہیں یہ جان کر ہمیں بھی افسوس ہوتا ہے حیرانی کی بات یہ ہے کہ تقریباً" ہر گھر میں ٹی وی ہوتا ہے اور لڑکیوں کو ٹی وی دیکھنے کی اجازت بھی ہوتی ہے جبکہ ٹی وی پر تقریباً" ہر چینل سے خواتین اور شعاع کی کہانیاں ہی ڈرامائی تشکیل کر کے پیش کی جا رہی ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔نبیلہ عزیز اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ثمرہ ریاض ارتقا ریاض ۔۔۔ ذکریا ٹاؤن ملتان

مکمل ناول میں "خان بابا کی گل نین" نمبر ون پر رہا۔ خان بابا کی موت اور گل نین کے صبر نے بہت رلایا اور حیشم خان کا کردار بہت پسند آیا۔افسانوں میں "چھوٹی سی درز" نے ڈائجسٹ کو چار چاند لگا دیے۔اور بلا عنوان کہانی کا مقصد ہی سمجھ میں نہ آیا۔"زمین کے آنسو" زبردست چل رہا ہے۔ اس میں ایبک اور اریب فاطمہ ناول کی جان ہیں۔

ج : پیاری ارتقا خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔گل نین نے صبر تو کیا ہی نہیں۔اس نے تو حیشم خان کا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کر احتجاج کیا اور اسے شادی کرنا پڑی۔صبر تو لائبہ کو کرنا پڑا۔فہد مصطفیٰ کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں۔ثمرہ کا بھی شکریہ —— ثمرہ کہانیاں پڑھ لیں تو ان سے کہیں کہ خط بھی وہی لکھیں۔

مسز نائلہ سیف رضوی ۔۔۔ گاؤں چانڈہ شکر گڑھ

شادی سے پہلے پابندی تھی لیکن اب میاں جانی ہر ماہ باقاعدگی سے لا کر دیتے ہیں مجھے ان رسالوں نے بہت کچھ سکھایا ہے صبر اتحاد محبت اتفاق اسی لیے میاں جانی جو کہ امام مسجد ہیں وہ بھی انہیں پسند کرتے ہیں اس ماہ کا رسالہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔نکمی پڑھ کر بہت ہنسی آئی کیونکہ اس معاملے میں میں بھی نکمی ہوں۔ موسٹ فیورٹ جو رکے تو عنیزہ سید بہت بہت اچھا ہے اس دفعہ کھاری کا کڑ فیوژن پڑھ کر میں کتنی دیر ہی ہنستی رہی خان بابا کی گل نین لائبہ کی بے وقوفی کا اس کو اچھا انجام ملا ہاں اگست کے شعاع میں ایک بہن نے پروا اوز گل نامی شاعرہ کی کہانی کا پوچھا تھا۔یہ نبیلہ ابر راجہ کی تحریر تھی "میں کی کریار مناواں" جو جنوری 2011ء کے شعاع میں شائع ہوئی تھی۔

ج : پیاری نائلہ! یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کے میاں جانی روشن اور کھلا ذہن رکھتے ہیں۔امام مسجد ہیں اس کے باوجود آپ کی خوشی کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ آپ کو خود پرچے لا کر دیتے ہیں اور انہیں پسند بھی کرتے ہیں لائبہ کو بے وقوفی کی سزا نہیں ملی۔اگر وہ شک نہ کرتی تب بھی اس کہانی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔کسی جوان خوب صورت اور غریب لڑکی کو گھر میں پناہ دی جائے تو وہ بہت جلد گھر کی مالکن بن جاتی ہے سبب کچھ بھی ہو لیکن ہم نے حقیقی زندگی میں ایسی کہانیوں کا یہی انجام دیکھا ہے۔گل نین نے حشیم خان سے محبت تو شروع کر ہی دی تھی۔آگ جل رہی ہو تو آنچ پہنچتے دیر نہیں لگتی۔ حیشم خان کو مائل ہونا ہی تھا۔اور حیشم خان نے بھی کون سا کردار کا ثبوت دیا بات تو تب تھی کہ جب حیشم خان گل نین کی شادی زوہیب سے کراتے جو اس کا مجرم تھا۔

بنت خلیل ۔۔۔ سمندری

شعاع اور خواتین کو پہلی دفعہ میں نے تب پڑھا جب میں ہفتم میں تھی اور اب میں تعلیم مکمل کر چکی ہوں اور مقامی کالج میں لیکچرر کے فرائض انجام دے رہی ہوں لیکن ان کے ساتھ میرا رشتہ جوں کا توں قائم ہے۔

سب سے پہلے کرن کرن روشنی سے روشنیاں سمیٹیں۔ آپ کے ڈائجسٹ کا یہ سلسلہ میرے دادا جان بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

نگہت عبداللہ نے میرے خواب لوٹا دو کو بہت جلدی میں سمیٹا (کوہ گراں تھے ہم) عنیزہ سید! یو آر گریٹ۔ بہت زبردست لکھا ہے۔سعد جیسا کریکٹر پڑھ کر مزا آجاتا

ہے۔

نگہت سیما کی معلومات بہت زبردست ہیں۔ میں خود تاریخ پڑھاتی ہوں اور ان کے ترتیب دیے واقعات کو پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔

گل نین بہت اچھا ناول تھا۔ باقی سب سلسلے بھی بہترین تھے۔ ایک اور چھوٹی سی فرمائش شاہین رشید سے کہ ایک میوزیکل بینڈ BMW کا انٹرویو شائع کردیں۔

ج : بنت خلیل! ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہماری قارئین ذہین' باشعور اور تعلیم یافتہ ہیں اور آپ تو علم کی روشنی بانٹ بھی رہی ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ آئندہ بھی اس محفل میں شرکت کرکے اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا

کہانی کے متعلق پتا کرنے کے لیے آپ 32721666 پر فون کریں۔

مسز بیبن اجمل۔۔۔۔ روہڑی سکھر

شادی سے پہلے ابو اس کے مخالف تھے' اس لیے چاہتے ہوئے بھی کسی کہانی پر تبصرہ نہ کرسکی۔ میں 18 سال سے خواتین پڑھ رہی ہوں اور اس میں میرے ساتھ میری امی اور چھوٹی بہن فرحین بھی شامل ہے۔ ویسے تو آپ کے رسالے میں شائع ہونے والی ساری تحریریں ہی اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل نئی رائٹرز کی وجہ سے بہت ہی نئے نئے موضوعات سامنے آرہے ہیں۔ بہت سی پرانی مصنفائیں منظر سے غائب ہیں کیوں بھلا۔۔۔۔ پلیز جلدی آئیں ہم سب آپ سب کے منتظر ہیں۔

اب آتے ہیں رسالے کی طرف تو جناب اتنے عرصے بعد جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے تو وہ ہے نگہت سیما کی "زمین کے آنسو" بلاشبہ ایک بہترین تحریر ہے۔ لیکن نگہت جی سے گزارش ہے کہ اگر وہ مسلم دشمن قوتوں کے بارے میں تفصیل سے الگ سے ایک ناول لکھیں تو شاید وہ ان کا ایک شاہکار ناول ہوگا۔ کیونکہ ہمارے عوام پیروں' فقیروں اور ٹی وی پہ آنے والے ان اینکر پرسنز سے بہت متاثر ہے۔ پلیز ان تمام بہروپیوں کو سامنے لائیں ورنہ شاید آپ کے قلم کا حق ادا نہ ہو پائے۔

آخر میں آپ کو کچھ مشورے دینے ہیں پسند آئیں تو عمل کرلیجیے گا ورنہ نہیں۔

1 آپ خطوط' کہانیاں اور مستقل سلسلوں میں شرکت کی آخری تاریخ ضرور "ہمارے نام" کے شروع میں لکھ دیں تاکہ سب کو اندازہ رہے۔

2 مستقل سلسلوں میں جو سروے وغیرہ ہیں ان کے سوالات ہر دفعہ شائع کریں چاہے چھوٹا سا کرکے ہی۔

3 شاعری پہ مبنی آپ کے رسالے میں چار سلسلے ہیں اگر انہیں کم کردیا جائے تو کسی نئے سلسلہ کی جگہ بن جائے گی۔

ج :۔ بیبن! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ کے خط میں کوئی غلطی نہیں بلکہ نہایت صاف ستھری موتیوں جیسی لکھائی ہے آپ کی۔ آپ کے مشورے بہت صائب ہیں ضرور عمل کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

فاطمہ شارق نے کراچی سے لکھا ہے

ستمبر کے شمارے کا سرورق پسند آیا۔ آپی! ایک طویل عرصے بعد فارحہ ارشد کا نام فہرست میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ وہ میری فیورٹ رائٹرز کی فہرست میں شامل ہیں مگر۔۔۔۔ تحریر پڑھ کر تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ فارحہ آپی نے لکھا ہے اتنا میچیور' اتنا اچھا لکھنے والی سے مجھے یہ امید نہ تھی۔ خواب دیکھنا اور دکھانا اچھی بات ہے کہ یہی انسان کو جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کو ایسے خواب تو نہ دکھائیں جو انہیں کہیں کا نہ رکھیں کہ اکثر لڑکیاں ان ہی کرداروں سے سیکھتی اور ان میں ہی اپنے آپ کو تلاشتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے شعوری یا لاشعوری طور پر ہی سہی۔ خالص جاگیردارانہ نظام کا پروردہ "چھوٹے شاہ جی" کا ایک خوں بہا میں آئی لڑکی کو اتنے نازو نعم سے "پالنا" اور اس پر ان کے والد اور خاندان کا خاموش رہنا سمجھ میں نہیں آیا۔ ان کے خاندان والوں کے لیے اس لڑکی کو ٹھکانے لگانا کہیں آسان بات تھی پھر وہ کس مجبوری کے تحت بیٹے کی بات مانتے چلے گئے محض اکلوتا ہونا انہیں اس حد تک جھکنے پر مجبور کرسکتا تھا؟ اور معاف کیجیے گا پورے خاندان کا باغی یا یوں کہیے الگ مزاج کا حامل اگرچہ ابھی ہوجائے تو وہ کس قدر بے بس ہوتا ہے۔ میں ایسے ایک حقیقی کردار سے واقف ہوں۔ پھر لڑکی کا عین مہندی والے روز ڈانس کرنا خاصا فلمی لگا۔ چند لمحوں کو ذہن میں انجمن اور امراؤ جان ادا زندہ ہوگئیں اور پھر مزید یہ کہ پورے خاندان کے سامنے ہیرو نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جو بڑھک ماری اور پھر ہیپی اینڈ؟ بے شک خوشگوار اختتام والی کہانیاں مجھے بھی بہت پسند آتی ہیں مگر وہ منطقی بھی تو ہوں۔ آپی! میں جانتی ہوں آپ میرا خط شائع نہیں کریں گی۔ اگر کیا بھی تو کاٹ پیٹ کر لیکن اس پرچے پر میرا بھی تو حق ہے ناں اور بحیثیت قاری اپنی رائے دینے اور قاری بہنوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنا بھی میں ضروری سمجھتی ہوں۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔

ج : فاطمہ شارق! آپ کا خط شامل اشاعت ہے اب تو آپ کو یقین آگیا ناکہ ہم صرف تعریفی خط شامل نہیں کرتے تنقیدی خط بھی شامل کرتے ہیں۔

فاطمہ! کبھی کبھی خواب دیکھنا اور دکھانا اچھا لگتا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں فارحہ ارشد ہماری بہت اچھی لکھنے والی ہیں' انہوں نے طویل عرصہ بعد دوبارہ قلم اٹھایا اور کہانی لکھی۔ یہ کہانی پڑھ کر ہمیں بھی یہی اعتراضات ہوئے تھے اور یقین کریں کہ ہم نے فارحہ کو فون کرکے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ ہمیشہ المیہ انجام پر مبنی کہانیاں لکھتی رہی ہیں۔ اس بار کچھ مختلف لکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے اس کہانی کو جوں کا توں شائع کردیا جائے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے ورنہ ان کا اعتماد مجروح ہوگا۔

کسی مصنف کا کہنا ہے۔

"ہم کہانی اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس میں جواب ہوتے ہیں۔ ہم کہانی اس لیے پڑھتے ہیں اس میں خواب ہوتے ہیں۔"

آپ کا بے ساختہ اور بے لاگ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اب تک کہاں تھیں آپ؟ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا اور ہاں تنقید کرتے ہوئے بالکل نہ جھجکیں ہمیں تعریف اور تنقید یکساں اچھی لگتی ہے۔

آنسہ شیر۔۔۔۔ ڈوگہ گجرات

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم' عنیزہ سید زبردست آپ کے بارے میں پتہ چلا کہ آپ کے بچے ماشاء اللہ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ بہت باصلاحیت ہیں اور تمام کام بہت خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔

"میرے خواب لوٹا دو" واہ نگہت عبداللہ جی آخری قسط تو بہت اچھی تھی۔ لیکن کچھ سوال ذہن میں ابھر رہے ہیں سمیر کا کیا بنا؟ تاجور کا کیا بنا؟ "چھوٹی سی درز" غزالہ فرخ کیا افسانہ لکھا ہے زبردست!

ج : پیاری آنسہ! آپ کا اندازہ درست ثابت نہیں ہوا اس ماہ سے ہم عفت سحر پاشا کا ناول شروع کررہے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

نمورحمٰن۔۔۔۔ جہانیاں منڈی

لیجیے! آج آخر کار تقریباً" دس سال بعد خواتین ڈائجسٹ میں خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم تھام ہی لیا۔

عنیزہ سید کا "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" ناول۔۔۔۔ عنیزہ کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے' میں اکثر اوقات ناول کی کہانی کے بجائے الفاظ کے چناؤ۔۔۔۔ میں ہی گم ہوجاتی ہوں۔۔۔۔ بہت عرصے بعد فارحہ ارشد اپنے مخصوص رنگ میں نظر آئیں۔

اب ذرا بات ہوجائے "زمین کے آنسو" کی۔ نگہت سیما بہت خوب صورتی کے ساتھ ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ بہرحال احمد رضا کی کہانی پڑھ کر مجھے بے ساختہ زید حامد یاد آگئے' جو اسی طرح چینل لانچ کرکے بہت بھرپور انداز میں گفتگو میں کرتے ہیں' لیکن وائے قسمت! وہ بھی ختم نبوت پر کھل کر اقرار نہ کرسکے' جس سے مشکوک ٹھہرے۔۔۔۔ دیکھتے ہیں کہانی آگے کس موڑ کی طرف جاتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ تو ہے کہ ختم نبوت پر یقین ہی ہمارے ایمان کی تکمیل ہے۔ اگر یہ مشکوک تو ہم بھی دائرہ اسلام سے باہر۔

ج : آپ کی تحریر بہت خوب صورت ہے' تفصیلی تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ بس افسوس ہے تو اس بات کا کہ آپ نے سستی دور کرنے میں دس سال لگادیے اب دوبارہ دس سال کے لیے خاموشی نہ اختیار کرلیجیے گا۔ پرانی رائٹرز ہمیں بھی بے حد عزیز ہیں۔ عمیرہ احمد کی تحریریں ہم بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ تنزیلہ ریاض کی تحریروں کا ہمیں آپ سے زیادہ انتظار رہتا ہے۔ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ وہ ہمارے پرچوں میں لکھیں۔

عنیزہ سید نے کافی عرصہ بعد ناول لکھا ہے لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کا یہ ناول ان کی پچھلی تحریروں کی

طرح قارئین بے حد پسند کر رہی ہیں۔

فوزیہ زبیر۔۔۔ چشتیاں

سب سے پہلے حسب معمول عنیزہ جی کا ناول عنیزہ جی کے اس شاہکار کو ہم محاورتاً ہی نہیں بلکہ حقیقت میں سانسیں روک کر پڑھتے ہیں۔

نبیلہ جی کا مکمل ناول "گل نین" ایک بہترین تحریر تھا مگر پتا نہیں کیوں ادھورا ادھورا سا لگا' خاص طور پر اختتام گل نین کی بے بسی اور اذیت نے بہت دکھی کیا تو لائبہ کی کم عقلی اور ہٹ دھرمی نے افسوس میں مبتلا۔ کیا واقعی شک بسے بسائے گھر کی نہ صرف بنیادوں کو ہلا سکتا ہے بلکہ اجاڑ کر کھنڈر بھی کر سکتا ہے۔ لائبہ کے دل میں شک کا بیج بو کر بھلا حمیدہ کے ہاتھ کیا آیا۔

ج : فوزیہ! لائبہ کم عقل اور ہٹ دھرم نہیں تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو اسی طرح سوچتی اس نے جو کچھ کیا اپنا گھر بچانے کے لیے کیا جو پھر بھی نہ بچ سکا۔ گل نین کے دل میں ہیشم خان بستا تھا اور ہیشم خان کے دل میں بھی چور تھا تب ہی تو گل نین نے اسے چیخ چیخ کر الزام دیا اور اس نے جھٹ سے نکاح کر لیا اور جو اصل مجرم تھا وہ صاف بچ گیا۔ اسے کوئی سزا ملی نہ اس کا جرم دنیا کے سامنے آیا گل نین نے بھی سارا الزام لائبہ اور ہیشم خان کو دیا۔

انیلا پروین مہسر۔۔۔ خیرپور سندھ

بہت عرصے سے ہم خواتین اور شعاع ڈائجسٹ پڑھ رہے ہیں اور ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ میں کرن کرن روشنی سے ہمیں بہت مفید باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں اور شعاع میں تاریخ کے جھروکوں والا سلسلہ بہت اچھا ہے اور کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

ج : پیاری انیلا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانی بھجوادیں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

انعم' کلثوم۔۔۔ لاہور

سب سے پہلے "جور کے تو کوہ گراں تھے" پڑھا اور اس ناول کو ہم جیسے جیسے پڑھتے گئے' یہ اتنا ہی الجھتا گیا پھر اس کے بعد ہم نے جلدی سے دوڑ لگائی میرے خواب لوٹا دو کی آخری قسط پڑھ کر ہمیں دکھ ہوا کہ اب ہم نگہت آپی سے نہیں مل سکیں گے۔ اس کے بعد زمین کے آنسو پڑھ کر تو مزہ ہی آگیا لیکن نگہت سیما جی پلیز ایبک اور ادیب فاطمہ کو الگ مت کرنا آپ ورنہ میں روودوں کی اس بار ماہ تمام کو نہ پا کے افسوس ہوا اور باقی سارے افسانے' ناولٹ اور مکمل ناول بھی اچھے تھے مگر جو مکمل ناول بازی لے گیا وہ ہے خان بابا کی گل نین' شاہد آفریدی کا بمعہ فیملی انٹرویو شائع کریں۔

ج : انعم اور کلثوم خواتین ڈائجسٹ پسند آیا۔ بہت شکریہ۔

سودہ خان جتوئی۔۔۔ غازی پور ضلع رحیم یار خان

آٹھ بہن بھائیوں میں میرا دوسرا نمبر ہے میری ایجوکیشن میٹرک ہے۔ ہماری فیملی غازی پور کے چند بااثر گھرانوں میں سے ہے۔ غازی پور کے لوگ بہت ہی سادہ اور محنت کش ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں لکھی جانے والی تحاریر بے شک ہم سب کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کو لکھنے والی رائٹرز بلاشبہ قاری کا دل جیتنے کی صلاحیت رکھتی ہیں خواتین میں شائع ہونے والی سلسلہ وار کہانی (زمین کے آنسو) پڑھ کر ہمارے آنسو بہہ جاتے ہیں۔ پلیز احمد رضا کو پہلے والا احمد رضا بنا کر بہن سمیرا اور اس کے والدین سے ملادیں۔

ج : پیاری سودہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے اور جو خط شائع ہوا اس پر نام غلط شائع ہوا۔ شاعری کے لیے معذرت فی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔ ویسے بھی ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں۔ تھوڑی اور بڑی ہو جائیں پھر شاعری کیجئے گا۔ نگہت سیما تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

کدو رت کی علینا

مومل شیخ سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"مومل شیخ۔"
2 "پیار کا نام؟"
"بچپن میں تو گڑیا کہتے تھے چاچا وغیرہ۔ اب سب مومو کہتے ہیں۔"
3 "نام کس نے رکھا؟"
"یہ سندھی نام ہے اور میری ماں نے رکھا۔ جب میں پیدا ہوئی' اس زمانے میں ایک ڈرامہ آرہا تھا جس میں کسی کا نام مومل تھا بس امی نے اسی سے متاثر ہو کر نام رکھا۔"
4 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"
"15 مئی 1984ء/لاہور۔"
5 "قد/ستارہ؟"
"5 فٹ 4 انچ/ٹورس۔"
6 "بہن بھائی؟"
"شہزاد بھائی اور پھر میں۔"
7 "تعلیمی قابلیت؟"

"مارکیٹنگ ان ایڈورٹائزنگ (لندن) اور اس سے پہلے اے لیول کیا۔"
8 "شادی؟"
"جی ہو گئی ہے اور ماشاءاللہ ڈھائی سال ہو گئے ہیں۔"
9 "پہلا پروگرام؟"
"مزاحیہ سیریل تھا۔"
10 "وجہ شہرت' پروگرام؟"
"اعتراف" نے مجھے پہچان دی پھر کمرشلز کیے۔"
11 "پہلی کمائی/کیا کیا؟"
"اے لیول کے بعد میں نے ٹیچنگ شروع کی تھی بحیثیت آرٹ ٹیچر کے اور 68 ہزار ملے تھے اور خرچ ہی کیے ہوں گے۔"
12 "شوبز کی بڑی برائی؟"
"کبھی بھی ٹائم پہ پروجیکٹ ختم نہیں ہوتے۔"
13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"کام کے دن نو بجے تک ورنہ تھوڑی دیر سے اٹھتی ہوں۔"
14 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"ناشتہ اور پھر کام پر جانے کی تیاری۔"
15 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"چھوٹی موٹی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہوئی کہ بری لگے۔"
16 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"
"قانون ہے کہاں' جو برا لگے گا۔"
17 "قومی تہوار کیسے مناتی ہیں؟"
"بہت جوش و خروش کے ساتھ گھر سے نکل کر اور اس وقت دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے لیے کچھ کریں۔"
18 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"کچھ نہیں کیونکہ مجھے یہ یقین ہے کہ اللہ نے جس طرح کا بنا کر آپ کو بھیجا ہے کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہو گا۔"
19 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"میں کھانے کی طلب میں چڑچڑی نہیں ہوتی۔"
20 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"
"جب بہت مصروف ہوتی ہوں تو فارغ ہونے کا' تاکہ اپنے میاں کے ساتھ وقت گزار سکوں۔"
21 "شدید تھکن میں بھی کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"
"امی کے پاس۔"
22 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
"چوبیس گھنٹے خوش رہ کر۔"
23 "دوسرے ملک میں رہنا کیسا لگتا ہے؟"
"مستقل رہنا تو اچھا نہیں لگتا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اپنا ملک اور اپنا گھر سب یاد آنے لگتا ہے۔"
24 "طبیعت میں ضدی پن ہے؟"
"بالکل بھی ضدی نہیں ہوں۔"
25 "دماغ کب گھومتا ہے؟"
"کوئی کام لیٹ ہونے پر۔"
26 "کیا بات برداشت سے باہر ہوتی ہے؟"
"جب لوگ منہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔"
27 "غصے میں کیا کرنے کو دل چاہتا ہے؟"
"کچھ نہیں' کیونکہ میرا غصہ پانچ سات منٹ کا ہی ہوتا

ہے۔"

28 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"جو نرم دل ہوتے ہیں وہ ہی اچھے لگتے ہیں۔ جن میں غصہ نہیں ہوتا وہ بھی۔"

29 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"
"کہوں گی اب بس کرو یار۔"

30 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"میں نے اپنے بابا کا غصہ تیز دیکھا نہ بھائی کا نہ امی کا اور نہ ہی اب شوہر کا تو ڈرنا کس سے؟ احترام ضرور ہے سب کا۔"

31 "پرائز بانڈ لینے کا شوق ہے؟"
"نہیں بالکل نہیں۔"

32 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"
"کچھ نہیں جو ملا ہے اپنے وقت پہ ہی ملا ہے۔"

33 "زندگی کو کس انداز میں دیکھتی ہیں؟"
"ہمیشہ پوزیٹو انداز میں اور اس یقین کے ساتھ کہ جو اللہ نے لکھ دیا ہے وہی ملنا ہے۔"

34 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جو جوائنٹ ہو گا وہ آپ کا فیملی ممبر ہی ہو گا۔"

35 "محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
"موڈ پر منحصر ہے۔ ویسے میں شرمیلی ہوں نہیں۔"

36 "شاپنگ پہ سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟"
"شاپنگ مجھے مشکل لگتی ہے۔ مال میں گھومنا پھرنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

37 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں..... اچھے خاصے خرچ ہو جاتے ہیں۔"

38 "برا وقت جو آپ نے گزارا؟"
"جی اتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔"

39 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"دعائیں۔ یہ بہت ضروری ہیں انسان کے لیے۔"

40 "کس کام کو کر کے سکون ملتا ہے؟"
"لوگوں کی مدد کر کے اور مستحق لوگوں میں کھانا بانٹنا اچھا لگتا ہے۔ اکثر میں خود ہی اکیلے۔ نکل جاتی ہوں اور روڈ پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں سے مدد کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

41 "پیسے کے لیے آپ کی سوچ؟"
"پیسہ آنے جانے والی چیز ہے۔ آپ کا رہن سہن اور آپ کا مینٹل لیول اس انداز کا ہو کہ اگر کل کو پیسہ نہیں ہے تو آپ کو مشکل نہ ہو۔"

42 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"میرا موڈ 24 گھنٹے اچھا رہتا ہے۔"

43 "اپنے لیے کس کی تعریف اچھی لگتی ہے؟"
"اپنے شوہر کی..... ویسے وہ میری تعریف اکثر کرتے رہتے ہیں اور میرے لیے ان کی تعریف سب سے زیادہ اہم ہے۔"

44 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے بھی اور پرائے بھی۔"

45 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"سسرال، امی اور پھر دوستوں میں، دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

46 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"یہ منحصر ہے اس بات پر کہ "ایونٹ" کیا ہے۔ گرمیوں میں شلوار قمیص پسند ہے۔"

47 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی جملہ یا لفظ؟"
"ہائپر ہوں۔ دوست وغیرہ کہتے ہیں۔"

48 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"

49 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"
"سب اپنے حساب سے بہت اچھے ہوتے ہیں تو جن کے ساتھ موقع ملے گا کام کروں گی۔"

50 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"جب فارغ ہوتی ہوں تو سب کو ہی جواب دیتی ہوں۔"

51 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"دوستوں کے ساتھ چلی جاتی ہوں ورنہ سیلون۔"

52 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"
"میں نیگیٹو رول کرنا چاہتی ہوں۔"

53 "ایک کردار جو کر کے پچھتائیں؟"
"نہیں میرا نہیں خیال کہ ایسا کوئی کردار ہو گا۔ اپنے ہر کردار سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہے۔"

54 "ایک کردار جو بہت ہٹ ہوا؟"
"ابھی تو شروعات ہیں ویسے "کدورت" کے کردار علینا نے شہرت اور پہچان دی ہے۔"

55 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں ہم کام کے سلسلے میں ہی سب لیتے ہیں۔ کسی نے پریشان نہیں کیا۔"

56 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"بالکل بھی بری نہیں لگتی۔ اچھا لگتا ہے مہمان آتے ہیں تو۔"

57 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گی؟"
"اپنی ایک ٹیم بناؤں گی اور سب کو ساتھ لے کر کام کروں گی۔ اکیلی کچھ نہیں کرپاؤں گی۔"

58 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"شوز مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کافی ہیں میرے پاس۔"

59 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نصیحت کبھی بھی بری نہیں لگتی۔ اس میں بھی ہماری کوئی نہ کوئی بھلائی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔"

60 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"بالکل۔ چونکہ مجھ پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں اس لیے میں وقت کی پابندی کرتی ہوں۔"

61 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"کوئی خاص نہیں ہیں۔ سب پر ہی خرچ کرتی ہوں۔"

62 "ایک شخصیت جن کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں؟"
"اپنی ماں کے لیے..... کیونکہ انہوں نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے اور جتنا ہم ان کے لیے کریں گے وہ بھی کم ہو گا۔ ان کی ایک آواز پہ میں بھاگتی ہوں۔"

63 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"یاد ہی نہیں ہے..... کیونکہ شاپنگ کی شوقین نہیں ہوں۔"

64 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ٹیبل یا چٹائی؟"
"میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں اگر چٹائی پہ سب کھانا کھا رہے ہوں گے تو میں بھی بیٹھ جاؤں گی۔"

65 "ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟"
"مجھے زیادہ تر گھر کا پکا ہوا کھانا پسند ہے۔ ویسے چائنیز ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔"

66 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟"
"کچھ نہیں۔ سب کو جگاؤں گی کہ اٹھو میں بور ہو رہی ہوں۔"

67 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بالکل ہے۔ بہت معلومات ملتی ہیں ان سے۔"

68 "فیوچر پلاننگ؟"
"کوئی خاص نہیں، بس اچھا کام کریں، اچھی زندگی گزاریں۔"

69 "ایک کھانا جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"دال چاول، کڑاہی گوشت۔"

70 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"عورت ہی نرم دل ہوتی ہے۔"

71 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"چھپکلی، لال بیگ، چوہوں سے۔"

72 "خود کشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بزدل۔"

73 "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"نکاح کی رسم۔"

74 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"جس کے لیے جو آسانی ہو۔"

75 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"اپنی امی کے ہاتھ کا۔"

76 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟"
"ایک بار بھی نہیں۔"

77 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"بیگ۔ جس میں کافی چیزیں ہوتی ہیں۔"

78 "کیا آپ دوسروں سے مختلف ہیں؟"
"میرے خیال میں نہیں.... ہر کوئی اپنے حساب سے زندگی گزارتا ہے۔"
79 "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"
"میں اپنے ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ کاش ہم اس کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس کے مسائل حل کر سکیں۔"
80 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"اگر غلطی کی ہے تو اعتراف کر لینا بہتر ہے۔ پکڑے جانے سے تو بہتر ہے۔"
81 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"
"جو میری اچھی عادت ہے وہ ہی میری بری عادت ہے۔ کہ میں کسی بات کو بہت دیر تک دل پہ نہیں لیتی۔ معاف کرنے والی شخصیت ہوں۔"
82 "ہاتھ میں پین آجائے تو کیا لکھتی ہیں؟"
"سچ بتاؤں، مجھے لکھنے پڑھنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔"
83 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"نہیں کبھی نہیں۔"
84 "مارننگ شوز کیسے لگتے ہیں؟"
"اگر انٹرویوز ہوں تو اچھے لگتے ہیں۔ کیونکہ لوگ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"
85 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب آپ اسے سر پر سوار کر لیں۔"
86 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"جلدی سو جاتی ہوں۔"
87 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"
"امی کی تصویر ہے۔ لیمپ ہے فون ہے۔"
88 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"پوری دنیا۔"
89 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"جب کوئی اپ اینڈ ڈاؤن آتا ہے تب بری لگتی ہے کہ اوہو یہ کیوں ہو گیا ہے۔ مگر مایوس نہیں ہوتی۔ چیلنج سمجھ کر مقابلہ کرتی ہوں۔"
90 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"اوہو.... مجھے بہت مسئلے ہوتے ہیں، کیونکہ جب میں نیند سے بیدار ہوتی ہوں تو کچھ دیر بستر پر رہنا پسند کرتی ہوں۔"
91 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"
"تھوڑا غصہ ہے۔ مجھ میں وہ بھی نہ رہے تو اچھا ہے۔"
92 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہیں؟"
"زیادہ تر فریش ہی ہوتی ہوں۔ مگر صبح کے وقت زیادہ ترو تازہ ہوتی ہوں۔"
93 "آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟"
"بالکل بھی نہیں۔ سیکنڈوں میں تیار ہو جاتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اب مرد حضرات تیار ہونے میں زیادہ وقت لگاتے ہیں۔"
94 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"کھانا مل جائے بس۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"پونہ تو ہی لوں گی، کیونکہ اللہ نے میرے لیے یقیناً کوئی نہ کوئی بہتری ہی رکھی ہو گی۔"

بقیہ سروے

رہا ہوتا ہے، وہیں سب کو ایک اور خاص ڈش کا انتظار رہتا ہے اور وہ ہے "گرین تکہ پراٹھا رول" جسے میں اور میری بھابھی مل کر تیار کرتے ہیں.... قارئین کی خدمت میں، میری بنائی ہوئی اس خاص ڈش کی ترکیب حاضر ہے۔

گرین تکہ رول

آدھا کلو انڈر کٹ کا گوشت لے لیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر لیں۔

اس میں دو ٹیبل اسپون ادرک لہسن، ایک ٹیبل اسپون زیرہ (توے پر بھون کر کوٹ لیں)، نمک (ایک ٹی اسپون)، سفید مرچ (1/2 ٹی سپون)، کریم (تین ٹیبل اسپون) اور دو چمچ کچا پپیتا ملا دیں۔ ہرا دھنیا (دو ٹیبل اسپون)، ہری مرچ (سات سے آٹھ) دونوں کو ملا کر پیس لیں.... یہ تمام مسالا، گوشت کی بوٹیوں پر لگا کر پوری رات میرینیٹ کرنے کے لیے رکھ دیں۔ پھر دو ٹیبل اسپون تیل فرائنگ پان میں ڈال کر یہ مسالا لگی بوٹیاں پکا لیں.... اتنی دیر کہ گوشت گل جائے اور تمام پانی خشک ہو جائے اور پھر کوئلے کا دم دے دیں۔

پراٹھے بنانے کے لیے :

میدہ (دو کپ)، آٹا (آدھا کپ)، گھی (دو ٹیبل اسپون) اور نمک (آدھائی اسپون)۔ یہ سب ملا کر نیم گرم پانی سے آٹا گوندھ لیں اور پراٹھے بنا کر ہلکے فرائی کر لیں۔

مایو ساس بنانے کے لیے مایونیز (دو ٹیبل اسپون)، کریم (دو ٹیبل اسپون) اور سرکہ (دو ٹیبل اسپون)، تمام چیزوں کو مکس کر لیں۔

پراٹھے پر ساس لگائیں، پھر بیف بوٹیاں رکھیں، پھر پیاز کے لچھے اور پودینہ ڈال کر رول بنا لیں۔ مزیدار گرین بیف پراٹھا رول تیار ہے۔ چاہیں تو ان بوٹیوں کو سیخوں پر لگا کر باربی کیو کا مزہ بھی لے سکتے ہیں۔

اگر معدہ کا راستہ واقعی دل سے ہو کر گزرتا ہے تو یہ گارنٹی ہے میری کہ ہماری قارئین کئی دلوں کی مالک بن جائیں گی۔)

مہوش افتخار

1۔ جناب آپ کو شاید یہ پڑھ کر حیرت ہو گی کہ گوشت صاف کرنا، سنبھالنا اور پکوان تیار کرنا ان میں سے کوئی بھی ذمہ داری مجھے نہیں سونپی جاتی وجہ؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ جی ہاں ویسی ہی جوائنٹ فیملی جیسی آپ ناولوں میں پڑھتے ہیں.... بڑے سے گھر میں اپنی پیاری دادی کے زیر سایہ ہم تین فیملیز اپنے اپنے پورشنز میں رہتے ہیں۔ عام دنوں میں ہمارے ہاں الگ الگ کھانا بنتا ہے۔ لیکن ہر اہم موقع اور عیدین پہ ہمارے ہاں ایک ساتھ کھانا بنایا اور کھایا جاتا ہے۔ ایسے میں کوکنگ کی ساری ذمہ داریاں میری مما اور دونوں چچیاں سنبھالتی ہیں۔ عیدالاضحیٰ کے موقعے پہ بھی کچھ یہی صورت حال ہوتی ہے۔

گوشت سے متعلق ہر ذمہ داری خواتین کی ہی ہوتی ہے۔ ہم لڑکیاں البتہ نہ صرف ہر کام میں ان کی مدد کرتی ہیں بلکہ سویٹ ڈش، سلاد رائتہ وغیرہ بنانا، کھانا لگانا، اٹھانا اور بعد میں کچن سمیٹنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہوتا ہے۔

(2) عید پر میری مما چانپیں ضرور بناتی ہیں۔ کیونکہ ان کی یہ ڈش سب ہی افراد خانہ کو بے حد پسند ہے۔ ان لذیذ چانپوں کی ترکیب یہ ہے۔

لذیذ چانپوں کی ترکیب

اجزا :

چانپیں	ایک کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد درمیانی
لہسن ادرک کا پیسٹ	ایک، ایک چائے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ

پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچ
پسی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
سفید سرکہ	1/4 کپ

کوٹنگ کے لیے :

کارن فلور	ایک کپ
ڈبل روٹی کا چورا	ایک کپ
انڈے	دو عدد

ہلکا سا نمک اور تھوڑی سی کالی مرچ ڈال کر پھینٹ لیں

ترکیب :

ایک دیگچی میں کھانے کے آئل لے کر اسی میں باریک کٹی پیاز ڈال دیں۔ جب پیاز ہلکی گلابی ہو جائے تو اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ اور چانپیں ڈال کر چند منٹ تک بھونیں۔ اب اس میں ہلدی' پسی کالی مرچ' پسی سرخ مرچ' نمک اور سفید سرکہ ڈال دیں۔ ساتھ ہی اتنا پانی بھی ڈال دیں کہ چانپیں نہ صرف گل جائیں بلکہ اسی پانی میں خشک ہو کر تیار بھی ہو جائیں۔ چانپوں کے گلنے اور پانی خشک ہو جانے کے بعد ایک دو منٹ ان کی اچھی طرح بھنائی کر لیں۔ پھر انہیں چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

اب ایک فرائنگ پین میں کافی سارا آئل گرم کریں۔ ٹھنڈی ہوئی چانپوں کو ایک ایک کر کے پہلے کارن فلور' پھر انڈے اور آخر میں ڈبل روٹی کے چورے میں رول کریں اور فرائنگ پین میں ڈال دیں۔ ہلکا سنہری رنگ آنے تک فرائی کریں۔ سلاد اور کیچپ کے ساتھ سرو کر دیں۔

مجھے یقین ہے آپ جب انہیں ٹرائی کریں گی تو آپ کو ضرور پسند آئیں گی۔

نایاب جیلانی

ہمارے ہاں ہر تہوار کو جوش و جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ خاص طور پہ مذہبی تہوار اور چونکہ ہر خاص موقع پر خاص قسم کا اہتمام کیا جاتا ہے سو ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔

مجھ پر نہ امی کی طرف کوئی خاص ذمہ داری ہوا کرتی تھی اور نہ ہی سسرال میں۔ تو میں یہاں صرف "کھانے" کی بات ہی کروں گی پکانے کی نہیں۔

میری ذمہ داری نمکین عید پر صرف کھانے کی حد تک ہوتی ہے۔ باقی تمام کام جیسے گوشت صاف کرنا' سنبھالنا پکانا اور ڈشز کے نمونے تیار کرنا میری نند کے ذمے سب کام تھے اور وہ بہت سلیقے کے ساتھ سب کام سر انجام دیتی تھی۔ مگر یہ سب پچھلی عید کے عیش تھے۔ اب چونکہ الگ گھر ہے تو ذمہ داریاں بھی بے شمار۔ میں پہلی مرتبہ اس "تجربے" سے گزروں گی اور "تجربے" سے پہلے کیا بتا سکتی ہوں۔ میٹھی عید پہ بھی ذمہ داریوں کا پہاڑ دیکھ کر میں "بیمار" بن گئی تھی۔ اس عید پر بھی ایسا ہی کوئی پروگرام بنانے کا ارادہ تھا مگر شوہر کی دھمکیاں ..... میٹھی عید پہ میرے بیمار ہونے پر انہوں نے خود ہی کھانا پکانے سے لے کر گھر سیٹ کرنے تک سب کام کیے تھے مگر اب کی دفعہ صاف جھنڈی دکھا دی۔ (آہ میری قسمت)

2۔ دوسرا سوال دیکھ کر کچھ دھچکا سا لگا تھا..... پھر میں کافی سوچ بچار میں پڑ گئی۔ آخر میرے ہاتھ کی کون سی ڈش گھر والوں کو پسند ہو سکتی ہے؟ بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد بھی کوئی موزوں ڈش سمجھ میں نہیں آسکی۔ اپنا پکایا میں خود ہی بہت شوق سے کھا سکتی ہوں' تاہم میرے شوہر نے میرے ہاتھ کے پکوانوں پہ کبھی تنقید نہیں کی..... میں جیسا تیسا پکا کر سامنے رکھ دوں..... صبر و شکر سے سب کھا لیتے ہیں..... رزق کے نام نہیں رکھتے۔

اس دفعہ میرا ارادہ "ایرانی کوفتے" بنانے کا ہے۔ اور اس کے لیے میں قیمہ بھی خود ہی بناتی ہوں۔ چونکہ یہ ڈش بہت دفعہ ٹرائی کر چکی ہوں سو بنانا بھی مشکل نہیں اور خیر' کھانا تو بالکل مشکل نہیں اور اگر کوفتے بناتے ہوئے گیند ٹوٹ جائیں تب بھی مسئلہ نہیں یہ قیمے کی ہی کوئی ڈش بالآخر تیار ہو جائے گی۔

یہ ڈش بنا میں لیتی ہوں اور شوق سے کھانے کی کوئی گارنٹی نہیں..... خیر ترکیب بتائے دیتی ہوں۔

ایرانی کوفتے

اشیا :

قیمہ	1 کلو
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاوڈر	1/2 چائے کا چمچہ
سفید مرچ پاوڈر	1/2 چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
انڈا سفیدی الگ کر لیں	1 عدد
بادام چوپ کیے ہوئے	2 کھانے کے چمچے
پستہ (چوپ کیے ہوئے)	2 کھانے کے چمچے
کشمش	2 کھانے کے چمچے
کاٹیج چیز	2 کھانے کے چمچے
چیڈر چیز	2 کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا	2 کھانے کے چمچے
تیل	1/4 کپ
پیاز براون کر لیں	2 عدد
دہی	1 کپ

ترکیب :

قیمے میں نمک' سیاہ مرچ پاوڈر' سفید مرچ پاوڈر' لہسن پیسٹ' انڈا' بادام' پستہ' کشمش' کاٹیج چیز' چیڈر چیز اور ہری مرچ شامل کر کے نم ہاتھوں سے کوفتے بنا کر ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں۔ اس میں چوپ کیا ہوا لہسن ڈال کر چمچہ چلائیں۔ اس کے بعد اس میں دہی' براون کی ہوئی پیاز اور نمک ڈال کر مسالا بھوننے تک فرائی کریں۔ 1/2 کپ پانی ڈالیں اور تیار کیے ہوئے کوفتے ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ ہلکی آنچ پر 25 سے 30 منٹ تک پکائیں..... مزیدار ایرانی کوفتہ تیار ہے۔ (آہم۔ منہ میں آگیا ناپانی)

عنبرین اعجاز

1۔ میری طرف سے سب کو عید مبارک!

عیدالاضحیٰ کے موقع میری ذمے داری کا آغاز قصائی صاحب کی آمد سے ہوتا ہے۔ باورچی خانے کی دہلیز سے بیرونی دروازے کی دہلیز تک کا سفر بھاگتے دوڑتے ہوئے بڑے بڑے تھال' پراتیں' ٹرے اور پیالوں کی بروقت فراہمی میں ہی گزر جاتا ہے۔ البتہ گوشت کی صفائی' حصے بنانا اور بانٹنے کی ذمہ داری میرے پاپا کی زیر نگرانی اور زیر ہدایات میرے بھائی انجام دیتے ہیں۔

گوشت کو سنبھالنے کا کام میری ماما کا ہے۔ اب میری باری آتی ہے یعنی پکوان کی تیاری۔ عید کے روز تو فوری طور پر کلیجی چولہے پر چڑھا دی جاتی ہے ساتھ میں پودینے کی چٹنی والا دہی' سلاد اور آخر میں قہوہ پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ رات کے کھانے میں اہل خانہ کی طرف سے جو بھی "فرمائشی پروگرام" ہوتا ہے۔ اسے ہنسی خوشی پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مجھے قلبی و روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

عام طور پر مجھ سے بریانی' پلاؤ' کباب' حلیم' دم کا قیمہ' کوفتے' پسندے' اچار گوشت' ران روسٹ اور باربی کیو کی توقع کی جاتی ہے۔ حسب حال اور حسب پسند ڈشز منتخب کر کے چند روز قبل مجھے آگاہ کر دیا جاتا ہے تاکہ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو پہلے سے ہی منگوا کر لوازمات پورے کر لیے جائیں۔ ویسے میں عید کی رات کو ہی ران روسٹ اور باربی کیو کے لیے گوشت کو مسالا لگا کر فریج یا فریزر میں میرینیٹ کرنے کے لیے رکھ دیتی ہوں۔

2۔ عموماً" ہماری فیملیز میں عید کے دوسرے روز سے باقاعدہ دعوت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس فیملی کو مدعو کیا جاتا ہے' ان کی پسند "پرہیز" اور خصوصی فرمائش کو مد نظر رکھتے ہوئے مینو ترتیب دیا جاتا ہے۔ ہر کھانے کے بعد سبز قہوے کا ہونا لازمی ہے۔

چونکہ ہمارے گھر میں ایک ڈش کئی طریقوں سے بنتی ہے جن میں دیسی اور روایتی طریقے بھی شامل ہیں اور بدیسی بھی۔ یہاں میں اپنی بہنوں سے ایک ایرانی ڈش شیئر کرنا چاہوں گی جو اپنے فلیور اور خوشبو کی وجہ سے کافی ڈیمانڈ میں رہتی ہے امید ہے آپ سب کو بھی

پسند آئے گی۔

خراسانی بریانی

اجزا :

گوشت	ایک کلو
گھی	آدھا پاؤ
لونگ	6 عدد
الائچی سبز	4 عدد
زیرہ سیاہ پسا ہوا	2 ٹی سپون
پیاز	آدھا پاؤ
ادرک کا پیسٹ	2 کھانے کے چمچ
دہی	ایک پاؤ
سیاہ مرچ پاؤڈر	1 ٹی سپون
نمک	حسب ذائقہ
چاول	ایک کلو
کچا پپیتا پیسٹ	2 ٹیبل سپون
ثابت زیرہ	تھوڑا سا
زعفران اور کیوڑہ	ذرا سا

(دم دیتے وقت دودھ میں ملا لیں)

ترکیب :

گوشت پر نمک' ادرک پیسٹ' کچے پپیتے کا پیسٹ' پیاز کا پانی (عرق)' دہی' پسی سیاہ مرچ' پسا زیرہ اور سبز الائچی کے دانے پیس کر لگا کر کم از کم دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں ورنہ چار سے پانچ گھنٹے بھی ٹھیک ہیں۔ چاولوں کو ایک کنی پر ابال لیں۔ اب دیگچی میں ثابت زیرہ پھیلا کے ڈالیں۔ اس پر گوشت پھیلا دیں۔ اوپر سے لونگیں چھڑکیں اور گھی آدھی مقدار میں ڈال دیں۔۔ ابلے چاولوں کی دو مٹھی اور ایک پیالہ پانی گوشت پر ڈال دیں آنچ تیز کردیں ڈھکن ابھی مت دیں۔ ابلنے لگے تو باقی چاول ڈال کر اوپر سے گھی کی بقیہ آدھی مقدار بھی ڈال دیں اور دیگچی کا ڈھکن بند کرکے اوپر کوئی وزنی چیز رکھ دیں۔ آگ تیز ہی رہے گی۔ کچھ دیر بعد بریانی کا پانی خشک ہو جائے گا اور گھی کی آواز آنے لگے گی تو آنچ دھیمی کردیں اور بیس منٹ تک دم پہ رکھ دیں۔ بریانی تیار ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں اور ڈش میں نکال لیں۔ دم دینے سے قبل دودھ میں زعفران اور کیوڑہ ملا کر چھینٹا دے لیں۔

رمشہ خالد خان

(1) ہمارے ہاں تہوار بہت اہتمام سے منائے جاتے ہیں مگر عید الاضحیٰ پر "گوپانگ لاج" میں جو گہما گہمی ہوتی ہے' وہ کسی اور موقع پر شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے عید سے ایک دن پہلے قربانی کے جانور رقبے سے گھر لائے جاتے ہیں۔ ایسے میں بچوں کا اشتیاق دیدنی ہوتا ہے۔

عید کے پر سکون دن میں قصائی کی آمد کے ساتھ ہی ہلچل مچ جاتی ہے سب سے پہلے تو مرد حضرات کی دوڑیں لگتی ہیں' ساتھ ساتھ ان کا پارہ بھی بلاوجہ ہائی ہونے لگتا ہے (کم از کم میرے بھائی عبداللہ کا تو ضرور ہوتا ہے) پھر گوشت آنے کے ساتھ ہی "خواتین خانہ" کی ذمہ داریوں کا آغاز ہوتا ہے جو رات تک ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ آپ کا سوالنامہ پڑھ کر میری امی بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔

"ہاں۔ اب سب کو سچ بتانا"

تو جناب سچ تو یہ ہے کہ ایک تو میرا شمار ابھی "لڑکیوں" میں ہوتا ہے' اوپر سے اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے خصوصی رعایت حاصل ہے۔ دوران تعلیم امی نے کسی قسم کی گھریلو ذمہ داری مجھ پر یا اقصیٰ پر نہیں ڈالی ہوئی (ذمہ داری نہ ڈالنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سکھایا بھی کچھ نہیں بقول امی لڑکیوں کو سب کچھ آنا چاہیے) فی الحال تو "کمپیوٹر' کتاب اور قلم" ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ گوشت کے حصے بنا کر بانٹنا' اپنا حصہ صاف کرکے پیکٹ بنا کر فریز کرنا اور مزے مزے کے پکوان بنانا' یہ سب امی کرتی ہیں۔ اس دوران میرے ذمے اوپر کے "وغیرہ وغیرہ" قسم کے کام ہوتے ہیں جو اگرچہ کسی کھاتے میں شمار نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں باقاعدہ پلاننگ سے کرنا پڑتا ہے مگر تھکا ضرور دیتے ہیں۔

(2) میں ایک اچھی کک ہوں (یہ سب کزنز کی آنکھیں کیوں باہر نکل رہی ہیں؟ بھئی یہ میرا ذاتی خیال ہے' کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں) مگر امی جیسا لذیذ اور مزے دار کھانا کبھی نہیں بنا سکتی۔ پچھلے تین سال سے ہر عید پر میرا معمول ہے کہ صبح ہی صبح کچن کا رخ کرتی ہوں۔ سعدیہ بہت حیران ہوتی ہے بقول اس کے ہم عید کے دن کچن سے جان چھڑاتے ہیں اور تم سارے سال میں صرف عید پر اتنے ذوق و شوق سے کچن کو رونق بخشتی ہو' ایسا کیوں ہے مجھے خود بھی نہیں پتا مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں چکن بریانی ضرور بناتی ہوں ساتھ میں اچاری چکن یا چکن قورمہ (ہم بہن بھائی چکن خور ہیں) اور کوئی۔ یمی سا ڈیزرٹ۔ اس کے بعد تیار ہو کر مع بریانی کی پلیٹ اپنی بیسٹ فرینڈ سعدیہ کے پورشن میں اس سے عید ملنے جاتی ہوں۔

اب عید الاضحیٰ۔ پر قربانی کا گوشت نہ پکے' ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں بغیر پریشر کو کرکے ہلکی آنچ اور ہلکے نمک مرچ میں بھنا گوشت اور کلیجی بھی ضرور بنتی ہے جو اماں' بابا کو بہت پسند ہے مگر یہ دونوں ڈشز امی بناتی ہیں۔

جہاں تک ترکیب کی بات ہے' سچ تو یہ ہے کہ مجھے جب بھی اہتمام سے کھانا تیار کرنا ہو' پیکٹ مسالے زندہ باد

ایک بار پھر عید مبارک' خوش رہیے' مجھے اور میرے اہل خانہ کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

شیریں ملک

(1) آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہر تہوار کی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی خواتین کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا احساس مجھے اپنے ناتواں کندھوں پر تو کبھی محسوس نہیں ہوا۔ لیکن اپنی جان سے پیاری امی کو دیکھ کر ضرور ہوا ہے۔

عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے بعد گوشت صاف کرنا' تقسیم کرنا' سنبھالنا' یہ کام شروع سے امی ہی کرتی ہیں۔ یقیناً "انہیں ہماری صلاحیتوں پر بھروسا نہیں۔ لیکن عید کے حوالے سے پکوان تیار کرنے کا کام ہم بہنوں نے امی سے سیکھ کر بالآخر اپنے ذمے لے ہی لیا ہے۔ حالانکہ آپی کی شادی ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ ان کا گھر بالکل ہمارے پڑوس میں ہے تو ہم ان کو اور شہزادوں کی سی آن بان والے اپنے تین سالہ بھانجے حسن کو اور پریوں جیسی خوب صورت ایک سال کی بھانجی خوش بخت (خوشی) کو اکیلا ہرگز نہیں چھوڑتے اور عید کی صبح پہلا کام یہی کرتے ہیں کہ آپی کے گھر جاتے ہیں۔ حسن اور خوشی کو تیار کرتے ہیں اور آپی سمیت ان کو اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ جب بات بات پر مجھے "آنی شیریں" کہہ کر پکارتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ اس جیسا خوب صورت رشتہ شاید ہی کوئی ہو۔

لیکن پیاری بہنوں آپ ہرگز یہ نہ سمجھیے گا کہ میں بالکل ہی نکمی ہوں۔ بلکہ میں اپنے گھر میں نہایت ہی مستعد اور فعال رکن مانی جاتی ہوں۔ سمجھ دار اور سگھڑ لڑکیوں کی طرح عید کی آمد سے پہلے ہی کاموں میں جت جاتی ہوں۔ مثلاً" پورے گھر اور کچن وغیرہ کی مکمل صفائی کرتی ہوں۔ تمام ضروری اشیا کی خریداری کے لیے لسٹ بنا کر بھائیوں کے حوالے کرتی ہوں۔ عید کے دن استعمال ہونے والے برتن' دسترخوان اور خاص کر عید الاضحیٰ کے موقع پر ٹی وی پروگرامز اور پسندیدہ رسائل سے گوشت کی ڈشز کی تراکیب نوٹ کرتی ہوں تاکہ گھر والوں پر نت نئے تجربات آزمائے جائیں۔

(2) عید الاضحیٰ کے موقع پر ہم بہنیں مختلف قسم کے پکوان بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو کہ ہمارا دل رکھنے کے لیے ہی ٹیسٹ کیے جاتے ہیں۔ سوائے ابو کے جو ہم سے بہت پیار کرتے ہیں اور دل کھول کر ہمارے بنائے گئے کھانوں کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن گھر کے سب افراد کو روایتی کھانے ہی پسند ہیں۔ خاص کر قورمہ' اچار گوشت' کڑاہی گوشت' کباب اور خاص کر کے مٹن پلاؤ جسے ہمیشہ میری فیورٹ بریانی پر ترجیح دی جاتی ہے۔

لیکن عید کی شام کو ہر دفعہ میں جو ڈش خصوصی طور پر تیار کرتی ہوں وہ میرے بھائی علی کو بہت پسند ہے جسے

کم ہی کوئی چیز پسند آتی ہے۔ وہ ہے "تندوری ران" یہ میری تیار کردہ وہ واحد ڈش ہے۔ جس پہ مجھے گھر کے ہر فرد کی طرف سے تعریف وصول ہوتی ہے اور میں کھائے بغیر ہی سیر ہو جاتی ہوں۔

تندوری ران

اشیا :

بکرے کی ران	ایک عدد
لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
باربی کیو ساس	چار چائے کے چمچے
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
کوئلہ	ایک درمیانہ ٹکڑا

ترکیب :

ران کو اچھی طرح صاف کر کے گہرے کٹ لگا کر اس پر تمام مسالا جات یعنی نمک، لال مرچ، سرکہ، باربی کیو ساس، لہسن پیسٹ اور سیاہ مرچ پاؤڈر مکس کر کے ملیں اور دو گھنٹے تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک بڑے پتیلے میں تھوڑا سا تیل درمیانی آنچ پر گرم کریں اور میرینیٹ کی ہوئی ران اس میں ڈال کر بیس پچیس منٹ ہلکی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔ جب دونوں طرف سے ران گولڈن ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ کوئلہ دہکا کر دم لگا دیں۔ منفرد تندوری ران بالکل تیار ہے۔ گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔

سدرۃ المنتہیٰ

بقر عید کا تصور کچھ زیادہ ہی لطف دینے والا ہوتا ہے (کہ آپ اس میں پورے سال کا گوشت ایک ماہ میں کھا لیتے ہیں) عیدالاضحیٰ پر خواتین کی ذمہ داریاں ضرور بڑھ جاتی ہوں گی مگر ہماری ذمہ داریوں میں کچھ خاص فرق نہیں آتا (جیسے گوشت صاف کرنا کہ اس سے ہاتھ خراب ہوتے ہیں) سنبھالنا اور پکوان تیار کرنا ان سے ہٹ کر بھی ایک ذمہ داری ہوتی ہے جسے کھانا، کھانا اور کھانا کہتے ہیں۔

یہ ذمہ داری ہمیں سونپی نہیں جاتی مگر فرائض میں اپنا نام شمار کرنے کے شوق میں نبھائی جاتی ہے۔ یہ بھی تو ایک بڑا کام ہے کھانا اور پھر اسے ہضم بھی کرنا ہوتا ہے (میرے خیال سے ان دنوں میں ہاضمے کے سیرپ کارمینا کی گولیوں اور بدہضمی کے لیے اینو کی سب سے زیادہ بکری ہوتی ہوگی) رہی بات پکانے کی تو کھانے کے لیے یہ مصیبت زدہ کام بھی "مجبوراً" کرنا پڑ جاتا ہے مگر میرے جیسے کام چور اور بہانے بازوں کے لیے سب سے آسان ترکیب یہی ہے کہ ایک سیخ اپنے پاس ضرور رکھیں، انگیٹھی میں کوئلے اور کوئی ہی دہکا دے، آپ بڑے سائز کی بوٹیاں گھر میں کسی سے کٹوا کر صاف بھی کروالیں، ہو سکے تو مسالا بھی لگوالیں، روئی یا چمچ کی مدد سے آئل چھڑکیں اور انگیٹھی پر رکھ کر پکاتی جائیں۔ پکاتے ہوئے آدھا کھالیں۔ باقی پکانے کے بعد خود کھائیں۔ کسی کو نہ کھلائیں کہ اس وقت ہر کسی کے پاس گوشت ہوتا ہے۔ عید منائیں اور خوش رہیں۔

دیکھیں ایسی نایاب ترکیبیں کون بتاتا ہوگا بھلا۔ مدیرہ جی! میرا مقصد بچیوں کو خراب کرنا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف اپنے جیسوں کا درد سمجھتی ہوں اور ان ہی کے لیے ایک ترکیب میں نے بھی دے ڈالی۔ آج کے بعد کام چور لڑکیاں بھی بقر عید کے سروے پڑھا کریں گی۔ سب کو عید مبارک کہیے اور مسکرائیے اور ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے دوستو اور خوب کھائیے..... کیونکہ عید قربان سال میں ایک دفعہ ہی تو آتی ہے۔

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

خبریں وبریں

تبصیر نخاط

اپنی جگہ بھاری

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ مگر جناب! ہمارے فنکاروں کی جب شامت آتی ہے تو وہ بھارت کا رخ کرتے ہیں۔ اب عدنان سمیع ہی کو دیکھ لیجیے۔ عدنان سمیع جب بھارت گئے تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عدنان اپنے اس "سواگت" سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے وہیں مستقل پڑاؤ ڈال لیا۔ ایسا مستقل پڑاؤ کہ بعد میں وہ ہندو انتہاپسند تنظیموں کے "ممتاثرین" میں شامل ہو کر بھی بھارت سے نہ ٹلے۔ عدنان سمیع کی جانب سے خلوص کے اس مظاہرے پر بھارتی سرکار نے بھی عدنان کے ساتھ اپنائیت کی انتہا کردی اور ان کی تمام جائیداد شاید یہ سوچ کر ہی اپنے قبضے میں کرلی کہ اپنوں میں کیا تیرا میرا۔ عدنان بھی اس اپنائیت پر ریجھ گئے اور کہا کہ "چاہے جھونپڑی ہی میں کیوں نہ رہنا پڑے۔ رہوں گا بھارت میں ہی۔"

شاید عدنان سمجھے ہوں کہ یہ بیان دے کر وہ بھارتیوں کے دل میں جگہ بنالیں گے۔ مگر اس بیان نے عدنان کی عزت پاکستان میں تو کم ہی کی تھی۔ تاہم بھارت میں تو بالکل ہی گرادی۔ عدنان کو اب وہاں کوئی قابل ذکر کام نہیں ملتا۔۔۔ اور جب عدنان نے اپنی میوزک البم کے لیے ایک وڈیو بنانے کا ارادہ کیا اور اس میں کام کروانے کے لیے بالی ووڈ کی بالی حسیناؤں سے رابطے کیے تو سب ہی نے عدنان کو کورا جواب دے دیا۔ مجبوراً" عدنان کو اپنی وڈیو ایک بالکل غیر معروف سی بھارتی خاتون کامیڈین کے ساتھ تیار کرنا پڑی۔ ماضی میں عدنان سمیع اپنی وڈیوز معروف بھارتی فنکاروں کے ساتھ بناتے رہے ہیں۔ لہٰذا نئی وڈیو دیکھنے والوں کو عدنان صرف جسمانی وزن کے لحاظ سے ہی نہیں۔ بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی خاصے ہلکے دکھائی دیے ہیں۔

(عدنان جی! آپ نے تو بس اپنا جسمانی وزن کم کرنے ہی کی ٹھانی تھی۔ مگر یہ کیا۔۔۔ آپ تو اپنی عزت و اہمیت کا وزن بھی کم کر بیٹھے۔ آپ کو معلوم نہیں تھا کیا کہ پتھر ہمیشہ اپنی جگہ پر ہی بھاری ہوتا ہے۔۔۔ اور ہمارے خیال میں فنکار اپنے ملک میں۔)

ملاقات برائے فروخت

"ملاقات" کا لفظ اپنے اندر اس وقت بے پناہ کشش رکھتا ہے' جب یہ ملاقات کسی من پسند شخصیت سے ہورہی ہو اور مردوں کے لیے تو کسی نازک اندام حسینہ سے ملاقات کا تصور اتنا خوش کن ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ ماضی میں کسی سے ملنا شاید بے حد دشوار ہوتا ہوگا' جب ہی تو لوگ باگ کسی خاص سے ملنے کے لیے خاصے جتن کیا کرتے تھے اور تقریب بہ سر ملاقات ڈھونڈا کرتے تھے۔ مگر جناب! یہ سب ماضی کی فکریں تھیں۔ آج کا دور تو ایسا ہے کہ اب تو سب کچھ بکتا ہے۔ یہاں تک کہ ملاقات بھی۔

عام زندگی میں لوگوں کا لہو چوسنے اور پینے والے معاشرے میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر پردۂ اسکرین پر انسانی لہو پینے والے لوگوں کی کہانیاں اس قدر پسند کی جاتی ہیں کہ ان فلموں میں کام کرنے والے لوگ مقبولیت کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ "ٹوائی لائٹ" سیریز میں کام کرنے والی نازک اندام حسینہ کرسٹین اسٹیوارٹ لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہیں۔ مگر کرسٹین ایک عرب شہزادے کو تو اس قدر بھائیں کہ انہوں نے کرسٹین سے ملاقات کی خواہش دل میں پال لی۔۔۔ اور چونکہ وہ شہزادے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے کرسٹین سے ملاقات "خریدلی" کرسٹین آئیں۔ ان سے ملیں اور پندرہ منٹ بعد چلی گئیں کہ عرب شہزادے نے ان کی زندگی کے محض پندرہ منٹ ہی خریدے تھے۔ وہ عرب شہزادے کرسٹین کے جانے کے بعد آہیں بھر بھر گاتے رہے ہوں گے کہ۔

نہ کچھ دیر ٹھہرے' نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

مگر کرسٹین پر شہزادے کی آہوں کا بھلا کیا اثر ہوتا تھا کہ انہوں نے شہزادے سے ملنے کا فیصلہ کون سا شہزادے کی بے پناہ خواہش سے متاثر ہو کر کیا تھا۔ کرسٹین نے اس مختصر سی ملاقات کے پانچ لاکھ ڈالرز وصول کیے تھے۔ کرسٹین نے یہ رقم امریکا میں آنے والے سمندری طوفان "سینڈی" سے متاثر ہونے والے لوگوں کی امداد کے طور پر طلب کی تھی۔

(شاباش ہے ان عرب شہزادے پر کہ ان کی انکھیاں ٹھہریں بھی تو ایک مغربی حسینہ پر۔ شہزادے! حسن تو فانی چیز ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ذہین اور قابل قدر لوگوں کی کمی نہیں۔ ایسے بھی کہ جن سے مل کر زندگی سے پیار ہوجائے۔ ہاں! شاید ان میں حسن اور وہ ادائیں نہ ہوں۔ ہمارے ہاں بھی حالیہ زلزلے کے بعد بلوچستان میں خاصے تباہ حال افراد امداد کے منتظر ہیں۔ آپ نے بالواسطہ طور پر ہی سہی' اپنا پیسہ غیر مسلموں کی فلاح و بہبود کے لیے دے دیا تو پھر یہ تو آپ کے مسلمان بھائی بھی ہیں نا۔)

پھٹی ہوئی جینز

موسیقی کی بنیاد سات سُروں پر عبارت ہے۔

ساتوں سُروں کی ترتیب میں ردّوبدل کرنے سے لے اور دھنیں تخلیق پاتی ہیں۔ دنیائے موسیقی میں ہمیشہ سے نت نئے تجربات کیے جاتے رہے ہیں۔ یوں موسیقی کا خاندان بڑھا اور کلاسیکی و نیم کلاسیکی موسیقی کے بعد پاپ موسیقی نے جنم لیا۔ مگر چونکہ یہ جنم مغرب میں ہوا تھا۔ لہٰذا اہل مشرق اسے پاپ (گناہ) ہی سمجھتے رہے۔ لیکن کافی آگے جا کر مشرق نے بھی اسے قبول کر ہی لیا۔ مغرب کی فطرت میں جولانی بہت ہے۔ چنانچہ ان کے "پاپ" کو اہل مشرق کے قبول کرتے ہی انہوں نے جھٹ ایک نئی موسیقی متعارف کروائی اور اسے ریپ کا نام دے دیا۔

یہ موسیقی کیا تھی۔ بس اسے چند لائنیں جلدی جلدی بولنا ہی سمجھیے۔ نوے کی دہائی میں ہمارے ملک میں ٹی وی پر نوجوانوں کے لیے جدید موسیقی کا ایک پروگرام شروع ہوا۔ اس پروگرام میں ایک نوجوان گلوکار نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچی، جو گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی جینز پہنے، آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے شاعری نما چند لائنیں میوزک کے ساتھ بول رہا تھا۔

وہ گلوکار فخر عالم تھے۔ جنہوں نے اس پروگرام کے ذریعے پاکستان میں ریپ موسیقی متعارف کروائی۔ فخر عالم پروگرام کی کمپیئرنگ بھی کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے ان کی گلوکاری کو تو زیادہ قبول نہیں کیا۔ مگر ان کی کمپیئرنگ مقبول ہو گئی۔ چنانچہ فخر عالم کمپیئرنگ کرنے لگے۔ کمپیئرنگ سے تھوڑا اکتائے تو اداکاری کی طرف چلے گئے۔ وہاں بھی مقبولیت کی سند مل گئی۔ جلد ہی فلم والوں نے اچک لیا۔ فخر عالم کی طبیعت میں بھی نت نئے تجربات کرنے کا شوق تھا۔ لہٰذا فلم بھی کر ڈالی۔ "ویری گڈ دنیا، ویری بیڈ لوگ"

فخر عالم کو فلمی دنیا تو "ویری گڈ" ہی لگی۔ مگر لوگ شاید "ویری بیڈ" لگے۔ لہٰذا انہوں نے صرف ایک ہی فلم کر کے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ تاہم ٹی وی پر کمپیئرنگ کرتے رہے۔ کچھ عرصے سے فخر عالم تقریباً" گوشۂ گمنامی ہی میں تھے کہ اچانک خبر آئی کہ انہیں فلم سنسر بورڈ، سندھ کا چیئرپرسن بنا دیا گیا۔ (ظاہر ہے انہیں فلموں کا تجربہ بھی تو اتنا ہے۔ "پوری ایک فلم" کی ہوئی ہے انہوں نے۔ فخر عالم کو نت نئے تجربات کرنے کا خاصا شوق ہے۔ چلیں دیکھتے ہیں، موسیقی میں پہلے پہل ریپ کرنے اور پھٹی ہوئی جینز پہننے والے فخر عالم اب سنسر شپ میں پھٹی ہوئی جینز سیتے ہیں یا... سمجھ تو گئے ہوں گے نا آپ۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ عوام الناس کا سنجیدہ طبقہ ٹاک شوز سے بھی بے زار ہو رہا ہے۔ خبریں ایسے گھناؤنے جرائم کی تشہیر تک محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ جن سے معاشرے کو گھن آتی ہے۔ بریکنگ نیوز کلچر کا ڈھکنا چوری ہونے کی سطح تک آ گئی ہے۔ شاید اس دھما چوکڑی میں الیکٹرونک میڈیا کو اندازہ نہ ہو کہ وہ بے اعتبار ہوتا جا رہا ہے۔ بے اعتباری اور بے وقاری میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔

(عرفان صدیقی... نقش خیال)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مٹھیا کباب

اجزا :

قیمہ	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ہری مرچ	پانچ عدد
انار دانہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت سرخ مرچ	آٹھ عدد
بیسن	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

قیمے کو اچھی طرح دھو کر اس کا پانی خشک کر لیں۔ انار دانہ، دھنیا، زیرہ، ثابت سرخ مرچ اور بیسن کو توے پر ہلکا سا بھون کر موٹا موٹا کوٹ لیں۔ ایک چائے کے چمچے تیل میں چوپ کی ہوئی پیاز، ہری مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ دونوں آمیزے نمک اور گرم مسالے کے ساتھ قیمے میں اچھی طرح ملا کر رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد تھوڑا سا آمیزہ ہاتھ میں لے کر مٹھی کی شکل میں کباب بنائیں اور گہرے تیل میں تل لیں۔

مٹن زعفرانی پلاؤ

اجزا :

گوشت	ایک کلو

چاول	ایک کلو
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
لہسن	پانچ جوے
چھوٹی، بڑی الائچی	چار، چار عدد
ثابت گرم مسالا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
جائفل جاوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
زعفران	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت میں بڑی الائچی کے ساتھ سارا ثابت گرم مسالا، لہسن ادرک، نمک اور پانی ڈال کر چڑھا دیں۔ گوشت گل جائے تو یخنی الگ کرلیں۔ ایک کپ نکال کر باقی یخنی میں تھوڑا سا نمک ملا کر ایک کنی چاول ابال لیں۔ اس طرح کہ چاول یخنی میں گل کر خشک ہو جائیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کرکے چھوٹی الائچی کڑکڑائیں اور گوشت ڈال کر فرائی کریں۔ بچی ہوئی یخنی ڈال کر بھونتے ہوئے تھوڑا سا خشک کرلیں۔ چاول ڈال دیں۔ چاول کے اوپر ایک کھانے کے چمچے دودھ میں زعفران گھول کر ڈال دیں۔ جائفل جاوتری چھڑک دیں اور دم پر لگا دیں۔

باربی کیو بوٹی

اجزا :

گوشت	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
کچری پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
کباب چینی	آٹھ دانے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

اندر کٹ بیف کی تقریباً" دو انچ کی بوٹیاں بنوالیں۔ دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں۔ دہی میں کچری پاؤڈر یا کچا پپیتا پیس کر ملا دیں۔ ساتھ ہی سرخ مرچ کباب چینی (پیس کر) لہسن ادرک پیسٹ نمک اور دو کھانے کے چمچے تیل ملا کر رکھ دیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد کوئلوں پر سینک لیں۔ سینکتے ہوئے برش یا کپڑے کی مدد سے بوٹی کے اوپر تھوڑا تھوڑا تیل لگاتی جائیں۔ ایک بڑے برتن میں ڈھک کر کوئلے کا دم دیں۔ چھلے دار پیاز اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

مسالے دار اسٹیم گوشت

اجزا :

گوشت	ایک کلو
کچری پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	دو چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	تین کھانے کے چمچے
سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
براؤن پیاز	پانچ کھانے کے چمچے
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	پانچ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

گوشت میں تمام مسالے پیس کر مکس کریں اور رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد ایک مٹی کی ہانڈی میں یہ آمیزہ اور تیل ڈال دیں۔ ڈھکن ڈھک کر کناروں کو گوندھے ہوئے آٹے سے بند کردیں۔ توا گرم کرکے ہانڈی رکھ دیں۔ ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ بیس سے پچیس منٹ بعد کھول کر دیکھیں۔ پانی خشک ہو جائے تو توا ہٹا دیں اور ہانڈی چولہے پر رکھ کر بھونیں۔ گوشت روغن چھوڑنے لگے تو اتار لیں۔ ہری مرچ اور ہرے دھنیے سے سجاوٹ کریں اور چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

کیا آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں؟
سوال یہ ہے کہ آپ کیوں فکر مند رہتے ہیں؟
شاید آپ کا جواب ہو کہ آپ کی پریشانیاں اور ذاتی مسائل کچھ ایسے ہیں جن کی وجہ سے آپ کبھی ان فکروں سے گلو خلاصی ہی نہیں پاسکتے۔
آپ کا یہ جواب نفسیاتی نقطہ نظر سے غلط ہے۔ آپ کی پریشانیوں اور ذاتی مسائل سے دراصل آپ کی فکروں کا بہت کم تعلق ہے۔ درحقیقت اس کا تعلق آپ کے مسائل اور پریشانیوں سے نہیں بلکہ آپ کی عادت سے ہے اگر آپ کے تمام مسائل حل ہو جائیں تو آپ اپنی فکروں کے لیے کوئی اور جواز تلاش کرلیں گے۔
پریشانیوں اور مسائل کی فہرست کبھی ختم نہیں ہو سکتی جو شخص فکر و تشویش کو اپنی عادت بنا لیتا ہے' وہ ہمیشہ فکر مند رہا کرتا ہے۔ اسے عموماً" اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کے لاشعور میں کوئی ایسا خوف اور اندیشہ چھپا رہتا ہے جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔

فکر و تشویش کی بنا پر ہمارے اندر جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں' اس سے ہمارا دماغ اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری بہت سی جسمانی بیماریوں مثلاً" دمہ' بلڈ پریشر' قلبی امراض' اگزیما اور ذیابیطس کا اصل سبب یہی فکر و تشویش ہے۔
اگر آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی فکر و تشویش میں مبتلا رہتے ہیں تو آپ اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے اپنے مسائل اور پریشانیوں کا تجزیہ کریں پھر اپنے اندر یہ اعتماد اور یقین بیدار کریں کہ آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ آپ ان پر قابو پاسکتے ہیں' بے کار باتیں سوچنا چھوڑ دیں اور ان سوچوں سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھیں اور بطور مشغلہ کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔
ایک پنج وقتہ نمازی ان بے کار سوچوں میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ روزانہ صبح بیدار ہوتے ہی بستر چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اپنی تمام پریشانیاں اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جائیں۔

د۔ ف۔ لاہور

س : میری دوست کو اپنے گھر میں بے جا پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ والدین حیات نہیں اور سب بہن بھائی شادی شدہ ہیں۔ وہ بھی اپنے شادی شدہ بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کو فون' انٹرنیٹ وغیرہ کی پابندی ہے۔ دوستوں کے گھر جانے پر پابندی ہے حتیٰ کہ اپنی سگی بہنوں کے گھر بھی اکیلے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ گھر گھر اور گھر کے کام بس اس کی ذمہ داری ہے۔ گھر میں رہ رہ کر اس کی شخصیت بدلتی جا رہی ہے۔ انٹر کیا ہوا ہے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔
سارا دن کام کاج سے فراغت کے بعد وہ چھپتے چھپاتے بھائی کے لیپ ٹاپ پہ سعودیہ میں مقیم اپنے دوست سے بات کرتی ہے' وہ اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ بھی اس کو پسند کرتی ہے۔ وہ تنہائی سے بچنے کو ایسا کرتی ہے ویسے کوئی محبت نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب انسان کو بے جا پابندیوں کا سامنا ہو' اس کے بہترین کردار کے باوجود اس پر اعتبار نہ کیا جاتا ہو اور اس کی تنہائی کا بھی کوئی حل نہ ہو تو' ایسے میں ایک شوخ طبیعت بندی کو کیا کرنا چاہیے۔

اچھی بہن! آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ آپ کی دوست پر اعتبار نہیں کیا جاتا ہو سکتا ہے کہ موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے آپ کی دوست پر اس کے بھائیوں نے پابندیاں لگائی ہوں۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے' آپ کی دوست تنہائی کا شکار ہے' اس لیے اس نے یہ حل نکالا کہ نیٹ پر ایک لڑکے سے دوستی کرلی۔ تصور کریں کہ یہ بات اس کے بھائیوں کو پتا چلی تو نتائج کیا نکلیں گے؟ کیا وہ اس پر مزید پابندیاں نہیں لگائیں گے؟ گھر بیٹھنے والی شوخ طبیعت لڑکی کے لیے صرف ایک ہی مشغلہ نہیں ہے کہ وہ لڑکوں سے دوستی کرے اور بھی بہت سے مشغلے اختیار کیے جاسکتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی بہنوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جاسکتا ہے۔ کتابوں میں دل لگایا جاسکتا ہے۔ پاس پڑوس کے بچوں کو ٹیوشن دی جاسکتی ہے۔
بے شمار لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں' کیا وہ سب لڑکوں سے دوستی کر کے وقت گزار رہی ہیں؟ اپنی دوست کو سمجھائیں۔ کہ وہ ان چکروں میں پڑ کر اپنا وقت برباد نہ کرے۔
آپ کی دوست کی عمر صرف بیس سال ہے۔ ایک آدھ سال میں اس کی شادی ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے' اپنی اور ان کی عزت کا خیال رکھے۔

ر۔ کراچی

س : میرا ذہن کہیں فوکس نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ کوئی ٹینشن کچھ نہیں ہے مصروف بھی رہتی ہوں' اچھی کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ قوت ارادی بھی بہت کمزور ہے۔ کچھ بتائیں کیا کروں؟
مجھے مطالعے کا بہت شوق ہے۔ اتنی اچھی اچھی کتابیں پڑھی ہیں میں نے مگر افسوس ان میں سے، بہت ہی کم باتیں یاد ہیں شاید۔ کسی سے اگر گفتگو یا بحث ہو رہی ہو تو اکثر جملے' الفاظ اس کے بھی اور اپنے بھی بھول جاتی ہوں میرے الفاظ بھی صحیح ادا نہیں ہو پاتے مثلاً" جملے بولتے بولتے آخر میں الفاظ گڈمڈ ہو جاتے ہیں

اچھی بہن! توجہ مرکوز نہ ہونے کا سبب یہ ہے۔ بیک وقت آپ کے ذہن میں بہت سے خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی بات یا جملہ ذہن میں اپنی جگہ بنا نہیں پاتا۔ مطالعہ کرنے کا شوق ہے۔ بہت اچھی بات ہے لیکن جب مطالعہ کریں تو یہ سوچ کر نہ کریں کہ آپ کو اسے یاد رکھنا ہے بلکہ خوش گوار تاثر کے ساتھ مطالعہ کریں جو کچھ پڑھیں اس کے جملے یاد رکھنے کے بجائے اس کے مفہوم کو سمجھیں جب آپ کو مفہوم یاد ہو گا تو اسے اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گی۔
گفتگو یا بحث ہو رہی ہو تو اس میں حصہ لینے کی شعوری کوشش نہ کریں۔ اس سے آپ کے ذہن پر دباؤ پڑتا ہے اور الفاظ صحیح طرح ادا نہیں ہو پاتے۔ بہتر یہ ہے کہ خاموشی سے سنیں پھر مختصر الفاظ پر مبنی جملے بولیں جو صحیح طرح ادا ہو سکیں۔ ذہانت علیحدہ چیز ہے اور حافظہ مختلف چیز ہے اگر آپ کو دوسروں کی لکھی باتیں یاد نہیں رہتیں تو اپنے طور پر اپنے ذہن کے مطابق بات کریں۔ آپ کی تحریر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اچھی خاصی ذہین لڑکی ہیں۔

امتہ الصبور

ارم احمد..... لاوہ

س۔ میرے بال شروع سے ہی لمبے، گھنے اور نرم و ملائم تھے۔ جھڑتے بھی نہیں تھے۔ میری والدہ شروع سے ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ تارا میرا کا تیل، ناریل کا تیل اور بادام کا تیل ہمیشہ سے بدل بدل کر یا مکس کر کے میرے بالوں میں لگاتی آئی ہیں۔ ابھی بھی بال اسی طرح لمبے ہیں اور چمکدار بھی مگر اب بال گرنا شروع ہوئے تو رکنے کا نام نہیں لے رہے۔ اس قدر گر گئے کہ سر نظر آنے لگ گیا ہے۔ جس پارلر سے میں بال کٹواتی ہوں انہوں نے مجھے بے بی شیمپو اور زیتون کے تیل کا مشورہ دیا۔ وہ بھی مسلسل کر کے دیکھ لیا ہے، مگر کچھ فرق نہ پڑا۔

ج۔ ارم! آپ کا مسئلہ بیرونی نہیں، اندرونی ہے۔ آپ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ آج کل سیب کا موسم ہے۔ روزانہ ایک سیب ضرور کھائیں۔ سیب چھیل کر نہیں چھلکوں سمیت کھائیں۔ گاجر جلد، بالوں اور نظر کے لیے انتہائی مفید ہے۔ کچی گاجر کھائیں۔ آئرن کی کمی کی وجہ سے بھی بال جھڑنے لگتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کے مشورے سے آئرن ٹیبلٹ استعمال کریں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بالوں کے گرنے کی اہم وجہ خشکی بھی ہے۔ اگر آپ کے سر میں خشکی ہے تو اس کے لیے ایک بہت آسان سا نسخہ ہے۔ سر پر ایلوویرا کا گودا لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد سر دھو لیں خشکی ختم ہو جائے گی۔

سر پر تیل اس طرح لگائیں کہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے۔ پہلے سر پر تیل کا مساج کریں پھر تیز گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑیں اور اسے اچھی طرح سر پر لپیٹ لیں۔ جب تولیہ ٹھنڈا ہو جائے تو اتار لیں۔ اس کے بعد نیم گرم پانی سے سر دھو لیں۔

بادام کا، ناریل کا یا زیتون کا جو بھی آپ کے بالوں کو موافق ہو، وہ تیل استعمال کریں۔

روزانہ شیمپو نہ کریں۔ ہفتہ میں ایک یا دو بار شیمپو کریں۔ شیمپو کا زیادہ استعمال بھی بالوں میں موجود قدرتی تیل اور نمی کو ختم کر دیتا ہے، جس سے بال روکھے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

بال شیمپو کرنے سے پہلے دو چمچے دہی میں ایک چمچہ سرسوں کا تیل ملا لیں۔ اسے بالوں میں لگائیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر بال شیمپو کر لیں۔

عائشہ ثناء..... چکوال

س۔ میری عمر چوبیس سال ہے، میرا مسئلہ یہ ہے کہ نسوانی حسن کی کمی ہے اس کے ساتھ بریسٹ سائز میں بھی فرق ہے۔ جو سخت شرمندگی کا باعث بنتی ہے۔ میری شادی ہونے والی ہے برائے مہربانی میری مدد فرمائیں۔

ج۔ عائشہ! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ شادی کے بعد آپ کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔